سنگِ ملامت

خلش ہمدانی

("بات چھپائے گوری" کا دوسرا حصہ)

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

خلش ہمدانی

سنگِ ملامت

(بات چھپائے گوری کا دوسرا حصہ)

کلاسیک لاہور

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

ناشر:

آغا امیر حسین

کلاسیک (ریگل چوک) دی مال۔ لاہور

فون: ۷۳۱۲۹۷۷-۷۳۲۳۹۶۳

طابع: عاشق پرنٹرز لاہور

بارِ اوّل: جون ۱۹۹۶ء

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

ان دوستوں کے نام
(خلوص اور محبت کے ساتھ)

اراکین بار تلہ گنگ ' ملک محمد امیر خان ایڈووکیٹ '
سید فارغ بخاری ' پروفیسر شفیع ضامن ' ڈاکٹر آفتاب احمد خان '
محسن عباس ' اللہ یار خان ' سید منظور حیدر ' صداقت شفیق '
اکرم ضیاء ' مختار منظر ' شاکر القادری

تعارف

نام:- احمد الطاف
قلمی نام:- خلش ہمدانی

دندہ شاہ بلاول (چکوال) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دندہ شاہ بلاول' لاوہ اور میانوالی میں حاصل کی۔
تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ء میں پاکستان آرمی میں کمیشن لیا اور ۱۹۶۷ء تک فوج سے منسلک رہے۔
خلش ہمدانی نے ۱۹۴۸ء میں اپنے احباب کے ساتھ مل کر پشاور میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک حلقہ کے سیکرٹری اور مجلس عاملہ کے رکن رہے۔
۱۹۶۴ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) ۱۹۶۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن اور ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ آج کل ڈسٹرکٹ کورٹس اٹک میں پریکٹس کرتے ہیں۔

تصانیف:-

روئے دکھ کا ساگر	ناول
خون میں ڈوبے تو سحر دیکھی	ناول
تنویر لہو کی	ناول
آگ اور خون کا دریا	رپوتاژ
بات چھپائے گوری	ناول
اک آبلہ پا تنہا	سوانح حیات
لمحوں کی آگ	ناول
پیاس کا صحرا	ناول
سنگ ملامت	ناول
رسوائیاں کیا کیا	ناول

خلش ہمدانی اپنی کتابوں میں گردوپیش کی واقعاتی زندگی کو یوں پیش کرتے ہیں کہ فن اور زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ان کے یہاں مشاہدے کی سچائی اور زندگی کو پیش کرنے کا پرخلوص جذبہ انتہائی شدید ہے۔ کہ وہ خود فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی تحریریں حقیقت پسندانہ اسلوب کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ روایت انہیں ترقی پسند تحریک سے ورثہ میں ملی ہے۔ تاہم ان کے یہاں ایک چیز ایسی ہے۔ جو انہیں پرانے حقیقت پسندوں سے علیحدہ کرتی ہے۔ اور وہ ہے ان کا مذہبی رویہ ' اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلش ہمدانی پاکستانی طرز احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی حقیقت پسندی میں لادینی رویوں کی بجائے دینی رویئے شامل ہیں۔ اور پاکستان کے حوالے سے اصل حقیقت پسندی یہی ہے۔

(پروفیسر سجاد باقر رضوی)

خلش ہمدانی نے اپنی بیشتر تحریروں میں معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے غم و الم میں ڈوب کر بہت ہی ظالمانہ اور قابل نفرت چیزوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اور پھر انہی تجربات اور مشاہدات کو انہوں نے نہایت ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی یہ کوشش معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرنے میں ایک گہرے فنی شعور کی حامل ہے۔
زیر نظر کتاب میں انہوں نے چند بھیانک سماجی مسائل کی طرف معاشرے کی توجہ مبذول کرائی ہے۔
جو ہم سب کو دعوت فکر دیتی ہے۔

(افتخار یوسف زئی)

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

حنا صبح کی ایک سحر طراز کرن میری زندگی کی سب خوشیوں اور روشنیوں کو لے کر ایک انجانی منزل کی طرف چلی گئی اور اپنے پیچھے تاریکیوں اور اداسیوں کو چھوڑ گئی۔ میں اداس لمحوں میں ابھی تک اکیلا اسی کمرے میں مقیم تھا۔ میں سوچنے لگا یہ وہی کمرہ ہے جو آج صبح تک رنگ و نور اور خوشبوؤں کا مسکن تھا جو حنا کے چلے جانے کے بعد اب بالکل ویران اور سنسان پڑا ہوا ہے۔ جو میری کسمپرسی اور بے بسی کا نوحہ بیان کر رہا ہے۔

ساری رونقیں اور خوشیاں حنا کے دم قدم سے تھیں۔ وہ چلی گئی تو ساری خوشیاں اور رنگینیاں بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس مہ جبیں کے چلے جانے کے بعد اس کمرے میں اب اداسی اور بے بسی کے سوا پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ اسے یہاں سے گئے ہوئے نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ اور میں خلا کی وسعتوں میں اسے پا لینے کی

جدوجہد میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ آخر کار ایک دن تھک ہار کر ناامیدی کے عالم میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ اور وہ دن اس غموں کی ماری ہوئی دنیا کا بھی آخری دن ہو گا۔ اور پھر آن واحد میں اس کائنات کا شیرازہ بکھر جائے گا اور ہر سو گھور اندھیرا چھا جائے گا۔

حنا اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ سکون کی تلاش میں مجھ سے بچھڑ کر بادل ناخواستہ پنڈی چلی گئی تھی۔ اور میں اپنی زندگی کی محرومیوں کو گلے لگائے ایسی راہوں پر نکل کھڑا ہوا تھا جو تباہی اور بربادی کی طرف جاتی تھیں۔ دیکھنے کو تو یہ محبت بھری راہیں تھیں لیکن جاتی تھیں ایک نہایت ہی اندوہناک انجام کی طرف۔

میں یونٹ میں واپس آگیا تاکہ ان چند ٹکوں کے حصول کا تسلسل نہ منقطع ہو جو مجھے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ملتے تھے اور جنہیں میں اپنے بیوی بچوں کی گزر اوقات کے لئے فوراً منی آرڈر کر دیتا تھا۔ اور پھر اگلے انتیس دن امید و بیم کے عالم میں گزار دیتا۔ شکر ہے کہ میری دال روٹی فوج والوں کے ذمہ تھی ورنہ میں دوسرے دن سے ہی فاقوں کا شکار ہونا شروع ہو جاتا۔

اب جب فوج کو خیر باد کہے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے تو میں سوچتا ہوں، میں نے کتنی مصنوعی اور دکھ بھری زندگی اس اذیت ناک ماحول میں گزاری ہے۔ اجلے کپڑے پہنے ہوئے جدھر جاتا بے چارے مجبور فوجی قدم قدم پر سلامیاں دیتے لیکن میری جیب ہمیشہ خالی ہی ہوتی۔ بیوی بچے شکل دیکھنے کو ترس جاتے تھے۔ جو چند ٹکے میں ان کو بھیجتا تھا اس سے وہ کوئی ڈھنگ کا کپڑا نہ خرید سکتے تھے۔ بلکہ مشکل سے سانس کا تسلسل قائم رکھ سکتے تھے۔

کیا میں اس ماحول کا پلا بڑھا محلوں میں رہنے والی مہ وشوں سے محبت کرنے کے لائق تھا......؟ ہر گز نہیں۔ مجھے اس کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے تھا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ حالات و واقعات ایسی ان دیکھی اور پر خطر راہوں پر لاتے رہے کہ مجھے ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی۔ اور میں اسی ان دیکھی ڈگر پر چلتا رہا۔

میں باوجود اپنی کم مائیگی کے بھی حنا کو دل و جان سے چاہتا تھا لیکن اپنی

مجبوریوں کی وجہ سے میں اسے اپنا نہ سکا اور اس خیال سے کہ یہ وفا شعار لڑکی عمر بھر کے لئے تباہ نہ ہو جائے۔ میں نے جدائی کے زہر کا گھونٹ اپنے ہاتھوں پی لیا اور اسے اپنے سے ایک بہتر آدمی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قانونی اور شرعی طور پر منسلک کر دیا۔ اور خود دل پر جدائی کے یہ گھاؤ سہ سہ کر بھی دنیا والوں کے سامنے ہنستا ہی رہا۔ لیکن حنا میری نسبت زیادہ زیرک اور معاملہ فہم تھی۔ وہ آخری وقت تک سعید کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ لیکن میرے کہنے پر اس نے بھی مجبوریوں کا یہ زہر پی لیا۔

سعید ایک بڑا افسر تھا۔ سوسائٹی میں بھی اس کا اونچا مقام تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ دل کا بڑا گھٹیا اور کمینہ نکلا۔ ان کی شادی کو ابھی بمشکل پانچ چھ ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اس نے حنا سے تقاضا شروع کر دیا۔ کہ بنکوں کے سب اکاؤنٹ جائنٹ رکھیں۔ حنا اس پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ حنا کے اس مسلسل انکار پر وہ کمینہ آدمی جور و جبر پر اتر آیا۔ اور اب نوبت گالی گلوچ اور مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ وہ اکثر حنا کو ذرا ذرا سی بات پر بیدوں سے مارا کرتا۔ وہ وفا شعار بیوی یہ مظالم برداشت کرتی رہی۔

اب حنا نے اپنے دل میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر میں اس کو ہڈی ڈال بھی دوں تو یہ اس پر بھی اکتفا نہیں کرے گا بلکہ ہر آئے دن اس کے مطالبات بڑھتے ہی جائیں گے اور آخر کار یہ میری لاش کو بھی چھوڑ کر پرے پھینک دے گا۔ اس نے سعید کے ہر ظلم و جبر کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اب وہ اس قدر آزاد نہ تھی جتنی کہ وہ شادی سے پہلے تھی۔ شادی سے پہلے تو وہ جہاں بھی جانا چاہتی بلا روک ٹوک جا سکتی تھی۔ لیکن اب وہ ایک آدمی کی منکوحہ بیوی تھی۔ اس کے پاؤں میں رسم و رواج کے اٹوٹ بندھن پڑے ہوئے تھے۔

مجھے حنا کا ایک بڑا ہی درد بھرا خط ملا۔ اس نے مجھے فوراً آنے کے لئے کہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے گھر کا مکمل پتہ بھی لکھ بھیجا۔ ان کی شادی کے بعد نہ تو میں کبھی حنا سے ملنے گیا اور نہ ہی اسے کبھی خط ہی لکھا۔ پنڈی چلے جانے کے کچھ دن بعد تک وہ باقاعدگی سے رات کو نو بجے میرے دفتر میں ٹیلی فون کرتی رہی' لیکن میں نے رات کو ڈیوٹی پر آنے والے کلرکوں کو کہہ رکھا تھا کہ اگر کسی خاتون کا ٹیلی فون میرے لئے آئے تو بتا دیا

کریں۔ "وہ چھٹی گئے ہوئے ہیں۔" "یونٹ کے ساتھ باہر مشقوں پر گئے ہوئے ہیں۔" "یا بیمار ہیں۔" غرضیکہ میں ان پچھلے چھ ماہ میں ایک دفعہ بھی حنا کے ہاتھ نہ لگا۔ شاید اس پر بھی کوئی پابندیاں عائد تھیں۔ چونکہ وہ میری خود ساختہ بیماری کا بھی سن کر مجھ تک نہ آ سکی۔

میں سوچتا۔ وہ حنا جو میری بیماری کا سن کر بمبئی (بھارت) سے ایک ہی دن میں میری عیادت کے لئے پشاور پہنچ گئی تھی۔ یقیناً کسی پریشانی میں گرفتار ہے۔ سوچا فون کر کے اس کی خیریت معلوم کر لوں۔ ٹیلی فون کیا تو ان کے گھر سے کوئی جواب ہی نہ آ رہا تھا۔ مسلسل رنگ کرتا رہا لیکن ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن کوئی اٹینڈ ہی نہ کرتا تھا۔ میں نے آخر کار دو دن کی چھٹی لی اور پنڈی کی راہ لی۔ میں نے ایسا پروگرام بنایا کہ حنا کے پاس اس وقت پہنچوں جب سعید اپنی ڈیوٹی پر جا چکا ہو۔ تاکہ میں اس کی عدم موجودگی میں حنا سے سب صورت حال ٹھیک ٹھیک معلوم کر سکوں۔

مجھے ان کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں نے تانگہ کرنل سعید کی کوٹھی کے سامنے کھڑا کیا۔ خود اتر کر گیٹ پر جا کر گھنٹی بجائی۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ گیٹ خاصا اونچا تھا۔ کوٹھی کے مکین باہر والے آدمیوں کو نہ دیکھ سکتے تھے اسی طرح باہر والے اندر والوں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اندر سے کسی نے گیٹ کا بولٹ کھولا میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک جوان سے آدمی نے گیٹ کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر اپنا آدھا دھڑ باہر نکالا۔

"کیوں گرائیں کیا کام ہے......؟" اس نے خالص فوجی لب و لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"میں لاہور سے آیا ہوں۔ میں نے کرنل سعید صاحب سے اور ان کی بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔"

"آپ کا نام کیا ہے......؟"

"میرا نام احمد ہے۔"

"کرنل صاحب آپکے کچھ لگتے ہیں...؟"

"بھئی تعلق کے بغیر کون آتا ہے......؟"

"اچھا آپ انتظار کریں۔" یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے پھر گیٹ کو اندر سے بولٹ کر دیا۔

تانگہ والا ابھی تک میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ اور اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھا کر حسن کے آستانے پر جبہ سائی کے لئے لوٹ آیا۔ کافی دیر ہو گئی وہ نوجوان لوٹ کر نہ آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں سوچنے لگا ظاہر ہے سعید تو اس وقت اپنی ڈیوٹی پر گیا ہو گا۔ حنا کو تو بھاگم بھاگ آنا چاہئے تھا۔ وہ بھی نہیں آئی۔ شاید گھر پر ہی نہ ہو۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے خود ہی جواز پیدا کر لیا۔ مکان کے اندر زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ چاروں طرف ایک مسلسل خاموشی تھی۔ میں نے اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے پھر آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ وہی آدمی تھوڑی دیر کے بعد آیا اور مجھ سے غضبناک لہجے میں کہنے لگا۔

"میاں آرام سے کھڑے نہیں ہو سکتے.....؟"

"جناب میں اس وقت سے ایک کرب مسلسل کی صلیب پر لٹک رہا ہوں۔ آخر گھر والوں کو اطلاع کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے....؟"

"اس وقت سے تمہارے ہی کام میں لگا ہوا ہوں۔ کوئی سویا ہوا تو نہیں؟"

"کیوں کوئی پرابلم ہے....؟"

"جناب پرابلم یہ ہے کہ کرنل صاحب تو اپنی ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی کہیں گئی ہوئی ہیں۔"

"تو دروازہ کھولو۔ میں اندر بیٹھ جاتا ہوں۔ آخر وہ دونوں میاں بیوی آ جائیں گے۔"

"نہیں بھائی کسی ناواقف آدمی کو میں یوں کیسے اندر لے جا کر بٹھا سکتا ہوں....؟"

"میں جب جانے لگوں تو تم میری تلاشی لے لینا۔"

"تم مجھے بڑے ہی چالاک آدمی معلوم ہوتے ہو۔" اس نے ناک بھوں

چڑھاتے ہوئے اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

قہر درویش بر جان درویش۔ خاموشی سے گیٹ کے ایک طرف ایک چھوٹی سی پلی پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کوئی زیادہ دیر نہ ہوئی ہو گی کہ اس آدمی نے گیٹ کھول کر مجھے اندر بلالیا اور اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہ مجھے پڑھنے کے لئے ایک اخبار دے کر باہر برآمدے میں گیٹ کے سامنے جا کر بیٹھ رہا۔

میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ میرے انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھیں۔ زیادہ سگریٹ پینے سے مجھے کھانسی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے سے انسانی کراہٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید اس بیمار کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ڈرائنگ روم میں کوئی اجنبی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اپنی ان دلدوز کراہٹوں کے ذریعے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر لاؤنج کی طرف والا دروازہ کھول کر پتہ لگاؤں۔ لیکن وہ فوجی میرے سامنے کی کھڑکی سے لگا ہوا برآمدے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے پردے بندھے ہوئے تھے۔ باہر سے اندر کا منظر اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ آدمی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گردن گھما کر مجھے دیکھ کر اطمینان کر لیتا۔ یہ ماحول مجھے بڑا ہی پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ گیٹ کی گھنٹی بجی میں نے شکر کیا کہ انتظار کے لمحے اب ختم ہونے کو ہیں۔ وہ آدمی جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ جب اس نے پورا گیٹ کھولا تو ایک فوجی پک اپ جس میں سات آٹھ آدمی تھے اندر آ گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ کرنل سعید بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتر کر نیچے آیا۔ اس نے پک اپ کی بیک سائیڈ پر جا کر ان آدمیوں سے کچھ باتیں کیں لیکن میں نے ان کی ان پراسرار سرگرمیوں کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

کرنل دو آدمیوں کو ساتھ لے کر برآمدے میں آ گیا۔ اس نے اس پہلے آدمی سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ اس آدمی نے فوراً ہی گیٹ کو اندر سے تالا لگا دیا۔ اور خود گاڑی میں بیٹھے ہوئے ان فوجیوں کے ساتھ گپ شپ میں مشغول ہو گیا۔ کرنل سعید ان دو آدمیوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتا رہا۔

پھر اس طرح یونیفارم پہنے ہوئے بید کی سٹک ہاتھ میں گھماتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا پارہ چڑھ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو........؟"

"سعید صاحب میں احمد ہوں۔ آپ سے اور حنا سے ملنے آیا ہوں۔"

"تمہارا حنا سے کیا تعلق ہے......؟"

"میرا حنا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں....؟"

"بالکل میں کہہ رہا ہوں۔ حنا تمہاری کیا لگتی ہے۔ ماں لگتی ہے......؟"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں تمہارے گھر آیا ہوا ہوں۔ اگر کہیں اور ہوتا تو تمہیں ان باتوں کا مزہ چکھاتا۔"

کرنل سعید نے آگے بڑھ کر ایک زور کا چانٹا میرے منہ پر مارا۔

"تم لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہو۔" اس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر اتنی زور کا ایک مکا مارا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ وہ جو دو آدمی اس کے ساتھ آئے تھے اور دروازے میں کھڑے تھے۔ میری طرف بڑھے اس سے پیشتر کہ وہ دونوں مجھ پر حملہ آور ہوں میں نے سعید کی لاتوں سے خوب درگت بنائی۔

وہ دونوں آدمی لپک کر میری طرف آئے۔ اللہ نے میری لاج رکھ لی میں باکسنگ کا کھلاڑی تھا میں نے بھرپور مکوں کے وار ان پر کئے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ دونوں ایک ایک مکا کنپٹی پر لگنے سے گر گئے۔ میں نے گرنے کے بعد پھر ان کو کچھ نہیں کہا۔ سعید کے چوتڑوں پر جا کر ایک لات جمائی۔ وہ جھوٹ موٹ کا بے ہوش بنا بے حس و حرکت قالین پر پڑا تھا۔ باہر والوں کو اندر والوں کے احوال کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ بدستور گاڑی کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور کرنل کا وہ تنخواہ دار دلی بدستور کرسی پر گیٹ کے قریب بیٹھا اپنی سوچوں کے بھنور میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں آہستہ سے ڈرائنگ روم سے نکل کر گیلری میں آ گیا۔

نکلتے وقت ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ گیلری

کے باہر کے دروازے کو بھی اندر سے بند کر دیا۔ اب نہ باہر کے آدمی اندر آسکتے تھے اور نہ ہی کرنل سعید اور اس کے دونوں ساتھی باہر جا سکتے تھے۔ میں نے گیلری کے اندر پھر کر سب کمروں کے دروازے کھول کر دیکھے اندر کوئی آدمی بھی نہ تھا۔ اب بیٹھک، کے ساتھ کا ایک کمرہ رہ گیا تھا۔ یہ کمرہ مجھے سٹور معلوم ہوتا تھا چونکہ اسے باہر سے ایک معمولی سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس مقفل کمرے کے دروازے کو زور سے دھکیلا دروازے نے تو کیا کھلنا تھا۔ اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اندر کسی محبوس آدمی کی موجودگی کا مجھے احساس ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ ناک کیا کوئی آدمی چارپائی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر آیا اور پھر بڑے ہی دھیمے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

کون ہے۔ بڑی ہی نحیف و نزار نسوانی آواز تھی۔ یوں پتہ لگتا تھا جیسے کسی بڑے گہرے کنوئیں کی تہہ سے یہ آواز آرہی ہو۔

"میں احمد ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔ آپ کون ہیں.....؟"

"احمد میں حنا ہوں اس ظالم آدمی نے کئی دنوں سے مجھے اس کوٹھڑی میں قید کر رکھا ہے۔ تالا توڑنے کی کوشش کرو۔"

میں نے کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا مجھے سریے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا میں وہ ٹکڑا اٹھا لایا۔ اس تالے کو ایک منٹ میں کھول لیا۔ دروازہ کھولا تو حنا لپک کر دیوانوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئی۔

میں نے حنا کو بتایا کہ

"صبر سے کام لو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن وہ صبر کہاں کر سکتی تھی۔ آنسوؤں کا دریا تھا کہ کسی طور تھمتا ہی نہ تھا۔ جب اس کی کچھ ڈھیر بندھی تو میں نے اسے سب صورت حال سے آگاہ کیا کہ کرنل سعید کو تمہارے اردلی نے ٹیلی فون کر کے بتا دیا تھا کہ احمد لاہور سے آپ کو اور آپ کی بیگم صاحبہ کو ملنے کے لئے آیا ہے۔ میرا خیال ہے اس نے اردلی کو میرے متعلق پوری اور واضح ہدایات دی تھیں چونکہ اس کے بعد اس اردلی کا سلوک یکایک میرے ساتھ بڑا ذلت آمیز ہو گیا۔ میں نے اسی سے حالات کا اندازہ لگا لیا اور آنے والے خطرے کو میں نے پہلے سے بھانپ لیا لیکن نتائج کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر میں ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد کرنل سعید اپنے سات آٹھ آدمی لے کر ایک فوجی پک اپ میں آگیا۔ گیٹ کو اندر سے تالا لگوا دیا اور تندرست و توانا آدمیوں کو لے کر اندر ڈرائینگ روم میں آگیا۔ آتے ہی مجھے گالیاں دینے لگ گیا۔ اور پھر میرے منہ پر ایک زور کا چانٹا مارا میں نے اس کو کنپٹی پر ایک ہی گھونسا مارا۔ چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کے دونوں ساتھی میری طرف لپکے ان کو بھی میں نے کنپٹیوں پر مکے مارے وہ بھی گر گئے۔ وہ اندر ڈرائنگ روم میں پڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے آدمی باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں اندر کی خبر ہی نہیں ہے۔"

"اچھا احمد اب ایسا کرتے ہیں میں دو منٹ میں کپڑے بدل کر اپنا سامان لے کر آتی ہوں۔ پیشتر اس کے کہ یہ لوگ ہم تک پہنچیں ہم دونوں ساتھ والی کوٹھی میں پناہ لے لیتے ہیں۔"

"یہ کوٹھی کس کی ہے.....؟"

جنرل ہیڈ کوارٹر کے بریگیڈیئر صاحب ہیں جو پرووسٹ مارشل کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔ ان کی بیگم میری بڑی اچھی دوست ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب بھی بہت اچھے اور نیک دل آفیسر ہیں۔"

"اگر بریگیڈیئر صاحب نے بھی سعید کی طرفداری کی تو میں تو مارا جاؤں گا۔"

"نہیں تم اطمینان رکھو۔ وہ بریگیڈیئر صاحب سعید کو اس کی بری اور کمینہ خصلات کی وجہ سے سخت ناپسند کرتے ہیں۔"

"تمہیں یقین ہے۔ وہ ہماری پوری مدد کریں گے۔"

"بالکل سو فیصد۔ انشاء اللہ اب سعید بچ کر نہیں جا سکتا۔"

تقریباً پانچ منٹ میں حنا کپڑے بدل کر اور اپنا ضروری سامان اپنے اٹیچی کیس میں ڈال کر آگئی۔ اور پھر ہم دونوں نے سعید کی کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف سے فینس (FENCE) کراس کی اور بریگیڈیئر رضوی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو گئے ہماری خوش قسمتی کہ بیگم رضوی اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور حنا سے کہنے لگیں۔

"کیوں حنا خیریت تو ہے۔ تم یوں بدحواسی کے عالم میں اس حالت میں.....؟"

"ہاں نازیہ۔ خیریت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ تم رضوی بھائی جان سے جلدی میری بات کراؤ۔"

بیگم رضوی نے بریگیڈیئر رضوی صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ جب وہ ٹیلی فون پر آئے تو نازیہ نے ان سے کہا۔

"فہیم میں نازیہ بول رہی ہوں حنا کو اس وقت تمہاری مدد کی بہت سخت ضرورت ہے۔ وقت بہت کم ہے تم جلدی گھر آؤ اور آنے سے پہلے اپنے پولیس والوں کو فون کر دو کہ وہ کم از کم پندرہ آدمی اور ایک افسر جلد آئے تاکہ وہ متعلقہ آدمیوں کو گرفتار کر سکیں۔"

"اچھا حنا کو ٹیلی فون دو۔" اور پھر نازیہ نے ٹیلی فون حنا کو دے دیا۔

"ہیلو..... کون رضوی صاحب بول رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"بھائی جان میں حنا بول رہی ہوں بہت ہی ایمرجنسی ہے۔ آپ فوراً آئیں۔ اگر اس وقت آپ میری مدد کو نہ آئے تو سعید اور اس کے ساتھی بھاگ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میری بہن میں پانچ منٹ کے بعد پہنچ رہا ہوں میں کہاں آؤں.....؟"

"بھائی جان میں آپ کے گھر بیٹھی ہوں۔ آپ سیدھے اپنے گھر آئیں۔"

تقریباً پانچ منٹ کے بعد بریگیڈیئر صاحب اپنی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ حنا اور میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا۔

"حنا بہن یہ صاحب کون ہیں.....؟"

"بھائی جان ان کے متعلق میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں آپ کو آج کے واقعات کے متعلق بتاتی ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ تقریباً بیس ملٹری پولیس کے جوان موٹر سائیکلوں پر سوار ایک میجر کی قیادت میں وہاں پہنچ گئے۔ موٹر سائیکلوں کی آواز سن کر بریگیڈیئر صاحب اپنی کوٹھی کے گیٹ پر آ گئے۔ میجر صاحب نے ان کو اپنے آنے کی رپورٹ دی۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جوانوں کے پاس گئے بریگیڈیئر صاحب نے حوالدار کو کہا کہ

"آپ آدھے جوانوں کو لے کر اس کوٹھی کو پچھلی طرف سے گھیرے میں لے لو۔ خیال رہے کہ اس کوٹھی میں کچھ آدمی ہیں جن کو گرفتار کرنا مقصود ہے کہیں بھاگنے نہ پائیں۔ دوسرے حوالدار کو کہا کہ تم کوٹھی کے سامنے کی طرف سے دیکھو۔"

بریگیڈیئر صاحب نے واپس آ کر ایڈجوٹینٹ جنرل سے ٹیلیفون پر بات کی۔ انہوں نے کہا کہ

"میں ڈائریکٹر میڈیکل سروسز کو لے کر آ رہا ہوں۔ آپ ہمارا انتظار کریں۔"

بریگیڈیئر فہیم اور میجر شاہ چلتے ہوئے واپس اپنی کوٹھی کے سامنے آ گئے۔ بریگیڈیئر فہیم نے اندر جا کر اپنی بیگم کو بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایڈجوٹینٹ جنرل اور ڈائریکٹر میڈیکل سروسز آ رہے ہیں۔ سٹنگ روم کو ذرا دیکھ لو۔ اور چائے وغیرہ کا بھی معقول انتظام کر رکھنا۔

"ہو جائے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

وہ دونوں ان سینئر افسروں کی پذیرائی کے لئے سڑک پر کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد وہ دونوں جرنیل بھی آ گئے۔ بریگیڈیئر رضوی صاحب نے آگے بڑھ کر ان کی پذیرائی کی اور وہ پھر ان کو اپنے گھر کی طرف لے کر چلے گئے۔ جنرل صاحب نے ان سے کہا۔

رضوی صاحب وہ آدمی اس کوٹھی میں ہیں......؟

"نہیں سر......"

"اگلی کوٹھی میں ہیں۔ ایک کپ چائے کا پی لیں پھر چلتے ہیں۔"

"چائے واپس آ کر پی لیں گے۔"

اور پھر وہ چاروں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کرنل سعید کی کوٹھی کے آگے آ کر رک گئے۔ کوٹھی میں کوئی زندگی کا نام و نشان نہ تھا۔ بالکل سنسان دکھائی دیتی تھی۔ ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب نے آ کر گیٹ پر کال بیل دی۔

فوراً اندر سے کسی نے بڑے ہی کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے.....؟"

"گیٹ کھولو۔"

"کون ہو تم۔"

"ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔ کون ہوں" جنرل صاحب نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

"جب تک مجھے کرنل صاحب حکم نہیں دیں گے میں گیٹ نہیں کھولوں گا۔"

"کہاں ہیں کرنل صاحب۔"

"تم کون ہو پوچھنے والے...؟"

"تم کرنل صاحب کو فوراً گیٹ پر بلاؤ۔"

"وہ اس وقت گیٹ پر نہیں، آ سکتے۔"

"اچھا تو ہم خود آ جاتے ہیں۔"

جنرل صاحب نے ملٹری پولیس والوں سے کہا۔

"جوان۔ دیوار پھاند کر اندر جاؤ اور فوراً گیٹ کھولو۔"

ایک سپاہی نے قمیض۔ ٹوپی اور بیلٹ اتار کر اپنے ایک ساتھی کو دے دی اور ایک دوسرے آدمی کی مدد سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ گیٹ پر جو آدمی بیٹھا تھا اس کو اس نے کہا۔

"گیٹ کھولو۔"

"تم کون ہوتے ہو گیٹ کھلوانے والے"

کرنل سعید ڈرائنگ روم میں کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ادھر سے للکارتے ہوئے کہا۔

"اس آدمی کو اندر آنے کا مزہ چکھاؤ۔"

اور پھر جتنے آدمی پک اپ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اور اس گیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اس جوان کو بری طرح زدوکوب کیا۔ اس کا شور اور چیخ و پکار سن کر جنرل صاحب نے ملٹری پولیس والوں کو حکم دیا کہ "جوانو....!! سب اکٹھے دیوار پر چڑھو اور پہلے گیٹ کھولو اور پھر اندر جو آدمی ہیں ان کو قابو کرنے کی کوشش کرو۔"

"بہت اچھا سر.....!"

اور پھر وہ سب کے سب جوان دیوار پھاند کر کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔

اندر والے آدمیوں نے جب یوں ملٹری پولیس والوں کو دیوار پھاند کر اندر آتے ہوئے دیکھا تو ان کی ہوا نکل گئی۔ ان میں سے ایک سپاہی نے صوبیدار میجر فتح علی خان کو جو پک اپ کی فرسٹ سیٹ پر سویا پڑا تھا جا کر یہ سب کچھ بتایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اپنی بے تحاشا بڑھی ہوئی توند پر پیٹی کو جماتے ہوئے بوکھلا کر اٹھا اور بھاگ کر گیٹ کی طرف آیا۔ ملٹری پولیس والے کرنل سعید کے اردلی کو بار بار گیٹ کھولنے کی تاکید کر رہے تھے۔

"میرے پاس گیٹ کی چابی نہیں ہے۔"

"کس کے پاس ہے......؟"

"کرنل صاحب کو پتہ ہو گا۔"

حوالدار ارسلا خان نے اسے ایک ہی اڑنگا لگایا کہ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ اوپر سے دو چار بھرپور لاتیں جمائیں تو وہ کہنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے کچھ نہ کہو کھولتا ہوں گیٹ۔"

"اچھا کھولو...!"

کرنل سعید کے اردلی نے جو اس کے سب جرائم میں برابر کا شریک اور اس کا ھمراز تھا نے آگے بڑھ کر جیب سے چابی نکالی اور گیٹ کو کھول دیا۔ باہر جو جرنیل کھڑے ہوئے تھے اندر آ گئے۔ ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب بہت غصے میں تھے۔ ڈائریکٹر

میڈیکل سروسز ندامت سے سر جھکائے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بریگیڈیئر نعیم رضوی صاحب اپنے اس کامیاب چھاپے پر بہت خوش تھے۔

جب یہ جنرل صاحبان پک اپ کے پاس گئے تو صوبیدار میجر فتح علی خان نے سیلوٹ کیا۔ جنرل صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"صاحب آپ ادھر کیا کر رہے ہیں.....؟"

"سر میں کرنل صاحب کے ساتھ آیا ہوں۔"

"کون کرنل صاحب....؟"

"کرنل سعید صاحب' سر...!"

"کہاں ہیں وہ....؟"

"سر وہ اندر ہیں۔"

"کس غرض کے لئے وہ آپ کو ساتھ لائے ہیں۔"

"سر انہوں نے کہا تھا کہ ان کی کوٹھی میں ایک نامی گرامی غنڈہ گھسا ہوا ہے۔ اسے پکڑنا ہے۔"

"کتنی دیر ہوئی ہے آپ کو آئے ہوئے......؟"

"سر تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا ہے۔"

"وہ غنڈہ آپ نے پکڑ لیا ہے۔"

کرنل صاحب اور دو جوان اس کو پکڑنے کے لئے اندر گئے ہوئے ہیں۔

"پکڑ لیا ہے اس کو؟"

"سر ہمیں تو معلوم نہیں۔ ہم تو باہر ہی بیٹھے ہیں۔"

"کتنے آدمی ہیں آپ لوگ.....؟"

"سر ایک ڈرائیور ایک حوالدار اور آٹھ سپاہی میں اپنے ساتھ لایا تھا۔"

"اس غنڈے کے پاس کوئی توپ بھی ہے۔" ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"معلوم نہیں سر۔"

"کہاں ہے کرنل سعید......؟"

"سر وہ اندر ہیں۔"

"اچھا ان کو بلاؤ۔"

جب صوبیدار میجر نے کرنل سعید کو بلانے کے لئے ان کے اردلی کو بھیجا تو جنرل صاحب نے پوچھا۔

"صوبیدار میجر صاحب یہ گیٹ کو اندر سے تالا کیوں لگایا ہوا تھا.....؟"

"سر مجھے تو اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔"

"کس کو خبر ہو گی۔"

"سر کرنل صاحب کے اردلی کو پتہ ہو گا۔"

"کہاں ہے وہ اردلی.......؟"

"سر کرنل صاحب کو بلانے کے لئے جو آدمی گیا ہے وہی کرنل صاحب کا اردلی ہے۔"

"سر گیلری کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس آدمی (اردلی) نے واپس آ کر کہا۔"

"تم کھٹکھٹاتے کیوں نہیں......؟"

"سر کرنل صاحب ناراض ہوتے ہیں۔"

وہ سب آفیسرز برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔ ڈرائنگ روم کی برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنرل صاحب نے کھڑکی کی جالی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ سامنے صوفوں پر بیٹھے تین آدمی آہستہ آہستہ آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے ان کی بدقسمتی کہ باہر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا تھا اور ان کو اندر اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ باہر کے حالات سے بے نیاز ہو کر احمد کو زیرِ دام لانے کی سکیمیں بنا رہے تھے۔

جنرل صاحب نے کھڑکی کے پاس آ کر فوجی انداز میں گھن گرج پیدا کرتے ہوئے آرڈر دیا۔

"کرنل سعید فوراً دروازہ کھولو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔"

کرنل سعید نے اپنے نام سنا تو وہ غصے سے بپھر کر کھڑکی کے پاس آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ برآمدے میں ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب۔ ڈائریکٹر میڈیکل سروسز،

پروڈسٹ مارشل اور ملٹری پولیس کا میجر شاہ کھڑے ہیں تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں نے دوڑ کر اسے اٹھایا اور صوفے پر ڈالا۔ سامنے باہر کھڑے ہوئے جنرل صاحب نے ان آدمیوں کو آرڈر دیا۔

"پہلے دروازہ کھولو۔"

"سر دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔"

"دروازے کو باہر سے کنڈی کس نے لگائی ہے......؟"

"سر جس آدمی کو ہم پکڑنے کے لئے آئے تھے۔ غالباً اس نے لگائی ہے۔"

ایڈجوٹنٹ جنرل صاحب کے حکم پر میجر شاہ نے چاروں طرف سے پھر کر ایک دروازہ کھلا پایا۔ اس سے وہ اندر داخل ہو گیا اور جا کر گیلری کی اندر والی کنڈی کھولی۔ وہ تینوں بڑے افسر اندر آ گئے۔ پھر میجر شاہ نے بڑھ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے کھولا۔ وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ کرنل سعید بدستور ایک صوفے پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ وہ دوسرے دو آدمی باہر جانے لگے تو جنرل صاحب نے ان کو روک لیا۔

"کہاں جاتے ہو.......؟ ادھر ہی ٹھہرو۔" وہ دونو فوجی انداز میں اٹینشن کھڑے ہو گئے۔

"میجر شاہ....! آپ باہر سے صوبیدار میجر صاحب کو اور کرنل سعید کے اردلی کو اندر بلا لائیں۔ اپنے آدمیوں کو کہیں کہ گیٹ بند کر دیں اور وہ سب اندر آ جائیں۔"

صوبیدار میجر فتح علی خان اور سپاہی گل شیر دونوں اندر آ گئے اور وہ بھی ان آدمیوں کے ساتھ اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ ڈائریکٹر میڈیکل سروسز نے ہسپتال میں ٹیلی فون کیا وہاں سے ایک ڈاکٹر ایمبولینس گاڑی لے کر آ گیا۔ اس نے کرنل سعید کو دیکھا۔ کہنے لگا۔

"سر ان کو ہسپتال لے جاتے ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں میجر حسن اس کو یہیں ہی اٹینڈ کرو۔" ڈائریکٹر نے ہدایات دیتے

ہوئے کہا۔

"اچھا سر.....!!"

میجر حسن نے ہسپتال ٹیلی فون کیا اور کچھ ادویات اور ٹیکے منگوائے۔ جب آدمی یہ لے کر آگیا تو انہوں نے کرنل سعید کو دو الگ الگ انجیکشن دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو ہوش آگیا۔ پھر میجر حسن نے ان کو کھانے کی دوائی دی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ جنرل صاحب نے ان کو آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی ان کو ہدایت کی کہ آپ اپنے گھر سے باہر ہرگز نہ جائیں گے۔ آپ جب مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں تو پھر اس کیس کی سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کی جائے گی۔ وہ کچھ پوچھے بغیر اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے اس کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا دیکھا جس میں اس نے کئی روز سے حنا کو قید کر رکھا تھا۔ اس نے جاتے جاتے دروازے کو ہلکا سا کھول کر ایک نظر اندر کو دیکھا۔ اندر کوئی آدمی نہ تھا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ حنا نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ اترے ہوئے اس پلنگ پر پڑے تھے جو اس نے خصوصی طور پر حنا کے لئے یہاں ڈلوایا تھا۔

وہ جا کر اپنے پلنگ پر لباس تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا یہ حنا تو میرے لئے وبال جان بنتی جا رہی ہے۔ پہلے تو جو کچھ بھی میں اس سے سلوک روا رکھتا تھا کسی کو پتہ نہ چلتا تھا لیکن اب تو تمام حالات طشت از بام ہو گئے ہیں۔ ایڈجوٹینٹ جنرل ڈائریکٹر میڈیکل سروسز اور پرووسٹ مارشل کو یہاں کون لایا ہے۔ باہر یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور ہماری بدقسمتی کہ ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اردلی کے لئے گھنٹی بجائی۔ اردلی وہاں ہوتا تو آتا۔

آخر تھک ہار کر وہ خود اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ اس کا باورچی کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ کچن کوٹھی کے بالکل عقب میں تھا۔ محمد شفیع کک کو کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ کرنل سعید کی کوٹھی میں بھونچال آیا ہے۔ اور کون کون اس کا لقمہ بنے ہیں۔

شفیع نے کرنل سعید کو کچن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیڑی پی رہا تھا۔ اسے زمین پر ڈال کر پاؤں سے مسل دیا۔ نہایت ہی تعظیم سے فوجی انداز میں اٹینشن ہو کر کرنل سعید کو سلامی دی۔

"کیا کر رہے ہو بابا........؟" سعید نے بڑی ملائمیت سے پوچھا۔

"سرکار کھانا تیار کر رہا ہوں۔"

"ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنا وقت لگے گا......؟"

"بس سرکار دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔"

"بابا بڑی بھوک لگی ہے۔ ذرا جلدی کرو۔"

"کیوں سرکار آپ نے آج ناشتہ ٹھیک سے نہیں کیا......؟"

"نہیں بابا ناشتہ تو ٹھیک ہی کیا تھا۔"

"اچھا سرکار آپ منہ ہاتھ دھوئیں۔ بیگم صاحبہ کو بھی جگائیں۔ آپ کھانے والے کمرے میں بیٹھیں میں تھوڑی ہی دیر میں کھانا لاتا ہوں۔"

"بابا کیا بیگم صاحبہ ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔"

"سرکار میں نے تو دیکھا نہیں۔"

"اچھا تم جا کر دیکھو اور اگر وہ سوئی ہوئی ہیں تو اسے جگا کر بتا دو کہ کھانے کے لئے آئے۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

محمد شفیع نے ہانڈی کو دیکھا وہ پک چکی تھی۔ اتار کر نیچے رکھ دی۔ چولہا بند کر دیا اور پھر بیگم صاحبہ کے کمرے کی طرف چلا گیا وہ اپنے کمرے میں نہ تھی۔ اس نے سب کمروں میں پھر کر دیکھا کہیں بھی اس کا نام و نشان نہ ملا۔ وہ واپس باورچی خانہ میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ کرنل سعید لکڑی کی ایک پرانی سی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کرسی کی ایک ٹانگ ہی نہ تھی۔ محمد شفیع نے اینٹیں رکھ کر یہ کمی پوری کی ہوئی تھی۔

"کیوں بابا........؟" بیگم صاحبہ کو بتا دیا ہے......؟ کرنل سعید نے تجسس بھرے انداز میں کہا۔"

"سرکار بیگم صاحبہ تو ادھر نہیں ہیں۔ ان کو ہر ایک جگہ جا کر دیکھا۔"

"کہاں گئی ہیں......؟"

؟ سرکار مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ میں تو صبح سے یہاں ہی کچن میں بیٹھا کام کر رہا ہوں۔"

"بازار تو نہیں چلی گئیں........؟"

"سرکار....... گاڑی نہیں منگوائی۔"

"اچھا ایسا کرو۔ جاؤ گل شیر کو بلا کر لے آؤ۔"

"سرکار گل شیر بھی کہیں نظر نہیں آیا۔"

"جاؤ اسے تلاش کرو۔"

بابا محمد شفیع نے کوٹھی کے سارے کمرے دیکھے۔ سرونٹ کوارٹر میں اسے جا کر دیکھا۔ اس کا کوارٹر مقفل پڑا ہوا تھا۔ اور گل شیر کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ واپس آ کر کرنل سعید سے کہنے لگا۔

"سرکار..... گل شیر کا بھی کوئی پتہ نہیں چل رہا۔"

"اچھا ایسا کرو۔ ساتھ والی کوٹھی میں جا کر پتہ کرو۔ اگر بیگم صاحبہ وہاں ہو تو اسے کہو کہ وہ جلدی گھر آئیں۔"

"بہت اچھا سرکار...."

بابا محمد شفیع بریگیڈیئر فہیم رضوی صاحب کی کوٹھی میں درمیانی فینس (FENCE) سے گزر کر چلا گیا۔ وہ ان کے خانساماں کا دوست تھا۔ سیدھا کچن میں چلا گیا۔ دیکھا تو رمضان علی بڑا مصروف تھا۔ پاس میز پر بہت سے مرغ ذبح ہوئے پڑے ہیں۔ جن کی صفائی میں صاحب کا اردلی لگا ہوا ہے۔

"آؤ جی بابا جی۔ آؤ۔" رمضان نے بابا کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی رمضان علی آج تو بڑے مصروف ہو۔ کوئی مہمان آ گئے ہیں.....؟"

"بابا وہی مہمان جو آپ کے گھر آئے تھے۔ انہی کا کھانا پکا رہا ہوں۔"

"بھئی ہمارے گھر کون سے مہمان آئے تھے۔ ہمارے گھر تو صبح سے کوئی آیا ہی نہیں۔"

"بابا آپ شاید صبح سے اس وقت تک اپنے کوارٹر میں سوئے رہے ہیں۔ آپ کو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ کہ کیا ہو گیا ہے.....؟"

"نہیں بھیا.....!! سچی ۔ مجھے کچھ خبر نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے....؟ ہمارے

کرنل صاحب بھی اپنے کمرے میں سوئے ہیں ان کو بھی کوئی خبر نہیں۔"

"بابا آپ کے کرنل صاحب کو تو سب کچھ پتہ ہے۔ انہی کی تو انکوائری کرنے یہ جرنیل لوگ آئے ہیں۔"

"کون جرنیل لوگ بھیا....!! ذرا صاف صاف بات بتاؤ۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔"

"بابا آپ کے کرنل صاحب نے بیگم صاحب کے کسی مہمان کو مارا ہے۔ بیگم صاحب کو بھی مارنے لگے تو وہ دونو بھاگ کر ہمارے ہاں آ گئے ہیں۔"

"اچھا تو ہماری بیگم اور ان کا مہمان آپ کے گھر میں ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"تو آپ کتنے آدمیوں کا کھانا بنا رہے ہیں....؟"

"صرف پانچ آدمیوں کے لئے۔"

"کون کون سے پانچ۔"

"دو جرنیل ہیں۔ ان کے ساتھ ملٹری پولیس کا ایک میجر ہے اور ایک آپ کی بیگم اور ان کا مہمان۔"

"اچھا تو پھر آپ کے ہاں تو آج بڑی دعوت ہے۔"

"جی ہاں....!"

"بابا بیٹھیں آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ آج کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے۔"

"نہیں بھیا.... بڑی مہربانی۔"

بابا محمد شفیع کو مکمل معلومات مل گئی تھیں۔ وہ ابھی راستے سے واپس اپنی کوٹھی میں آگیا۔ سیدھا کچن میں گیا۔ کرنل صاحب وہاں نہ تھے۔ وہ کچن کا دروازہ بند کر کے کرنل صاحب کے کمرے میں گیا۔ کرنل سعید دل شکنی کے عالم میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے بابا کے پاؤں کی آہٹ سنی تو پہلو بدل کر منہ دروازے کی طرف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیوں بابا کوئی پتہ چلا......؟"

"سرکار سب بات کا پتہ چل گیا ہے۔"

"سب بات کیا.....؟"

"سرکار ابھی بتاتا ہوں۔"

"بیگم صاحبہ کا کوئی پتہ چلا.....؟"

"سرکار بریگیڈیئر صاحب کے خانساماں رمضان علی نے بتایا ہے کہ بیگم صاحب اور ان کا مہمان دونوں وہاں موجود ہیں۔ اور آپ پر جو کیس بنایا گیا ہے اس میں وہ دونو گواہ ہیں۔

"مجھ پر کوئی کیس بنایا گیا ہے۔ بابا تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کرنل سعید نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔"

"ہاں سرکار۔ خدا نہ کرے ایسا ہو..... مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" بابا نے رکتے رکتے یہ کہا۔

"اچھا بابا مجھے ذرا یہ ٹیلی فون اٹھا کر دو۔"

"بہت اچھا سرکار۔" اور پھر بابا نے ٹیلی فون اپنی مقررہ جگہ سے اٹھا کر سعید صاحب کو لا کر دیا۔

کرنل سعید تھوڑی دیر کے لئے ڈائل پر نمبر گھماتا رہا۔ آخر دوسری طرف سے کسی نے ٹیلی فون اٹھا ہی لیا۔

"ہیلو..... میں ..... نمبر سے بول رہا ہوں۔"

"آپ کون بول رہے ہیں.....؟"

"سر میں کرنل سعید بول رہا ہوں۔"

"کیوں سعید صاحب.....؟"

"سر آپ ذرا مہربانی کر کے میری بیگم کو پیغام دیں کہ وہ جلدی گھر آئیں۔"

"آپ ذرا ہولڈ کریں۔"

بریگیڈیئر صاحب نے ٹیلی فون رکھ دیا اور جنرل صاحب کے پاس آکر ان سے کہنے لگے۔

"سر! کرنل سعید کا ٹیلی فون تھا وہ کہتے ہیں کہ میری بیگم کو کہیں کہ وہ جلدی گھر آئے۔"

"اس سے کہہ دیں کہ ابھی انکوائری ہو رہی ہے ۔ ابھی وہ گھر نہیں آ سکتی۔"

بریگیڈیئر رضوی نے یہ پیغام کرنل سعید تک پہنچا دیا۔

"اس کا انکوائری سے کیا تعلق۔"

"بہتر ہے آپ جنرل صاحب سے خود بات کرلیں۔"

جنرل صاحب پاس ہی بیٹھے یہ بات سن رہے تھے۔ انہوں نے رضوی صاحب کے ہاتھ سے ٹیلی فون لے لیا۔

"ہیلو..... کرنل سعید۔ کیا تکلیف ہے تمہیں.....؟"

"آپ کون بول رہے ہیں.....؟"

"میں جنرل حمید بول رہا ہوں۔"

"سر میں نے رضوی صاحب سے گزارش کی ہے کہ میری بیگم کو پیغام دیں کہ وہ جلدی گھر آئیں۔"

"آپ کو پتہ نہیں ابھی انکوائری ہو رہی ہے۔ آپ کی بیگم اور ان کا گیسٹ اس کیس میں اہم گواہ ہیں۔"

"سر اس کی کیا گواہی ہے....؟" وہ بدمعاش آدمی تو خود مجرم ہے۔"

"سعید صاحب یہ سب باتیں تو انکوائری کے بعد ہی پتہ چلیں گی۔"

"سر آپ لوگ بھی اس پراس (PROS) کی طرفداری کر رہے ہیں....؟" وہ آپ کو بھی جال میں پھانس لے گی۔"

"شٹ اپ...!!" جنرل صاحب نے بڑے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر میں سچ کہتا ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں۔"

"کرنل سعید کیا آپ اپنی بیگم کو پراس کہہ رہے ہیں....؟"

"جی ہاں سر....!!"

"تم نے ایک پراس کو گھر میں رکھا ہوا ہے۔"

"سر مجبوری ہے۔ پھنس گیا ہوں۔"

"اچھا اب جان چھوٹ جائے گی فکر مت کرو" اور جنرل صاحب نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

کرنل سعید سے ٹیلی فون پر بات چیت کرنے کے بعد جنرل صاحب کافی پریشان ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے یہ سعید بھی کتنا بے غیرت آدمی ہے۔ اتنی شریف اور پڑھی لکھی خاتون کو پراس کہہ رہا ہے۔ مر جانے کا مقام ہے یہ آدمی اپنی منکوحہ بیوی کو یوں کھلے بندوں دوسرے لوگوں کے سامنے پراس کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچایا۔ انہوں نے بریگیڈیئر رضوی کو کہا۔

"فہیم ذرا میری بات ڈائریکٹر آف سگنلز اور پھر لاگ ایریا کمانڈر سے کروا دیں۔

"بہت اچھا سر!"

"سر ڈائریکٹر آف سگنلز لائن پر ہیں۔"

"ہیلو...!! بریگیڈیئر زمان صاحب ہیں.....؟"

"جی ہاں.....!! میں بول رہا ہوں۔"

"سر میں (A G) بول رہا ہوں۔ (بریگیڈیئر زمان صاحب ان جرنیلوں سے کمشن میں سینئر تھے اور بزرگ آدمی تھے۔ اس لئے تقریباً سب جرنیل ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔)

"ہاں سر فرمایئے۔ کیا حکم ہے.....؟"

آپ ٹیلی فون ایکسچینج کے آفیسر انچارج کو حکم دیں کہ ٹیلی فون نمبر....... جو لیفٹیننٹ کرنل سعید کے گھر لگا ہوا ہے اس کو کاٹیں نہیں۔ لیکن دوسرے حکم تک اس کو ڈیڈ کر دیں تاکہ نہ یہ کسی کو ٹیلی فون کر سکیں اور نہ ہی کوئی ان کو کر سکے۔

"بہت اچھا سر......!"

پھر جنرل صاحب نے ٹیلی فون بریگیڈیئر رضوی صاحب کو دے دیا اور انہوں نے لاگ ایریا کے کمانڈر کو رنگ کر کے ان کو لائن پر لے آئے۔

"سر آپ سے A G بات کرنا چاہتے ہیں۔" بریگیڈیئر رضوی نے سب

ایریا کمانڈر سے کہا۔

"رضوی صاحب کروائیے جنرل صاحب سے بات۔"

"سر لاگ ایریا کمانڈر از آن دی لائن۔"

"تھینک یو.....!" اور پھر انہوں نے رضوی صاحب کے ہاتھ سے ہینڈ سیٹ لے لیا۔

"ہیلو.....!! کون۔ بریگیڈیئر ملک۔"

"اسلام علیکم سر.........!"

ملک صاحب میں A G بول رہا ہوں۔ آپ ایسا کریں۔ لیفٹیننٹ کرنل سعید جو فیملی کے ساتھ کوٹھی نمبر313 ہسپتال روڈ پر رہتے ہیں۔ ان کو گھر سے (EVACUATE) کر کے A.M.C کے میس میں شفٹ کر دیں اور ان کے لئے دو لیفٹیننٹ کرنل یا میجر اسکورٹ ڈی ٹیل کر دیں۔ کسی کو ان سے ملنے نہ دیں۔ اور نہ ہی ان کو کہیں ٹیلی فون وغیرہ کرنے دیں۔ اور نہ ہی سننے دیں۔

"بہت اچھا سر......!"

میجر شاہ صاحب کو بلا کر A G صاحب نے حکم دیا ہے کہ سپاہی گل شیر۔ صوبیدار میجر فتح علی خان۔ بیگم سعید اور صوبیدار احمد صاحب کو یہاں چھوڑ دیں۔ باقی سب لوگوں کو لے جا کر کلوز اریسٹ کر دیں اور ان کو اپنی یونٹ کے کوارٹر گارڈ میں بند کر کے آپ واپس آئیں۔ واپسی پر صرف تین سپاہی اور ایک N.C.O کو ساتھ لائیں۔ باقی آدمیوں کو چھٹی دے دیں۔

"بہتر سر.....!"

میجر شاہ بقایا آدمیوں کو M.P والوں کی نگرانی میں اسکورٹ کر کے اپنی یونٹ میں لے گیا اور ان کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا۔

چائے سے فارغ ہوئے تو A G صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے بریگیڈیئر رضوی صاحب کی کوٹھی پر بیٹھ کر انکوائری کرنے کے، کرنل سعید کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سب کام کریں تاکہ رضوی صاحب کے اہل خانہ مفت میں پریشان نہ ہوں۔ وہ سب وہاں سے اٹھ کر کرنل سعید کی کوٹھی پر آ گئے۔

کرنل سعید ابھی تک وہاں موجود تھا۔ لیکن وہ اپنے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ A G صاحب نے اسے بھی روک لیا۔ سب آدمیوں کو جنرل صاحب نے T V لاؤنج میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ جب ڈرائنگ روم میں صرف A G صاحب ڈائریکٹر میڈیکل سروسز اور پرووسٹ مارشل رہ گئے تو جنرل صاحب نے صوبیدار میجر کو سب سے پہلے بلایا۔ وہ ان سے کہنے لگے۔

"صوبیدار میجر صاحب آپ اب اپنے کوارٹر میں چلے جائیں۔ آپ کہیں آئیں جائیں نہیں۔ اور نہ ہی کہیں کیس کے متعلق بات کریں۔ آپ سچی اور سیدھی بات بتا کر عدالت کی مدد کریں۔ ہم لوگ بھی آپ کی مدد کریں گے۔ اگر آپ نے چالاکی سے کام لیا یا بے جا طور پر کسی کو بچانے کی کوشش کی تو یاد رکھیں آپ خود پھنس جائیں گے۔ پھر آپ کی اتنی طویل سروس سب ضائع چلی جائے گی۔ کوئی بعید نہیں کہ سول جیل بھی ہو جائے۔

"نہیں حضور میں سچی سچی اور کھری کھری باتیں آپ کو بتا دوں گا۔ مجھے کسی کو بے جا طور پر بچانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنی سروس پر تو پانی نہیں پھیرنا چاہتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے.....!! آپ جائیں۔" اب آپ یونٹ کے کام کاج سے فارغ ہیں۔ آپ صبح سویرے ہمیں یہاں آکر رپورٹ کریں۔"

"بہت بہتر حضور...!"

اور پھر صوبیدار میجر سیلوٹ کر کے واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔

اس کے بعد یہ افسران ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے محترمہ زاہدہ حنا کو اندر بلوایا۔ وہ تینوں آفیسرز سامنے کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اپنے سامنے ایک آرام کرسی رکھوا دی۔ حنا کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حنا بڑے اطمینان اور وقار سے چلتی ہوئی آئی اور ان کو سلام کر کے اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی ہم آپ سے جو بھی بات پوچھیں گے آپ بلا خوف و خطر صحیح صحیح بتائیں تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے اور ہمیں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

"سر میں اللہ پاک کی ذات کو حاضر و ناظر جان کر جو کچھ کہوں گی سچ کہوں

گی۔

بیٹی آپ یہ بتائیں۔ یہ احمد صاحب کون ہیں۔ ان سے آپ کا کیا تعلق ہے۔

سر آپ اگر اجازت دیں تو میں آپ کو چند دستاویزات دکھاتی ہوں۔ بہت سی باتیں سمجھنے میں آپ کو آسانی ہو گی۔ اور اس طرح آپ کے قیمتی وقت کا زیاں نہ ہو گا۔"

"ہاں بیٹی ضرور دکھایئے۔"

حنا نے اپنا اور کرنل سعید کا نکاح نامہ ۔ جہلم میں ایک سال پہلے نمبر ۳ کور ہیڈکواٹر کے G - 1 کے ساتھ جو مناقشہ ہوا تھا اس کے اختتام پر کورکمانڈر صاحب نے حنا اور احمد کو اس سے بریئت کا جو لیٹر دیا تھا اس خط کی فوٹو کاپی اور اور اپنا وہ خط جو اس نے تین چار روز پہلے احمد کو لاہور کے پتہ پر لکھا تھا۔ یہ تینوں حنا نے جنرل صاحب کو دے دیے اور ساتھ ہی ان سے گزارش کی۔

"سر یہ سب آپ ایک نظر دیکھ لیں۔ پھر میں جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں گی آپ کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹی...!!" اور پھر جنرل صاحب نے وہ تینوں اٹھا لئے۔ کور کمانڈر صاحب کا لیٹر انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔

نکاح نامہ ڈائریکٹر میڈیکل سروسز کی طرف بڑھا دیا اور وہ پرائیویٹ چٹھی جو حنا نے آج سے تین چار روز پہلے احمد کو لکھی تھی وہ بریگیڈیئر فہیم رضوی کی طرف بڑھا دی۔ وہ تینوں ان کے مندرجات پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔ جب وہ پڑھ چکے تو ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کر لئے۔ جب وہ تینوں دستاویزات دیکھ چکے تو A G صاحب جنرل محمود صاحب سے کہنے لگے۔

"بہت سی باتیں ان تینوں دستاویزات سے واضح ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں سر یہ مناقشہ پرانا ہے ان بے چاروں کو غلط قسم کے لوگ سکون کا سانس نہیں لینے دیتے۔"

"اب تو احمد اس قصے سے الگ ہو گیا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ بے چارے کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیتے۔"

"بیٹی اس طرح کا کوئی واقعہ پہلے جہلم میں بھی آپ دونوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جنرل صاحب نے حنا سے پوچھا۔"

"جی ہاں سر....!!"

"ہر جگہ میری جوانی، حسن اور روپیہ پیسہ میری رسوائی کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔"

"جناب عالی.....!"

"میری داستان بڑی طویل ہے۔ اس مختصر سے وقت میں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اب آپ حضرات کا لنچ ٹائم بھی ہو رہا ہے۔ ویسے بھی ڈیوٹی کے اوقات ختم ہو جائیں گے۔ اس تھوڑے سے وقت میں آپ کچھ بھی ریکارڈ نہ کر سکیں گے۔ بہتر ہے۔ اسے اب آپ کل پر اٹھا رکھیں۔"

"نہیں بیٹی، دوپہر کا کھانا ہم سب لوگ رضوی صاحب کے ہاں ہی کھا رہے ہیں۔ پھر شام تک یہی کام کریں گے۔"

"اچھی بات ہے سر۔ آپ ایک نظر اس کمرے کو دیکھ لیں۔ جس میں سعید نے مجھے ایک ماہ سے محبوس کیا ہوا تھا۔"

"اچھا آپ کو کمرے کے اندر قید تنہائی میں رکھا ہوا تھا۔"

"جی سر.....!"

"گھر کے کسی نوکر کو بھی یہ پتہ نہیں تھا۔"

"سر....!! اس اردلی کے بغیر اور کسی کو بھی پتہ نہ تھا، اور یہ اردلی سعید کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ دونو مجھے باری باری زدو کوب کیا کرتے تھے۔ پھر سعید کمرے کو تالا لگا کر اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔"

"تو آپ کو اس کمرے سے کس نے نکالا ہے......؟"

"سر.... احمد نے تالا توڑ کر نکالا ہے۔"

یہ سن کر وہ تینوں صاحبان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈرائنگ روم سے گیلری میں آ گئے۔ حنا آگے آگے تھی۔ وہ اس کمرے کے پاس آ کر رک گئی۔ اس دروازے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک وہ سریئے کا ٹکڑا بھی پڑا ہوا تھا، حنا نے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"سر یہ ملاحظہ فرمائیں.....!! اس دروازے کا تالا ٹوٹا ہوا یہ پڑا ہے۔"
وہ تینوں صاحبان اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اور جنرل محمود نے آگے بڑھ کر وہ تالا اور آئرن راڈ اٹھالی۔ تالا فی الواقعہ ٹوٹا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ ٹوٹا ہوا تالا A G صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جیسے وہ یقین کر لینا چاہتے ہوں کہ کیا یہ بات صحیح ہے۔
اتنے میں زاہدہ حنا نے پاؤں سے کمرے کے دروازے کو دھکیل دیا۔ دروازہ کھل گیا وہ بستر اسی طرح لگا ہوا تھا اور ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر حنا کے اتارے ہوئے وہ کپڑے ابھی تک اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان تینوں نے کمرے میں اچھی طرح ہر جانب نظریں گھما کر ہر چیز کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ A G صاحب نے رضوی صاحب کو کہا۔
"فہیم صاحب یہ سب باتیں آپ نوٹ کرتے جائیں۔ آگے چل کر یہ ہمیں مدد دیں گی۔"
"بہتر سر.....!"
اور پھر فہیم صاحب نے اپنی نوٹ بک نکالی اور یہ سب کچھ نوٹ کر لیا۔
"سر اس ظالم انسان نے ایک ماہ سے مجھے اس کمرے میں قید کر رکھا تھا۔ مجھ پر انسانیت سوز مظالم ڈھاتا رہا۔"
"بیٹی حوصلہ کرو۔ ہمیں بتاؤ آخر کیا کرتا تھا.....؟"
"سر اس اردلی کے کوارٹر میں اب بھی آپ جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ وہاں ایک پنجرے میں چوہے بند پڑے ہیں یہ دونوں بے غیرت میرے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر میری شلوار کے پائنچے ٹخنوں کے پاس سے اچھی طرح باندھ دیتے اور پھر میری شلوار کھول کر اس کے اندر یہ چوہے چھوڑ دیتے اور پھر شلوار مضبوطی سے بند کر دیتے۔ چوہے مجھے کاٹتے اور نازک مقامات پر انجر INJURE کرتے تو میں چیختی اور یہ دونوں اونچے اونچے شیطانی قہقہے لگاتے۔"
"بیٹی اس اردلی نے اس عرصے میں کبھی آپ کو ریپ (RAPE) کرنے کی کوشش تو نہیں کی۔"
"نہیں سر ریپ کرنے کی کوشش تو نہیں کی' لیکن مجھے برائی کے لئے

آمادہ کرنے کی کوششیں ضرور کرتا رہا۔"

"وہ کبھی کامیاب تو نہیں ہوا۔"

"نہیں سر۔ اللہ پاک نے مجھے ہر موقع پر ایسے موذیوں سے اپنے حفظ و امان میں رکھا۔"

ان تینوں صاحبان نے حنا کی معیت میں کوٹھی کے سب کمرے دیکھے۔ جب وہ ان کے بیڈ روم میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ دو نہایت ہی صاف ستھرے بستر دو الگ الگ پلنگوں پر لگے ہوئے ہیں پلنگ آپس میں بالکل جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بستر استعمال ہوا ہوا تھا۔ اس سے ابھی کوئی آدمی جیسے اٹھ کر باہر گیا ہو۔ دوسرا بستر بغیر سلوٹوں کے تھا۔ جس کے پاؤں کی طرف ایک نہایت ہی صاف ستھری سفید چادر لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس بستر پر کافی دنوں سے کوئی سویا ہی نہیں اور بستر محض دکھاوے کے لئے یہاں لگا ہوا ہے۔

وہ سب پھر کر واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ A G نے رضوی صاحب کو کہا۔

"رضوی صاحب پتہ کریں اگر میجر شاہ واپس آ گئے ہوں تو۔"

"بہتر سر....!"

اور پھر وہ اٹھ کر چلے گئے۔

اب پیچھے صرف جنرل حمید صاحب، جنرل محمود صاحب اور حنا رہ گئے۔ جنرل صاحب نے حنا سے کہا۔

"بیٹی آپ کے میاں کو تو ہم نے کلوز اریسٹ کر دیا ہے۔ وہ تو اب واپس یہاں نہ آ سکے گا۔ آپ کے اردلی کو بھی ابھی کوارٹر گارڈ میں بند کرتے ہیں، اب آپ پیچھے یہاں اکیلی ہوں گی۔ اگر آپ چاہیں تو احمد صاحب کو آپ کے پاس چھوڑ دیں تاکہ آپ اکٹھے رہ کر اپنی حفاظت کر سکیں۔"

"سر آپ احمد صاحب کو بلا کر ان کی مرضی معلوم کر لیں۔"

دروازے پر متعین ملٹری پولیس کے آدمی کو جنرل صاحب نے بلا کر حکم دیا کہ احمد صاحب کو بلاؤ۔ احمد اندر آیا۔ اس نے فوجی انداز میں اٹینشن ہو کر جنرل

صاحبان کو سلام پیش کیا۔

"صوبیدار صاحب آج کی کاروائی ختم کرنے لگے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ محترمہ حنا صاحبہ کرنل سعید کے کلوز اریسٹ ہو جانے کے بعد اب یہاں اکیلی ہونگی تو بہتر ہے کہ آپ کیس کے فیصلے تک ان کے پاس یہاں رہیں۔"

"حضور والا.....! میں تو معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے اتنی بڑی ذمہ داری نہ نبھ سکے گی۔ میرا حنا کے قریب رہنا اور ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنا ہی ان سب مناقشوں کا باعث ہے۔۔ میں ایک بالکل معمولی سا آدمی ہوں۔ پہلے بڑا نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اب مزید کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں ایک معمولی سا جے سی او ہوں۔ کرنیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دوسری میری گزارش یہ ہے کہ میں دو دن کی چھٹی لے کر لاہور سے آیا ہوں میری یونٹ لاہور میں ہے۔ اگر مجھے اس کیس کے لئے حضور یہاں روکنا چاہتے ہیں تو میری یونٹ کو از راہ کرم اطلاع کی جائے۔"

"ٹھیک ہے صاحب آپ کی یونٹ میں میں ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں۔"

جنرل صاحب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"تو پھر آپ ہی بتائیں کہ حنا کو کون گارڈ کرے گا۔"

"سر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

رضوی صاحب میجر شاہ صاحب کو ساتھ لے کر جنرل صاحبان کے پاس واپس آ گئے۔ لاگ ایریا سے ایک کرنل اور ایک میجر کرنل سعید کو لینے کے لئے آ گئے۔ A G صاحب نے اسے لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اسے ایک پک اپ میں بٹھا کر اور اس کا ضروری سامان اس میں ڈال کر A.M.C میس میں لے گئے۔ بریگیڈیئر رضوی صاحب کے اردلی نے آکر بریگیڈیئر صاحب کو مطلع کیا کہ کھانا تیار ہے۔

وہ سب وہاں سے اٹھ کر رضوی صاحب کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

چلتے وقت جنرل صاحب نے حنا کو کہا۔

"بیٹی آپ بھی آئیں۔"

"سر میں کھانا یہاں ہی کھاؤنگی۔ میرا کک ادھر ہی ہے۔"

"نہیں بیٹی آپ ادھر ہی کھائیں۔"

"سر.... احمد صاحب میرے گیسٹ بھی تو ہیں۔"

"اچھا آپ دونوں کا کھانا یہاں ہی بھجوا دیتا ہوں۔"

ملٹری پولیس والوں کا کھانا ان کی یونٹ سے آ گیا۔ گل شیر نے بھی ان کے ساتھ کھا لیا۔ حنا اور احمد کے لئے رضوی صاحب کے گھر سے کھانا آ گیا۔ وہ دونو کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ وہ چھ ماہ کے بعد ملے تھے لیکن وہ سمجھتے تھے جیسے ہم چھ صدیوں کے بعد ملے ہیں اور اس عرصے میں کتنے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔

جب وہ اعلیٰ افسران کھانا کھا کر واپس آئے تو ملٹری پولیس والے اور سپاہی گل شیر (کرنل سعید کا اردلی) گیلری میں بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ وہ ان افسر صاحبان کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حنا اور احمد دونوں ان کو دیکھ کر باہر گیلری میں آ گئے۔ جنرل حمید صاحب نے گل شیر سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں۔"

"سر میں کرنل سعید کا اردلی ہوں۔"

"کہاں رہتے ہو۔"

"سر بنگلے کے سرونٹ کواٹر میں۔"

بیوی بچے بھی ساتھ ہیں یا ایسے ہی ہو۔"

"نہیں سر اکیلا ہی ہوں۔"

"کھانا کہاں سے کھاتے ہو۔"

"کرنل صاحب کے ہاں سے۔"

اچھا چلو تمہارا کواٹر دیکھتے ہیں۔"

"سر ہم غریب لوگوں کے کواٹر کوئی دیکھنے والے ہوتے ہیں۔"

"چلو جیسا بھی ہے۔ دیکھیں بھلا کیسا ہے۔"

وہ آگے آگے چل پڑا۔ پیچھے پیچھے وہ افسر صاحبان۔ ملٹری پولیس والے۔ ان سب کے پیچھے پیچھے حنا ایک وقار اور تمکنت سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ جب کواٹر کے قریب پہنچے تو سپاہی گل شیر نے جیب میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"سر کمرے کی چابی کہیں گر گئی ہے۔"

"تالا توڑ دو۔"

"سر ایسی کیا اہم بات ہے کہ آپ میرے کمرے کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"خاموش رہو بحث مت کرو۔"

جنرل صاحب نے ملٹری پولیس کے حوالدار کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"حوالدار تم کھولو اسے۔"

"بہت اچھا۔"

اور اس نے ایک پتھر لے کر اسے دو تین چوٹیں لگائیں۔ تالا نیچے گر پڑا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ایک طرف کو اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

جنرل صاحب نے اندر جا کر کمرے میں چاروں طرف بڑے غور سے دیکھا۔ بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ ایک لوہے کے پائپ والی چارپائی پر بڑا صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک تپائی پر ایک ٹرانسسٹر ریڈیو پڑا تھا۔ جسے ایک خوبصورت سے پھولدار ریشمی کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ دیوار پر کچھ ننگی عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹین کا بکس پڑا ہوا تھا۔ بادی النظر میں جنرل صاحب کو وہ چوہوں کا پنجرہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ انہوں نے پیچھے پلٹ کر حنا سے پوچھا۔

"بیٹی یہاں تو کوئی چوہوں کا پنجرہ نہیں ہے۔"

"سر اس نے کہیں چھپا دیا ہو گا۔"

"کیوں جوان تمہارے پاس ادھر کوئی چوہوں کا پنجرہ ہے....؟"

"نہیں سر....!! میں نے چوہوں کو کیا کرنا ہے.....؟"

اسی اثنا میں میجر شاہ نے چارپائی کے نیچے جھک کر صندوق کے عقب میں جائزہ لیا۔ اسے کچھ چیز نظر آئی جسے بوری کے ایک بڑے ٹکڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اسے شک پڑ گیا۔ اس نے چارپائی کو کھینچ کر آگے کی طرف کر لیا اور پچھلی طرف جانے کی راہ بنا لی' میجر شاہ نے بوری کا ٹکڑا اٹھا لیا تو اس کے نیچے چوہوں سے بھرا ہوا ایک لوہے کا پنجرہ پڑا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر گل شیر کا رنگ فق ہو گیا۔

"جوان یہ پنجرہ اور چوہے کہاں سے آئے ہیں....؟"

جنرل صاحب نے طیش میں آتے ہوئے پوچھا۔

"سر۔ دراصل بات یہ ہے کہ میری اس کوٹھڑی میں بہت چوہے ہیں جو بہت نقصان کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ پنجرہ یہاں لا کر رکھا ہے اور اندر روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیا ہے۔ یہ خود بخود پھنستے گئے ہیں۔"

"تو تم کہتے ہو کہ میں نے چوہوں کا کیا کرنا ہے....؟"

"تم اور کرنل سعید مل کر ان چوہوں کو کسی غلط استعمال میں لاتے رہے ہو۔"

"نہیں سر ہرگز نہیں۔"

وہ واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ جنرل صاحب نے حنا سے پوچھا۔

"بیٹی آپ کے پاس یہاں کوٹھی میں اس اردلی کے علاوہ اور کتنے سرونٹ کام کرتے ہیں۔"

"سر ایک سویلین کک ہے۔ جو فل ٹائم کام کرتا ہے۔ ایک مالی پارٹ ٹائم کام کرتا ہے۔"

"کک اب کہاں ہے......؟"

"سر یہاں ہی رہتا ہے۔"

"یہ بھی کرنل سعید کے ساتھ ان مس ڈیڈز (MISDEEDS) میں شریک ہے۔"

"نہیں سر.... یہ شریف آدمی ہے اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا......؟"

"بابا محمد شفیع۔"

"جنرل صاحب نے ملٹری پولیس کے ایک آدمی کو کہا کہ پچھلی طرف واقع کچن سے بابا محمد شفیع کک کو بلا لاؤ۔"

"بہت اچھا سر۔"

اور پھر وہ جوان ایک بوڑھے سے آدمی کو بلا کر لے آیا جس کے سر کے سفید بال اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔"

بابا آپ کا نام کیا ہے.....؟" جنرل صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں اس

سے پوچھا۔

"سرکار میرا نام محمد شفیع ہے۔"

"کتنے عرصے سے کرنل صاحب کے پاس کام کرتے ہو.........؟"

"حضور دو سال سے۔"

"تنخواہ ٹھیک ٹھاک دیتے ہیں.......؟"

"ہاں حضور بس دے ہی دیتے ہیں۔"

"بخشش وغیرہ بھی کبھی دی ہے......؟"

"نہیں سرکار.....!!"

"اب بیگم صاحبہ آئی ہیں تو یہ دیتی ہیں۔ بڑی اچھی بی بی ہیں خدا ان کا بھلا کرے۔"

"بابا ان دونوں کا تو آپس میں بڑا پیار ہو گا۔"

"حضور شروع شروع میں تو تھا۔ لیکن کم ہوتے ہوتے اب تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔"

"کیوں بیگم صاحبہ سخت ہیں۔" یہ کرنل صاحب کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رکھتیں۔"

"نہیں سرکار.....!!! بیگم صاحب کو تو ان کی ماں نے بسم اللہ کر کے جایا ہے۔"

"بابا یہ آدمی کتنی دفعہ آپ کی موجودگی میں بیگم صاحبہ کے پاس آ کر مہمان ٹھہرا ہے۔ جنرل صاحب نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔"

"حضور ایک دفعہ بھی نہیں۔ میں اس آدمی کو آج پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔"

"بابا کرنل صاحب اور بیگم صاحبہ کھانا ہمیشہ اکٹھا ہی کھاتے ہیں۔"

"سرکار پہلے تو اکٹھے کھاتے تھے۔ اب تقریباً ایک ماہ سے بیگم صاحبہ بیمار ہیں تو یہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھاتی ہیں۔"

"آپ ان کو وہاں ان کے کمرے میں جا کر کھانا کھلاتے ہیں۔"

"نہیں سرکار۔ کبھی کرنل صاحب خود لے جاتے ہیں۔ کبھی اردلی لے جاتا ہے۔"

"آپ کیوں نہیں لے جاتے۔ یہ کام تو آپ کا ہے۔"

"سرکار آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ یہ کام میرا ہے لیکن کرنل صاحب نے مجھے کرنے ہی نہیں دیا۔"

"کیا وجہ ہے۔ کیوں کرنل صاحب نہیں کرنے دیتے۔"

"سرکار ان کی کوئی اپنی مصلحت ہو گی۔"

"بابا تمہارے کرنل صاحب نے یہاں کوئی چوہے بھی پالے ہوئے ہیں۔"

"سرکار مجھے پتہ نہیں ہے۔ البتہ میں نے ایک دو دفعہ اردلی گل شیر کو چوہوں سے بھرا ہوا ایک پنجرہ لاتے لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"بابا یہ کب کی بات ہو گی۔" ہو گی کوئی پانچ چھ ماہ پہلے کی۔"

"نہیں سرکار ان پچھلے دس بیس دنوں میں دیکھا ہے۔ پہلے کرنل صاحب کو اور نہ ہی گل شیر کو کوئی ایسا شوق تھا' یہ شوق تو اب انہیں پچھلے کچھ دنوں میں لگا ہے۔"

"اچھا بابا مہربانی آپ جائیں۔ کام کریں۔"

"حضور والا بہت شکریہ آپ کا۔" اور بابا محمد شفیع سلام کر کے واپس کچن کی طرف چلا گیا۔

پھر جنرل صاحب نے سپاہی گل شیر کو بلوایا۔ وہ آ کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ جنرل صاحب نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو جنرل صاحب نے جنرل محمود صاحب سے کہا۔

"سر یہ آپ کا آدمی ہے۔ آپ اس سے انویسٹی گیشن (INVESTIGATION) کریں۔"

"نہیں جناب آپ پوچھیں۔ آپ بڑے وکیلوں کے سے انداز میں باتیں پوچھتے ہیں۔ اس طرح سچی بات سامنے آ جاتی ہے۔"

"چلیں میں ہی پوچھ لیتا ہوں۔" جنرل حمید صاحب نے نیاز مندی کا اظہار

کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا جوان تمہارا نام کیا ہے......؟"

"سر میرا نام گل شیر ہے۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو....؟"

"سر میں ایبٹ آباد کا ہوں۔"

"کتنے عرصے سے کرنل سعید کے پاس ہو....؟"

"سر تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔"

"تم جب یہاں آئے ہو تو کرنل سعید اور ان کی بیگم کے علاوہ اور کون ان کے پاس رہتا تھا۔"

"سر میں آیا ہوں تو کرنل صاحب اکیلے تھے۔ شادی تو انہوں نے اب تقریباً چھ سات ماہ پہلے کی ہے۔"

"یہ بیگم صاحبہ تمہارے ہوتے ہوئے یہاں آئی ہیں۔"

"جی سر...!! میرے ہوتے ہوئے آئی ہیں۔"

"کیسی ہیں بیگم صاحبہ.....؟"

"بہت اچھی ہیں۔"

"کرنل صاحب کی عدم موجودگی میں کوئی اور آدمی ان کے پاس آتا ہے....؟"

"نہیں سر....!! کبھی کوئی نہیں آیا۔"

"اب یہ آدمی ادھر آیا ہے تو تمہارے کرنل صاحب نے اس کے متعلق تم سے اور دوسرے ان دو جوانوں سے کیا کہا ہے.....؟"

"سر یہ کہا ہے کہ یہ آدمی میری بیگم کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کو سبق سکھانا ہے۔"

"پھر تم لوگوں نے کیا کہا....؟"

"سر میں نے کچھ نہیں کہا۔ لانس نائک حسین علی اور سپاہی علی محمد نے کہا کہ سر ہم اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

اچھا جوان ہم خوش ہیں کہ تم نے اپنی غلطیوں کا احساس کر لیا ہے۔ اور اب سچی باتیں بتا کر ہم سے تعاون کیا ہے اس لئے ہم بھی کوشش کریں گے کہ تم پر کم سے کم الزام آئے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ باقی باتیں بھی سچ سچ بتا دو گے۔

"سر سب باتیں سچ بتاؤں گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کرنل سعید اور اس کی بیگم کے درمیان کس بات کا اختلاف تھا....؟"

سر اندرونی بات کا تو مجھے پتہ نہیں ہے۔ میرے سامنے ان کا اکثر جھگڑا اس بات پر ہوتا تھا کہ کرنل صاحب بیگم صاحبہ کو کہتے تھے کہ آپ کے پاس جتنے پیسے اور جواہرات بینک میں ہیں مجھے دے دو۔ اور وہ دیتی نہ تھیں۔ شروع شروع میں تو ان کا جھگڑا زبانی ہی ہوا کرتا لیکن آخر کار نوبت مار پیٹ تک آگئی اور کرنل صاحب بیگم صاحبہ کو بیدوں سے مارا کرتے۔ جب وہ کسی طرح بھی نہ مانیں تو پھر انہوں نے بیگم صاحبہ کو تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا ہے اور باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ کرنل صاحب خود ان کو ناشتہ اور کھانا لے جا کر دیتے۔ کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا تھا۔

سر بیگم صاحبہ نے ایک دن رو کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ مجھ سے کہنے لگی۔

"گل شیر خدا کے لئے میری مدد کرو۔ ورنہ میں اس قید تنہائی میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

"بیگم صاحبہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں....؟ میں تو آپ لوگوں کا اردلی ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے....؟"

"گل شیر خان اگر کوئی تمہاری بہن پر اس طرح کے مظالم ڈھائے تو تم انہیں برداشت کر لو گے۔"

ہر گز نہیں بیگم صاب۔ میں تو ظلم ڈھانے والے کا خون پی جاؤں گا۔"

"گل شیر خان کاش کوئی میرا بھی حقیقی بھائی ہوتا جو اس مشکل وقت میں میری مدد کو بھی آتا۔"

"بیگم صاب پورے پاکستان میں آپ کا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں جو اس

آڑے وقت میں آپ کی مدد کو آئے۔

گل شیر خان مجھے بھائیوں سے بھی زیادہ ایک آدمی عزیز ہے لیکن وہ لاہور میں ہے۔

"تو بیگم صاحبہ آپ اس کو بلوالیں۔"

"بھیا میں اس کوٹھڑی میں قید ہوں۔ اسے کس طرح اطلاع کر سکتی ہوں۔ تم کسی دن ٹیلی فون پر میری اس شخص سے بات کروا دو۔"

"بیگم صاحبہ آپ اس کو خط لکھ کر مطلع کر دیں۔"

گل شیر خان۔ یہاں کون میرا ہمدرد بیٹھا ہے کہ مجھے لفافہ لا دے گا۔ اور اگر لفافہ مل بھی گیا اور میں نے اسے خط لکھ بھی دیا تو اس خط کو ڈاک کے حوالے کون کرے گا۔ یہاں تو قدم قدم پر پہرے لگے ہوئے ہیں۔

"بیگم صاحبہ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام میں کروں گا۔"

"حضور والا....!! پھر بیگم صاحبہ نے احمد صاحب کو لاہور خط لکھا اور یہ آ گئے۔"

"اس وقت کرنل سعید کہاں تھا۔" جنرل صاحب نے پوچھا۔

"سر اپنی یونٹ میں تھے۔"

"پھر جب صوبیدر احمد صاحب ادھر پہنچ گئے تو تم ان کو اندر لے آئے اور بیگم صاحبہ سے ملا دیا۔"

"نہیں سر...!! میں نے فوراً کرنل صاحب کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ لاہور سے کوئی احمد صاحب آئے ہیں جو آپ کو اور بیگم صاحبہ کو ملنا چاہتے ہیں۔"

"پھر کرنل سعید نے تمہیں کیا کہا.....؟"

"سر انہوں نے کہا کہ اس آدمی کو ابھی باہر ہی بٹھاؤ۔ بیگم صاحبہ سے مت ملنے دینا۔ میں فوراً آ رہا ہوں۔"

"اس وقت تک وہ آدمی کہاں تھا۔"

"سر مین گیٹ کے باہر پلی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس کے مجبور کرنے پر میں نے

اسے کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں لے جاکر بٹھا دیا۔ اتنے میں کرنل صاحب صوبیدار میجر صاحب کو اور آٹھ دس سپاہیوں کو لے کر کوٹھی پر پہنچ گئے۔"

"کرنل سعید اتنے آدمیوں کو اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔"

"احمد صاحب کو پکڑ کر ان کی مار کٹائی کرنے کے لئے۔"

"پھر انہوں نے اس کی مار کٹائی کی۔"

"سر کرنل صاحب کے اشارے پر میں نے احمد صاحب کو اندر ڈرائنگ روم میں پہلے ہی بٹھا دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کرنل صاحب نے مجھے کہا۔"

"گل شیر مین گیٹ کو اندر سے تالا لگا دو اور تم وہاں گیٹ کے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھو۔ پھر جن آدمیوں کو وہ یونٹ سے ساتھ لائے تھے کچھ دیر کے لئے آہستہ آہستہ ان سے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت تک احمد صاحب اس سازش سے بے نیاز ڈرائنگ روم کے اندر بیٹھے تھے۔ کرنل صاحب ان دونو آدمیوں کو لے کر اندر چلے گئے اور پھر اندر سے گیلری کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔"

"اس وقت صوبیدار میجر صاحب اور باقی سپاہی کہاں تھے...؟" جنرل صاحب نے سپاہی گل شیر سے پوچھا۔

"سر وہ گیٹ کے ساتھ پک اپ میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ صوبیدار میجر صاحب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ تھی وہ فرنٹ سیٹ پر جاکر لیٹ گئے تھے۔"

"اچھا تو کرنل سعید دو آدمیوں کو لے کر اندر چلا گیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔" جنرل صاحب نے سلسلہ جارے رکھنے کے لئے کہا۔

"سر اس کے بعد ہمیں کچھ خبر نہیں۔ میں بھی وہاں اپنے ان ساتھیوں کی گپ شپ میں شامل ہو گیا۔ کافی وقت گزر گیا حتیٰ کہ آپ سب حضرات بمع ملٹری پولیس والوں کے یہاں پہنچ گئے۔ اور پھر اس سے آگے کا مکمل احوال آپ کو اچھی طرح پتہ ہے۔"

"اچھا گل شیر خان ایک آخری بات بتاؤ۔"

"جی سرکار۔"

"حنا صاحبہ کی شلوار میں چوہے چھوڑنا کس کی سکیم تھی۔"

"سر! یہ بات کرنل صاحب ہی کو سوجھی تھی۔"

"اس خاتون کی شلوار کون کھولتا تھا۔"

"سرکار عام طور پر کرنل صاحب کھولتے تھے۔ میں ہاتھ پر دستانے چڑھا کر چوہے پکڑ پکڑ کر ان کی شلوار میں چھوڑتا تھا۔ پھر کرنل صاحب ہی شلوار کو بند کرتے تھے۔ اندر جب چوہے گھبرا کر دوڑتے اور کاٹتے تو بیگم صاب تکلیف سے نڈھال ہو کر کراہنے لگ جاتی تھیں۔ اس وقت کرنل صاحب اونچے اونچے قہقہے لگاتے اور بیگم صاب کو کہتے ۔ جب تک تو میری بات نہیں مانے گی اس سے زیادہ تکلیفیں میں تجھے پہنچاؤں گا۔"

"تم نے کبھی بیگم صاحبہ کو اپنے ساتھ جنسی مراسم بڑھانے کے لئے بھی ترغیب دی ہے۔"

"جی سر....!! کرنل صاحب کے کہنے پر دی ہے۔ پہلے تو میں نے انکار کر دیا لیکن پھر مجھے کرنل صاحب نے کہا یہ کون سی پاک صاف ہے۔ اب تک کئی مردوں کے بستروں کی زینت بن چکی ہے۔ اسی طرح تو اس نے اتنی رقم اکٹھی کی ہے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ میں اس سے یہ پیسے اور جواہرات لے کر اس کو کک (KICK) لگا کر نکال دوں گا۔ تاکہ یہ پھر چکلے میں جا بیٹھے۔"

"آپ کے کرنل صاحب اس خاتون کو چکلے سے اٹھا کر لائے تھے۔"

"سر مجھے پتہ نہیں ہے کہ کیسے اور کہاں سے لائے۔"

"شروع شروع میں ان کے تعلقات آپس میں اچھے تھے۔"

"شروع میں تقریباً پندرہ بیس دن ٹھیک تھے۔ پھر کرنل صاحب کا رویہ سخت ہوتا گیا۔"

"یہ دونو نماز روزہ کے بھی پابند تھے۔"

"نہیں سر۔ میں نے اس عرصے میں ان کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔"

"بیگم صاحبہ کے پاس کوئی غیر مرد کرنل صاحب کی عدم موجودگی میں آیا کرتا ہے۔"

"نہیں سر....!!"

"کرنل صاحب۔ کبھی اپنے ساتھ کوئی لڑکی وغیرہ لائے ہوں۔"

"سر ہفتے دس دن میں اپنے ہسپتال کی کسی نہ کسی نرس کو ساتھ لے آتے ہیں۔"

"ایسی آنے والی عورتیں کتنی دیر ان کے پاس ٹھہرتیں۔"

"پوری رات ٹھہرتی ہیں۔ صبح سویرے ریوالی (REVEILLE) کے وقت یہ اپنی کار پر ان کو میس میں چھوڑ آتے تھے۔"

"اچھا یہی بیانات آپ آگے چل کر دیں۔"

"بہتر سر۔"

"اچھا اب آپ جائیں۔ اب آپ کو کلوزاریسٹ نہیں کرتے۔ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے امید ہے آگے بھی تعاون کریں گے۔"

"سر انشاء اللہ تعالیٰ۔ ہر ممکن تعاون کروں گا۔" اور پھر وہ سیلوٹ کر کے اپنے کواٹر کی طرف واپس چلا گیا۔

جنرل حمید صاحب نے حنا سے پوچھا۔

"بیٹی آپ کے ساتھ جو یہ غیر انسانی ظلم روا رکھتے تھے۔ تو ظاہر ہے چوہوں نے آپ کو کاٹا ہو گا۔ پنجوں سے زخمی کیا ہو گا۔ اگر ایسی صورت حال ہے تو میں چاہتا ہوں کہ میڈیکل کروالیں اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ان سے حاصل کر لیں۔"

"ہاں سر ڈاکٹری تو بہت ضروری ہے۔ مجھے کافی انجریز (INJURIES) ہیں۔"

"اچھا بیٹی میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

"محمود صاحب آپ از راہ کرم حنا کو ہسپتال لے جائیں اور کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے ان کا ملاحظہ کروا لائیے۔ دوسری میری گزارش ہے کہ ان کے کیس کا فیصلہ ہونے تک آپ حنا صاحبہ کو نرسنگ آفیسرز ہوسٹل میں اکاموڈیشن کروا دیں۔ ان کو ایک الگ کمرہ رہنے کے لئے لے کے دیں۔ ان کے کھانے وغیرہ کا بھی ادھر ہی انتظام کر دیں۔ یہ سب پے منٹ میں کروں گا۔"

"نہیں سر آپ کیوں کریں گے۔ جبکہ میرے پاس پیسے ہیں مجھے بلوں کی ادائیگی کی کوئی دقت نہیں ہو گی۔ حنا نے بڑے ہی مودبانہ انداز میں کہا۔"

جنرل محمود صاحب حنا کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال ڈاکٹری کے لئے لے گئے۔

جنرل حمید صاحب نے برگیڈیئر رضوی صاحب سے کہا کہ "ابھی آپ میرے سٹاف آفیسر کو ٹیلی فون کریں کہ وہ کرنل رضوان اور کیپٹن طارق کو یہاں بھیج دیں۔ یہ دونوں اس کیس کی سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کریں گے۔ کل صبح میرے دفتر میں یہ سمری آف ایوی ڈینس مجھے دیں گے۔ میجر شاہ کو کہیں کہ وہ ان سب گواہان کو ابھی سے وارن کر دیں۔ شاہ صاحب اپنے سینئر J.C.O صاحب کے ذمہ یہ کام لگائیں کہ وہ یہ رات اس کام میں صرف کریں۔"

"کرنل سعید کے ڈرائنگ روم کو استعمال کریں۔ یہاں گواہوں کی حاضری میں سہولت ہو گی۔"

"سر اس کیس میں ملزم کون کون سے لوگ ہوں گے۔"

"حضور آپ پرووسٹ مارشل ہیں مجھ سے پوچھتے ہیں۔"

"نہیں سر آپ کی طرف سے ذرا وضاحت ہو جائے گی تو مزید کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔"

"لیفٹیننٹ کرنل سعید' لانس نائیک حسن علی۔ سپاہی علی محمد۔ سپاہی گل شیر۔ کرنل سعید اپنے ساتھ جن آدمیوں کو یونٹ سے لایا تھا۔ وہ سب کے سب ماسوائے صوبیدار میجر فتح علی خان کے۔"

"گواہان کے طور پر زاہدہ حنا' صوبیدار احمد' کک محمد شفیع' صوبیدار میجر فتح علی خان' سپاہی گل شیر کو بھی بطور گواہ گزارنا ہے۔"

"لیڈی ڈاکٹر صاحبہ جو حنا کا اب ڈاکٹری معائنہ کریں گی۔ ان لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کو کل صبح ایگزامن کر لینا۔ ان کو اب نہ بلانا۔"

"میں بھی رات کو دس بجے کے لگ بھگ چکر لگاؤں گا۔"

"بہتر سر....!!"

بر گیڈیئر رضوی صاحب نے A G صاحب کے سٹاف آفیسر کو اسی وقت ٹیلی فون کر دیا۔ ابھی جنرل صاحب موقعہ پر موجود تھے کہ کرنل رضوان اور کیپٹن طارق آ گئے۔ جنرل صاحب نے ان کو اچھی طرح سے بریف کیا۔ انہوں نے میجر شاہ کو کہا کہ اب سے ایک گھنٹہ بعد ہم واپس آ کر یہ کام شروع کر دیں گے۔ آپ مین گواہان کو موجود رکھیں۔ ساتھ ہی کرنل سعید کو بھی بمع ان کے اسکورٹ کے آپ یہاں ہی بلوا لیں۔ حنا جونہی ہسپتال سے فارغ ہوں ان کو بھی یہاں بلوا لیں۔

"سر ان لوگوں کے رات کے کھانے کا کیا انتظام ہو گا.....؟"

"پہلے یہ لوگ کہاں سے کھاتے ہیں......؟"

"سپاہی اپنے لنگر سے اور آفیسرز اپنے اپنے گھروں یا متعلقہ میسوں سے۔"

"اب بھی وہ اپنا کھانا پہلے کی طرح وہاں ہی سے منگوالیں گے۔ آپ (TIE UP) کر لیں۔"

"اچھا سر..........!!!"

ابھی تک جنرل حمید صاحب اور دوسرے سب متعلقہ آدمی یہاں موجود تھے کہ جنرل محمود صاحب زاہدہ حنا کی ڈاکٹری کروا کر اسے واپس لے آئے۔ انہوں نے ڈاکٹری رپورٹ جنرل حمید کی طرف بڑھا دی۔ جنرل صاحب نے رپورٹ کو ایک نظر دیکھا اور غصے سے ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ جنرل محمود سے کہنے لگے۔

"جنرل صاحب ایسے لوگ انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہیں۔ انہیں کیفر کردار تک پہنچانا چاہئے۔"

ہاں جنرل صاحب.....!! کتنی شرم کی بات ہے۔ اتنا بڑا افسر ہو کر بھی اس نے یہ کتنی ذلیل حرکت کی۔"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ سر۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ یقین کر لیں کہ کوئی بھی آدمی اس کی بیجا مدد کر کے اسے چھڑوا نہ لے۔"

"نہیں سر۔ انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔"

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

کرنل رضوان نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"سب لوگ سن لیں۔ اب شام کے تین بجنے والے ہیں۔ ٹھیک چار بجے شام میں اور کیپٹن طارق صاحب سمری آف ایوی ڈینس ریکارڈ کرنا شروع کر دیں گے۔ سب لوگ پونے چار بجے یہاں موجود ہوں۔ اپنے اپنے رات کے کھانے کا بندوبست کر کے آئیں۔ جب تک یہ کام ختم نہ ہو گا۔ کورٹ اپنی کاروائی جاری رکھے گا۔ M.P کے آفیسر انچارج مہربانی سے کرنل سعید اور دوسرے ملزمان کی حاضری مقررہ وقت پر یقینی بنائیں گے۔ شکریہ۔"

جنرل حمید نے احمد صاحب کو بلا کر ان کے کمانڈونگ آفیسر کا نام پوچھا۔ اور پھر اس وقت لاہور ان کی رہائش گاہ پر ٹیلی فون کر کے ان سے بات کی۔

"آپ لاہور سے کرنل چودھری بول رہے ہیں۔"

"جی....!!"

"کرنل صاحب میں پنڈی سے ایڈجوٹینٹ جنرل بول رہا ہوں۔"

"اسلام علیکم سر......!! حکم سر....!!!"

"چودہری صاحب بات یہ ہے کہ یہاں پنڈی میں ایک آفیسر اور ان کی بیوی کا ایک کیس ہو گیا ہے آپ کی یونٹ کے صوبیدار احمد صاحب اس کیس میں ایک نہایت ہی اہم گواہ ہیں۔ میں نے ان کو یہاں روک لیا ہے۔ جب تک اس کیس کا فیصلہ

نہیں ہوتا یہ یہاں ہی رہیں گے۔ انہیں میں آج سے سگنل ڈائریکٹوریٹ کے ساتھ اٹیچ کر رہا ہوں۔ بریگیڈیئر زمان صاحب سے بھی ابھی بات کرتا ہوں سب سے پہلے آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ تاکہ آپ ان کی غیر حاضری سے پریشان نہ ہوں۔"

"سر......!! بہت شکریہ آپ کا۔"

"اچھا خدا حافظ۔" اور پھر جنرل صاحب نے ڈائریکٹر آف سگنیل سے کہہ کر احمد صاحب کو پنڈی اٹیچ کروالیا۔

پونے چار بجے سب لوگ کرنل سعید کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کرنل رضوان اور کیپٹن طارق ایک کار میں آئے وہ اپنے دفتر کے دو کلرک بمع ٹائپ رائٹرز اپنے ساتھ لائے۔ کرنل سعید کا سب کو انتظار تھا۔ وہ ابھی نہ پہنچا تھا۔ کرنل رضوان نے A.M.C کے میس میں ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

کرنل رضوان نے ڈرائنگ روم ہی میں دفتر جما لیا۔ کورٹ آرڈرلی نے آکر بتایا کہ کرنل سعید صاحب بھی آگئے ہیں۔ کورٹ نے کرنل سعید اور زاہدہ حنا کو اندر بلا لیا۔ کرنل سعید نے حنا کو وش کیا لیکن اس نے منہ دوسری طرف پھیر کر اس کو اگنور کر دیا۔

سب سے پہلے کورٹ نے کرنل سعید کے بیانات قلمبند کیے۔

SUMMARY OF EVIDENCE

بیان نمبر......... لیفٹیننٹ کرنل سعید احمد اے۔ ایم۔ سی۔

"آج سے چھ ماہ قبل میری شادی زاہدہ حنا سے ہوئی تھی' حنا کو میں آج سے چار پانچ سال پہلے سے جانتا تھا۔ یہ اکھنڈ بھارت کے ایک بڑے ہندو راجہ کی مہارانی تھی۔ پھر برصغیر تقسیم ہو گیا۔ میں اس وقت انڈین میڈیکل کور میں میجر ڈاکٹر تھا۔ میں نے

پاکستان کے لئے اپنی آپشن (OPTION) دی اور اس طرح پاکستان آ گیا۔ میں میجر تھا اور کراچی میں مقیم تھا۔ کہ ایک دن میں کلفٹن گیا اور وہاں اچانک زاہدہ حنا سے ملاقات ہو گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہاں ایک بڑے مہاراجہ کی مہارانی اور کہاں کراچی کی ایک عام سی سیرگاہ جہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ مہارانی صاحبہ ایک عام عورت کی طرح وہاں پھر رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ میں بمبئی ماں کو لینے آئی تھی کہ ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ اس وقت میری ماں بازار شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ وہ شام تک لوٹ کر نہ آئیں یہ تین چار روز تک اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں لیکن وہ نہ آئیں۔ اسی دوران میں فسادات اور زیادہ علاقوں تک پھیل گئے۔ بقول ان کے یہ ان حالات سے ڈر کر پاکستان آ گئیں۔ جس روز ان کی میرے ساتھ ملاقات ہوئی تھی یہ اس روز بے حد پریشان تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میرے پاس تو سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ انہوں نے مجھ سے Request کی کہ اس مشکل وقت میں ان کی مدد کروں۔ میں ان کو اپنے ساتھ اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ پھر یہ میرے ساتھ وہاں رہتی رہیں۔ اس دوران میں نے ان کو شادی کی آفر دی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی اس عرصے میں میرا پروموشن (Promotion) ہو گیا اور میں لیفٹیننٹ کرنل بن گیا اور میرا پوسٹنگ کراچی سے جہلم ہو گیا۔ میرے پوسٹنگ پر یہ رونے لگ گئیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم کیوں روتی ہو تو کہنے لگی میں جوان بے آسرا لڑکی ہوں۔ اب میرا کیا بنے گا۔ آپ کے پاس تو مجھے شیلٹر ملا ہوا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں گی۔ یہاں تو جنس زدہ لوگ قدم قدم پر میری آبرو ریزی کریں گے۔ اور جب ان کو یہ پتہ چل جائے گا کہ میں جنسی حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں تو ان میں سے سب سے طاقتور کتا مجھے ہانک کر اپنے گھر لے جائے گا اور پھر میری زندگی برتن مانجھتے مانجھتے گزر جائے گی۔"

"میں نے ان سے کہا تم فکر نہ کرو اگر میرے ساتھ جہلم آنا چاہو تو چلی آؤ۔ جو دال روٹی میں کھاؤں گا تم بھی کھاتی رہنا۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئی اور میرے ساتھ جہلم آ گئی۔ میں اس سے اتنا اچھا سلوک کرتا تھا کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ میری بیگم ہیں۔ جہلم پہنچ کر کچھ عرصے کے بعد ہماری بدقسمتی کے دن شروع ہو گئے۔ میں تو صبح ناشتہ

کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ یہ پیچھے اکیلی ہوتی تھی۔ اچھا کھاتی پیتی تھی۔ زندگی کی ساری سہولتیں اسے میسر تھی۔ بنگلہ نوکر چاکر' کار' خرچ کرنے کے لئے کھلے پیسے۔ جہلم آ کر کچھ عرصے کے بعد اس نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے"۔

"مجھے میرے نوکر اور اردلی بتایا کرتے تھے کہ ایک فوجی جواں سال صوبیدار بیگم صاحبہ کے پاس اکثر آتا ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے ان کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ یہ اکثر کمرہ اندر سے بولٹ کر لیتے ہیں۔ باہر یہ احساس ہوتا کہ اندر کوئی دھینگا مشتی کر رہا ہے۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد کامل سکوت چھا جاتا ہے۔"

"جب میری واپسی کا وقت ہوتا تو اس سے تھوڑا پہلے وہ صوبیدار صاحب بہادر جھک مارنے کے بعد فارغ ہو کر اپنی راہ لیتے اور میں آتا تو حنا مجھ سے بناوٹی محبت کا بے پناہ اظہار کرتی۔ لیکن نہ تو یہ میرے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوتی اور نہ ہی مجھے جنسی آسودگی بہم پہنچاتی۔ نوکروں کے روز روز کے بتانے پر میں نے اس کی سرزنش کی تو یہ بالکل مکر گئی۔ اور گھنٹوں منہ چھپائے بیٹھی روتی رہی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب اسے سختی سے منع کروں گا۔ اس نے میرے اس رویئے کا اندازہ لگا کر اب اس گھر کو خیر باد کہنے کی ٹھانی۔ ایک دن میں ڈیوٹی سے واپس آیا تو نوکروں نے بتایا کہ بیگم صاحبہ پنڈی چلی گئی ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا میں نے اپنا سامان فوراً چیک کرنا شروع کر دیا۔ جب برصغیر کی تقسیم کے وقت میں ہندوستان سے پاکستان آ رہا تھا تو میرا اٹیچی کیس راستے میں کسی کے ساتھ تبدیل ہو گیا تھا۔ دونوں ایک ہی طرح اور ایک ہی شکل کے اٹیچی کیس تھے۔ میں نے کراچی پہنچ کر اپنے بنگلے پر جب اسے کھولا تو مجھے اپنی نظروں پر یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ اس اٹیچی کیس میں ہیرے' جواہرات اور سونا ہی سونا تھا۔ اوپر صرف ایک تہہ شدہ چادر تھی۔ جب میں نے چادر ہٹائی تو نیچے وہ ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ یہ جیولری میں نے ڈر کے مارے کہیں نہیں بیچی اور نہ ہی کہیں لاکرز میں رکھی۔ آج وہ سب سونا' ہیرے' اور جواہرات غائب تھے۔ اس دوران مس حنا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس اٹیچی کیس میں کیا ہے اسے چابیوں کا بھی پتہ تھا۔ چنانچہ وہ یہ سب جیولری نکال کر کہیں غائب ہو گئی۔"

"مجھے میرے ایک پرانے کولیگ نے جو ابھی تک کراچی کی اس یونٹ میں

تھا۔ ایک دن ٹیلی فون پر بتایا کہ کل ایلفی میں آپ کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی ہے۔ بالکل ٹھیک ہیں۔ ابھی انڈیا نہیں گئیں۔ شاید کل تک چلی جائیں گی۔"

"میں نے دوسرے دن میجر شاہد کو کہا کہ مجھے میری بیگم کے متعلق تازہ حالات سے آگاہ کریں۔ انہوں نے وعدہ کیا لیکن پھر کئی روز تک اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کافی دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ محترمہ بمبئ چلی گئی ہیں۔ خس کم جہاں پاک کے مصداق میں نے سوچا۔ میری اتنی جیولری تو لے گئی ہے۔ لیکن اب ان حالات میں یہ پاکستان واپس نہ آئیں گی۔ اور میں اس کے خطرناک عزائم سے محفوظ رہوں گا۔"

"کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ایک دن احمد صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا اور یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ حنا بمبئ سے مستقل طور پر پاکستان آ گئی ہے۔ اب وہ یہاں سیٹل ہونا چاہتی ہے۔ مجھے اس نے لاہور ٹیلیفون کر کے یہاں بلایا ہے۔ مجھے آج رات کہا ہے کہ میں پتہ کروں کہ آپ ابھی تک جہلم ہی ہیں یا کہیں تبدیل ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ میں اسی جگہ پر ہوں اگر وہ آنا چاہے تو آ جائے۔ چنانچہ وہ کراچی سے احمد صاحب کے ساتھ لاہور آ گئی اور کافی دن فلیٹیز میں یہ دونوں رنگ رلیاں مناتے رہے۔ ہوٹل کا سب خرچ حنا ہی برداشت کرتی رہی تھی۔ صوبیدار بیچارے کے پاس کیا تھا۔ ان دونوں نے مجھے مجبور کیا تو میں حنا سے ملنے لاہور آیا۔ اب یہ پہلے والی حنا نہ تھی کبھی لاہور کے اتنے بڑے ہوٹل میں قیام اور کبھی تاج محل کراچی میں جو صرف راجوں' نوابوں کا کام ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ وہی جیولری ہے جو بیچ بیچ کر یہ محترمہ خود بھی کھا رہی ہے اور اپنے نام نہاد مجنوں کو بھی کھلا رہی ہے۔ صوبیدار بہادر کی مہینے بھر کی تنخواہ سے تو فلیٹیز میں چار آدمی ایک وقت بیٹھ کر چائے بھی نہیں پی سکتے۔"

"حنا نے مجھ سے چکنی چپڑی باتیں کیں اور مجھے احمد کی موجودگی میں ایمبریس کیا۔ اور پھر میری گود میں سر رکھ کر روتی رہی۔ مرد کے لئے یہ مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ چنانچہ میں بھی پھسل گیا اور حنا کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے روتے روتے میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر میری آنکھوں میں اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں ڈال کر کہا۔ سعید صاحب میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں نے اپنا بھی اور آپ کا بھی وقت ضائع کیا ہے۔ آج سے دو سال پہلے ہمیں آپس میں شادی کر لینی چاہیے تھی۔ چلئے

چھوڑیئے دیر آید درست آید۔ اب مجھے آپ اپنی غلامی میں قبول کر لیجئے۔ اور جناب والا...!! میں اس مشاق عورت کی باتوں میں آگیا اور اس نے اس طرح سے مجھے ٹریپ کر لیا۔ میں اپنی جگہ پر خوش تھا کہ مجھے ایک خوبصورت اور جوان عورت مل گئی ہے۔ جو اب وہ تمام جیولری جو میرے گھر سے چرا کر لے گئی تھی واپس لے آئے گی۔ وہ شاید خوش تھی کہ اسے پاکستان میں مستقل ایک سہارا مل گیا ہے اور اس کی شادی ایک ایسے آدمی کے ساتھ ہو رہی ہے جس کے اچھے خاصے سوشل سٹیٹس ہیں۔ اور شاید صوبیدار صاحب اس لئے خوش تھے کہ ان کی اس بلائے بے درماں سے جان چھوٹ رہی ہے۔"

"چنانچہ ہفتے دس دن کے بعد اس صوبیدار کی معرفت میری حنا سے شادی ہو گئی۔ یہ محترمہ شروع میں تو ایک آدھ مہینہ ٹھیک رہیں لیکن آخر کار انہوں نے احمد صاحب سے پھر نامہ و پیام شروع کر دیا۔ مجھے میرے نوکر اور اردلی نے بتایا کہ ایک فوجی صوبیدار میرے چلے جانے کے بعد گھنٹوں حنا کے پاس تنہائی میں رہتا ہے۔ میرے واپس آنے سے تھوڑی دیر پہلے نکل کر چلا جاتا ہے اس طرح یہ میرے قابو نہ آتا۔ آخر کار کل یہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں اسے پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے سب صورت حال کو بھانپ لیا اور مجھے ڈرائنگ روم میں بند کر کے باہر سے بولٹ لگا دیا۔ اور بھاگ کر کوٹھی کی پچھلی طرف سے نکل گیا۔"

"حنا اس ساری صورت حال سے پریشان ہو کر بھاگ کر ساتھ کی کوٹھی جس میں بریگیڈیئر فہیم رضوی صاحب رہتے ہیں وہاں چلی گئی۔ اور وہاں جا کر رضوی صاحب کے سامنے من گھڑت کہانی بنا کر یہ سارا مناقشہ کھڑا کر دیا۔ حالانکہ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان دونوں نے مل کر مجھے مفت میں اس جھوٹے کیس میں ملوث کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ حنا نے صوبیدار احمد کے ایماء پر کیا ہے۔ ورنہ یہ تو آج تک میرے ساتھ گزر بسر کر رہی تھی۔"

"بس سر میرا بیان ختم ہے۔" کرنل سعید نے کورٹ کے پریذیڈنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"زاہدہ حنا آپ کرنل سعید صاحب سے کچھ پوچھنا چاہیں گی۔"

"اگر آپ کی اجازت ہو تو ضرور پوچھوں گی۔"

"جی ہاں ضرور پوچھئے۔"

"محترم کرنل صاحب یہ بتایئے کہ انڈیا میں سب سے پہلے میرے ساتھ آپ کی کب ملاقات ہوئی تھی۔"

"جب آپ مہاراجہ ------ کے حرم میں مہارانی بن کر آئی تھیں۔"

"آپ وہاں کیسے آئے تھے۔"

"میرے والد مہاراج کے پاس ڈاکٹر تھے۔ میں ان کو ملنے گیا تھا۔"

"آپ اپنے والد صاحب کو اکثر ملنے جایا کرتے تھے۔"

"جی ہاں سال میں دو تین دفعہ ضرور جاتا تھا۔"

"کیا دو تین ملاقاتوں کے بعد آپ نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ مہاراجہ ہندو ہے اور آپ مسلمان ہیں۔ آپ اس سے گلو خلاصی کروالیں۔"

"جی کہا تھا۔"

"جس وقت آپ سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی ۔ تو آپ کے خیال میں اس وقت میری کتنی عمر ہو گی۔"

"ہو گی۔ بیس بائیس سال کے لگ بھگ۔"

"جس دن کراچی میں آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ میرے ساتھ میرے ہوٹل میں آئے تھے۔"

"جی آیا تھا۔"

"یہ کوئی اونچا ہوٹل تھا۔"

"نہیں درمیانہ سا تھا۔"

"پھر اس ہوٹل میں آپ دوسری بار بھی آئے تھے کہ مجھے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر سکیں۔"

"آیا تھا۔ لیکن اس غرض سے نہیں آیا تھا۔"

"پھر جب میں آپ کے ساتھ جہلم آگئی تو کس حیثیت سے آئی تھی۔"

"ایک دوست کی حیثیت سے۔"

"اس عرصے میں کبھی آپکے میرے ساتھ جنسی تعلقات رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔"

"آپ نے مجھے شادی کی آفر دی۔ میں نے انکار کیا۔ انکار کی وجہ کیا بتائی تھی۔"

"آپ یہ کہتی تھیں کہ مہاراجہ نے مجھے اس بری طرح استعمال کیا ہے کہ میری اندر کی عورت ہی مرگئی ہے اور میں ایک مستقل نفسیاتی مریضہ بن گئی ہوں۔"

"اچھا آپ یہ بتائیں جہلم میں کوٹھی کس نے کرائے پر لی۔ اس کا کرایہ کون دیتا تھا۔ کار کس نے خریدی تھی۔ اور کوٹھی کے ملازمین کو تنخواکون دیتا تھا۔"

کوٹھی میں نے لی تھی۔ کرایہ میں دیتا تھا۔ نوکروں کو تنخواہیں بھی میں ہی دیتا تھا۔ کار میں نے خریدی تھی لیکن آپ نے ضد کی تھی کہ یہ میرے نام کر دو چنانچہ وہ میں نے آپ کے نام کر دی۔"

"ان دنوں آپ کی کتنی تنخواہ تھی....؟"

"ہو گی کوئی ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ"

"آپ بینک میں ماہ بماہ کتنے پیسے جمع کروایا کرتے تھے۔"

"جو بچ جاتے تھے۔"

"میں جب آپ کے پاس قیام پذیر تھی تو اچانک بیمار ہو گئی۔ آپ دوائیاں لے کر آئے۔ آپ نے مجھے انجکشن لگایا جس سے میں بے ہوش ہو گئی اور پھر اس دوران میں آپ نے مجھے ریپ کیا۔ جس کا اقرار آپ نے جنرل صاحب کے سامنے بھی کیا تھا۔"

"نہیں یہ سب کچھ غلط ہے۔"

"آپ کو پتہ ہے میں نے صوبیدار احمد صاحب کو بار ہا شادی کرنے کے لئے مجبور کیا لیکن انہوں نے ہر بار یہی کہا کہ میری گھریلو مجبوریاں ہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں میری بیوی ہے۔ دو بچے ہیں۔"

"یہ درست ہے۔"

"میں جب آپ کے پاس رہتی تھی تو آپ اپنے ذاتی خرچ کے لئے مجھ سے پیسے لیتے تھے۔"

"نہیں یہ غلط ہے۔"

"آپ کے ساتھ فلیٹیز لاہور میں میری جو شادی ہوئی تھی۔ اس میں میری طرف سے کون وکیل تھا۔"

"احمد صاحب تھے۔"

"انہوں نے اپنے ہاتھ سے مجھے رخصت کیا تھا۔ اور سب براتیوں کی موجودگی میں میرے ماتھے پر بوسہ دے کر مسز بخاری کے ساتھ مجھے آپ کے ساتھ کار میں بٹھایا تھا۔"

"یہ درست ہے۔"

"پھر پنڈی آ کر تقریباً ایک ماہ کے بعد آپ نے جیولری اور سب رقم کا مطالبہ شروع کر دیا۔ کہ میں یہ سب کچھ آپ کے حوالے کر دوں۔"

"نہیں یہ غلط ہے۔"

"میں جب اس پر بھی نہ مانی تو آپ نے اب سے تقریباً ایک ماہ پہلے چھوٹے سے کمرے میں مجھے بند کر دیا اور تالا لگا کر ڈیوٹی پر جاتے تھے۔ صبح شام کبھی خود اور کبھی اردلی گل شیر مجھے اس کمرے میں کھانا لا کر دیتا۔"

"نہیں یہ غلط ہے۔"

"اس پر بھی جب آپ کامیاب نہ ہوئے تو آپ نے ایک نہایت ہی انسانیت سوز رویہ اختیار کیا۔ آپ اور اردلی گل شیر نے مل کر ایک چوہوں سے بھرا پنجرہ کہیں سے حاصل کیا۔ آخری حربے کے طور پر آپ دونوں میرے ہاتھ میری پیٹھ پیچھے باندھ کر اور میری شلوار کو ٹخنوں کے پاس سے مضبوطی سے باندھ دیتے۔ پھر میری شلوار کھول کر گل شیر آپ کے حکم پر پنجرے سے چوہے پکڑ پکڑ کر میری شلوار میں ڈالتا جاتا۔"

"چوہے اندر جا کر دوڑ دھوپ کرتے۔ اور گھبرا کر مجھے کاٹتے اور پنجے مار مار کر زخمی کر دیتے۔ اس وقت آپ دونوں اونچے اونچے لمبے اور بے ہنگم قہقہے لگاتے اور میری بے بسی پر خوش ہوتے۔"

"نہیں یہ بالکل غلط ہے اور سرا سر بہتان ہے۔"

"کیا آپ نے کوئی چوہوں سے بھرا ہوا پنجرہ گل شیر کے کمرے میں چھپا کر

نہیں رکھا ہوا تھا۔"

"نہیں یہ غلط ہے میں نے چوہوں کو کیا کرنا تھا۔"

"بس سر مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ حنا نے پریذیڈنٹ صاحب کو کہا۔"

"اچھا شکریہ آپ کا۔"

پھر کورٹ نے سپاہی گل شیر کو بلایا۔ آج اس نے بھی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے سیلوٹ کیا اور سامنے بیٹھ گیا۔

بیان نمبر......... سپاہی گل شیر اے۔ ایم۔ سی۔

"جناب عالی....!!! میں تقریباً عرصہ دو سال سے لیفٹیننٹ کرنل سعید احمد صاحب کا اردلی ہوں اور ان کی کوٹھی پر اس وقت سے رہائش پذیر ہوں شروع میں جب کرنل صاحب یہاں آئے تو یہ سنگل تھے۔ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے انہوں نے محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ کے ساتھ شادی کی۔ برات لاہور فلیٹیز ہوٹل میں گئی تھی۔ یہاں سے تقریباً پندرہ باراتی گئے تھے جن میں کرنل بخاری صاحب کی بیگم صاحبہ بھی تھیں۔ میں بھی برات کے ساتھ تھا۔ برات نے دوپہر کا کھانا اس ہوٹل میں کھایا۔ لڑکی والوں کی طرف سے احمد صاحب تھے یا پھر فلیٹیز ہوٹل والے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہاں ہی رسم نکاح ادا ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے حنا صاحبہ کی طرف سے "ولی" احمد صاحب تھے۔ انہوں نے ہی لڑکی کے وارث / وکیل / ولی کے طور پر نکاح نامہ پر دستخط کئے تھے۔ چائے پی کر ہم لوگ پھر پنڈی کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

ایک ماہ تک تقریباً میاں بیوی کا برتاؤ ایک دوسرے سے ٹھیک رہا۔ ایک ماہ کے بعد ان کا آپ میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ کرنل صاحب بیگم صاحب کو کہتے تھے کہ تمہارے پاس زر و جواہرات اور پیسے بہت ہیں۔ یہ سب تم میرے حوالے کرو تا کہ ہم پنڈی یا لاہور ایک اچھی سی کوٹھی بنائیں۔ لیکن بیگم صاحبہ دینے پر تیار نہ تھیں۔ کچھ عرصے تک ان کا آپس میں یہ زبانی جھگڑا چلتا رہا۔

جب بیگم صاحب نہ مانیں تو کرنل صاحب ان کو زدوکوب کرنے پر اتر آئے۔ بات بات پر بیگم صاحب کو بید سے مارتے۔ جب اس سزا کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو پھر انہوں نے بیگم صاحب کو ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ صبح شام میں اور کرنل صاحب ان کو وہاں جا کر کھانا دیتے اور کرنل صاحب میری موجودگی میں بیگم صاحب کو بیدوں سے مارتے۔ یہ بیچاری چلاتی۔ دہائی مچاتی۔ لیکن اس تنگ و تاریک کوٹھی میں خدا کے سوا اور کوئی بھی بیگم صاحب کے احوال سے واقف نہ تھا۔

کرنل صاحب کے ڈھائے ہوئے یہ ظلم بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ پیدا کر سکے تو ان کے ذہن میں ایک عجیب و غریب تجویز آئی۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک دن کہیں سے چوہوں سے بھرا ہوا پنجرہ لے آئے۔ مجھے آواز دی۔ میں آیا تو مجھ سے کہنے لگے۔ گاڑی کی ڈگی میں چوہوں کا ایک پنجرہ پڑا ہوا ہے۔ یہ نکال کر ڈرائنگ روم میں لے جا کر رکھو۔ میں نے ان کے متعلق کوئی خاص غور نہ کیا۔ میں سمجھا شاید لیبارٹری کے لئے لائے ہیں۔ میں نے چوہوں سے بھرا ہوا وہ پنجرہ لے جا کر ڈرائنگ روم میں جا کر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر میں کرنل صاحب لباس تبدیل کر کے آئے اور سامنے کے ایک صوفے پر بیٹھ گئے دیکھ کر مسکرانے لگ گئے۔ میں ان کی اس معنی خیز مسکراہٹ کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔ مجھ سے کہنے لگے۔

گل شیر خان تمہیں پتہ ہے یہ چوہے میں کس غرض کے لئے لایا ہوں۔

نہیں سر مجھے تو پتہ نہیں۔

یہ چوہے تمہاری بیگم صاحبہ کو راہ راست پر لانے کے لئے استعمال کریں گے۔

کیسے سر.....؟ ان کو کھلائیں گے۔

تو بھی بھولا بادشاہ ہے۔ دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے....؟

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے پیسے دیئے کہ سامنے والی کینٹین سے نائیلن کی ایک پتلی سی رسی تقریباً چھ گز لے آؤ۔

میں رسی لے آیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے۔ اٹھاؤ یہ چوہوں والا پنجرہ۔ ابھی تمہیں مداری کا تماشہ دکھاتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں ان کے

پیچھے پیچھے یہ پنجرہ اٹھا کر چل پڑا۔ خیال تھا کہ وہ کھلے میدان میں کوئی تماشہ دکھائیں گے۔ لیکن وہ گیلری میں چلتے چلتے رک گئے۔ انہوں نے جیب سے چابی نکال کر اس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ کھولا جس میں بیگم صاحبہ کئی دنوں سے محبوس تھیں۔

ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو بیگم صاحب چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ جاتے ہی کرنل صاحب نے پوچھا مہارانی صاحبہ کا کیا حال ہے....؟

بیگم صاحبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید کرنل صاحب کا طنزیہ انداز گفتگو ان کو اچھا نہ لگا۔

کیوں مہارانی صاحبہ۔ آپ کے مزاج تو ٹھیک ہیں ناں۔

بس اللہ کا شکر ہے۔

اٹھ مکار عورت۔

کرنل صاب نے ایک دم لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے بیگم صاحبہ کو کہا۔

میں نے کیا مکر کیا ہے؟

تیری زبان بہت چلتی ہے۔ اور آگے بڑھ کر انہوں نے ان پھول جیسے گالوں پر چانٹے برسانے شروع کر دیئے۔

پھر کرنل صاحب نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ اٹھا لیا۔ اور مجھ سے کہنے لگے گل شیر اس فاحشہ کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ میں ہچکچایا تو انہوں نے غصے سے آگے بڑھ کر وہ رسی میرے ہاتھ سے نوچ لی اس سے تقریباً ایک گز کا ٹکڑا کاٹ لیا اور بیگم صاحبہ کو کہنے لگے۔ "چل اٹھ کھڑی ہو" میں تمہیں زبان درازی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کے دونوں ہاتھ ان کی پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے پھر رسی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے کر بیگم صاحبہ کی شلوار کو دونوں ٹخنوں پر مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر ایک بڑے ٹکڑے سے بیگم صاحبہ کی دونوں ٹانگیں اکٹھی کر کے پاؤں سے تھوڑا اوپر مضبوطی سے باندھ دیں۔

سر اس عرصے میں میں نے بڑے غور سے دیکھا کہ بیگم صاحبہ ایک ننھی کبوتری کی طرح سہمی کھڑی تھیں۔

جب یہ سب کچھ کرنل صاحب کر چکے تو مجھے کہنے لگے۔

گل شیر چوہوں والا پنجرہ اٹھا کر ادھر لے آؤ۔ اس وقت تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کرنل صاحب کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں پنجرہ اٹھا کر ان کے پاس لے آیا۔ انہوں نے ایک غیر آدمی کی موجودگی میں اس کی نظروں کے سامنے اپنی بیگم کی شلوار کھول دی۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ایک ایک چوہا پکڑ کر اس کی شلوار میں ڈالتے جاؤ۔

میں یہ دیکھ کر اور ان کا یہ حکم سن کر لرز اٹھا۔ انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"چوہے ڈالتے کیوں نہیں.....؟" میں نے ہاتھ پنجرے میں ڈالا تو سب چوہوں نے اکٹھا مجھ پر حملہ کر دیا۔ اور متعدد چوہوں نے مجھے کاٹ لیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ باہر کھینچ لیا۔ کرنل صاحب کو غصہ آ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ اس سے پہلے اپنی بیگم کی کھلی ہوئی شلوار میرے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ پھر انہوں نے پنجرے میں ہاتھ ڈال کر ایک چوہے کو باہر نکال لیا۔ مجھے بریف کیا کہ کمر کے پاس دونوں ہاتھوں سے شلوار کو پکڑ کر رکھو۔ جب میں چوہے اندر پھینکنے لگوں اسے تھوڑا سا کھولا کر۔ اس طرح کرنل صاحب نے بیگم صاحبہ کی شلوار کے اندر چوہا چھوڑ دیا۔ اسی طرح انہوں نے تقریباً ایک درجن چوہے اپنی بیگم صاحبہ کی شلوار کھلوا کر ایک غیر آدمی کی موجودگی میں اس کی شلوار کے اندر چھوڑے اور پھر جلدی سے ان کا ازار بند اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں بیگم صاحبہ تڑپنے لگ گئیں۔ دہائی دینے لگ گئیں۔

کرنل صاحب فلموں کے شیطان کی طرح لمبے لمبے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں انسانیت کی یہ تذلیل دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ میں سوچنے لگا۔ بڑے لوگ بھی ایسی کمینی اور ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ بے چاری بیگم صاحبہ پر قیامت کا یہ سماں تقریباً آدھ گھنٹہ تک رہا ہو گا۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر بے حد ندامت ہو رہی تھی۔ میں اپنی مجبوری کے متعلق سوچنے لگ گیا کہ یہ اٹھارہ روپے کا حصول مجھ جیسے غریب لوگوں سے کس کس طرح کے ذلیل کام کرواتا ہے۔

اور جناب عالی.....!!! یہ کرنل صاحب کا روز کا معمول تھا۔ وہ اس بے آسرا نوجوان لڑکی پر اونچی سوسائٹی کے رہائشی علاقے کے بیچوں بیچ یہ ظلم روزانہ روا

رکھتے۔ اس مجبور لڑکی کے درد بھرے نالے کسی بڑے آدمی کے کان تک رسائی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ایک دن میں بیگم صاحبہ کو رات کا کھانا دینے گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

گل شیر خان۔ آج تمہارے کرنل صاحب نہیں آئے۔

ہاں بیگم صاحبہ ان کی انسپکشن ہو رہی ہے وہ آج مصروف ہیں۔ رات کو بھی دیر سے آئیں گے۔

انہوں نے میری طرف ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گل شیر تمہاری کوئی بہن ہے....؟

بیگم صاحبہ ایک بہن ہے۔

گل شیر اگر تمہاری بہن کے ساتھ کوئی ظالم اس طرح کا ظلم روز روا رکھے تو تم کیا کرو گے.....؟

بیگم صاحبہ میں اسے قتل کر دوں گا۔

کیوں۔ اس لئے کہ وہ تمہاری بہن ہے۔

گل شیر میں بھی تو کسی کی بہن ہوں۔ اور انہوں نے دہاڑیں مارتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

اٹھو بیگم صاحبہ۔ میں نے ان کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اور ان سے پوچھا۔ بیگم صاحبہ آپ کا کوئی بھائی ہے۔

گل شیر خان اس بھری دنیا میں ایک ماں ہے جو انڈیا میں ہے۔ یہاں پاکستان میں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ایک آدمی ہے لیکن وہ بیچارہ اپنے حالات کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اگر اس کو اطلاع ہو جائے تو وہ آ کر شاید میری رہائی کی کوئی تدبیر کرے۔

وہ کہاں رہتا ہے....؟

لاہور میں۔

وہی تو نہیں۔ شادی والے روز جنہوں نے آپ کو رخصت کیا تھا۔

جی ہاں وہی ہیں۔

لیکن بیگم صاحب ان کے تو ہمارے کرنل صاحب جانی دشمن ہیں۔ انہوں نے مجھے خصوصی طور پر کہا ہے کہ اگر کبھی وہ یہاں آئے تو مجھے دفتر ٹیلی فون کر کے اطلاع کر دینا۔ میں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا ہوں۔

چنانچہ حضور والا!! صوبیدار احمد صاحب کل یہاں آ گئے۔ اور یہ ڈرامہ شروع ہو گیا۔ میں نے کرنل صاحب کی ہدایت کے مطابق اپنا پارٹ ادا کیا۔ کرنل صاحب نے صوبیدار صاحب کو ٹھکانے لگانے یا سبق سکھانے کے لئے لانس نائیک حسن علی اور سپاہی علی محمد کا انتخاب کیا تھا۔ کرنل صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے احمد صاحب کو ڈرائنگ روم میں پہلے لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ میں گیٹ کو اندر سے تالا لگا کر گیٹ کے اندر کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ کرنل صاحب حسن علی اور علی محمد کو لے کر اندر چلے گئے۔ میں تو پھر دوسرے سپاہیوں کے ساتھ جو صوبیدار میجر فتح علی خان کی کمانڈ میں کرنل صاحب کی کوٹھی پر صوبیدار احمد صاحب کو پکڑنے اور ٹھکانے لگانے کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ باہر ہم لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوئی کہ اندر کیا کچھ ہوا ہے۔ کافی دیر تک ہم لوگ گپ شپ کرتے رہے۔ ہمیں تب پتہ چلا کہ جنرل صاحبان ملٹری پولیس کی بہت سی نفری کو لے کر ہماری کوٹھی پر آ گئے۔ ہمیں یہاں صحیح صورت حال کی قطعاً کوئی خبر نہ تھی۔ جنرل صاحب نے گیٹ کھلوانا چاہا تو میں نے نہ کھولا۔ حتیٰ کہ ایک آدمی دیوار پھاند کر اندر آ گیا۔ اس کو اے ایم سی کے آدمیوں نے مارا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ملٹری پولیس کا سپاہی تھا۔

ہمیں قطعاً اس بات کی کوئی خبر نہ تھی کہ کوٹھی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کرنل صاحب دو پہلوان قسم کے آدمیوں کو لے کر اندر گئے ہوئے ہیں۔ کھڑکیاں دروازے بند ہیں اب تک بیچارے صوبیدار صاحب کی تو انہوں نے تکا بوٹی کر دی ہو گی۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل الٹا نکلا۔ بیگم صاحبہ اور صوبیدار احمد صاحب نے کوٹھی کی پچھلی طرف سے نکل کر ساتھ والے بریگیڈیئر فہیم رضوی صاحب کی کوٹھی میں پناہ لے لی تھی۔

حضور والا.....!!! اس کے بعد کے واقعات کی قطعاً مجھے خبر نہ ہے۔ جناب

عالی...!!! اس کے ساتھ میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں۔

پریزیڈنٹ : "کرنل سعید صاحب آپ سپاہی گل شیر خان سے کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں جناب...!!"

"مسز سعید آپ کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں جناب...!!!"

پریذیڈنٹ نے صوبیدار میجر فتح علی خان اے ایم سی کو بلایا۔ اور ان کا بیان ریکارڈ کیا۔

جناب عالی میں...... فیلڈ ایمبولینس میں صوبیدار میجر ہوں۔ کل تقریباً گیارہ بجے مجھے کرنل سعید صاحب نے کہا کہ تقریباً آٹھ دس جوان لے کر میں ان کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آؤں۔ انہوں نے مجھ سے مزید کہا کہ لانس نائیک حسن علی اور سپاہی علی محمد کو بھی میں ان آدمیوں میں شامل کر لوں۔ چنانچہ میں دس آدمیوں کو لے کر تیار ہو گیا۔ کرنل صاحب پک اپ میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنی کوٹھی پر آئے۔ وہ لانس نائیک حسن علی اور سپاہی علی محمد کو لے کر بنگلے کے اندر چلے گئے۔ باقی لوگ باہر گیٹ کے پاس پک اپ میں بیٹھے رہے۔ میں صبح سے بیمار تھا۔ اس لئے میں پک اپ کی فرنٹ سیٹ پر جا کر لیٹ گیا۔ پھر اس کے بعد کے حالات کی مجھے کوئی خبر نہیں۔

کرنل سعید آپ نے صوبیدار میجر صاحب سے کچھ پوچھنا ہے....؟

نہیں سر....!!!

پریذیڈنٹ:۔ اچھا صوبیدار میجر صاحب آپ باہر جا کر بیٹھیں۔ اور پھر صوبیدار میجر سیلوٹ کر کے چلا گیا۔

پریذیڈنٹ نے صوبیدار احمد صاحب کو بلوایا۔ وہ آئے سیلوٹ کر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

پریذیڈنٹ نے ان سے پوچھا۔ صاحب آپ نے وردی کیوں نہیں پہنی ہوئی۔

سر.... میں لاہور سے دو دن کی چھٹی یہاں آیا تھا کہ یہ کیس ہو گیا اور

مجھے جنرل صاحب نے حکم دیا کہ میں کیس کے فیصلے تک یہاں ہی رہوں۔

انہوں نے ٹائپسٹ کو بلایا۔ اور صوبیدار احمد صاحب کے بیان ٹائپ کروانے شروع کئے۔

بیان صوبیدار احمد کور آف سگنل (نمبر..... ڈویژن سگنل رجمنٹ)

جناب عالی.....!!! میرا ڈیو سگنل رجمنٹ میں پوسٹنگ ہے۔ مجھے آج سے تین دن پہلے زاہدہ حنا کا راولپنڈی سے بھیجا ہوا ایک خط ملا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے تقریباً ایک ماہ سے کرنل سعید نے قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ روزانہ وہ اور اس کا اردلی گل شیر مجھے بری طرح زدو کوب کرتے ہیں اور اب تقریباً دس دن سے ایک نئی انسانیت سوز حرکت انہوں نے میرے ساتھ شروع کر رکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ میری شلوار کو نیچے ٹخنوں کے پاس باندھ دیتے ہیں اور پھر میری شلوار کھول کر اس کے اندر چوہے چھوڑ دیتے ہیں۔ جس سے مجھے بے پناہ تکلیف اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ دونو میرے ہاتھ اس کاروائی سے پہلے پیچھے پیٹھ پر باندھ دیتے ہیں۔ میں روتی چلاتی ہوں تو یہ شیطان کی طرح قہقہے لگاتے ہیں۔

مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلانے کی اگر تم کوئی سبیل نکال سکتے ہو تو خدا کے لئے میری مدد کو آؤ اس ملک میں خدا کی ذات کے سوا اور آپ کے سوا میرا کوئی غمگسار نہیں۔

یہ کام بڑا سوچ سمجھ کر کرنا۔ کہیں تم بھی اس ظالم کے پنجے میں نہ پھنس جاؤ۔ یہ مجھے یہ سب تکلیفیں اس لئے دیتا ہے کہ میں اپنا روپیہ پیسہ اور جیولری اس کے حوالے کر دوں۔ اور وہ میں کرتی نہیں ہوں۔ اسی لئے یہ سزا بھگت رہی ہوں۔

تمہاری مدد کی طلبگار

زاہدہ حنا۔

حنا صاحبہ کا ارسال کردہ خط ٹینڈر کرتا ہوں۔

جناب عالی.....!!! میری ملاقات محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ سے جہلم میں ہوئی۔

جب کہ ہماری یونٹ وہاں قیام پذیر تھی۔ ایک رات مجھے دوستوں نے دھوکے سے ڈرنک کروا دیا تھا۔ اور میں واپسی پر راستے میں گر گیا۔ کرنل سعید صاحب اور محترمہ حنا صاحبہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ کمال مہربانی سے مجھے اٹھا کر اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ اس طرح سے یہ حادثاتی ملاقات ہماری ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ چونکہ زاہدہ حنا صاحبہ بے حد حسین و جمیل خاتون تھیں اس لئے میں ان کے حسن اور پھر ان کے برتاؤ سے بے حد متاثر ہوا۔ یہ بھی میری کمپنی کو پسند کرنے لگیں۔ اس دوران میں مجھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ کرنل سعید ان کے ہسبینڈ نہیں ہیں۔ بلکہ محترمہ ان کے پاس ایک دوست کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ محترمہ بڑی ماڈرن خاتون ہیں۔ میں نے ان سے جب اس موضوع پر گفتگو کی کہ وہ اور کرنل سعید دونوں جوان آدمی ہیں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں تو کیا ان کے درمیان کسی قسم کے جنسی تعلقات استوار ہیں؟ تو اس نے بغیر کسی جھجک کے یہ کہا۔

نہیں احمد صاحب۔ میں بیمار ہوں۔ کسی مرد سے تعلقات استوار کرنے کے قابل ہی نہیں۔

کیوں آپ عورت نہیں ہیں۔

دیکھنے میں عورت ہوں۔ لیکن میرے اندر کی عورت مر چکی ہے۔

وہ کیسے۔

پھر انہوں نے مجھے بڑی تفصیل سے یہ عجیب و غریب قسم کی کہانی سنائی۔

وہ ایک ہندوستانی ریاست کے ایک مہاراجہ کی مہارانی تھی۔ مہاراجہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ جب کہ محترمہ بڑی مشکل سے بیس بائیس سال کی تھی۔ مہاراجہ نہایت ہی بدصورت اور کریہہ المنظر تھا۔ نہایت گندے اور بدنما دانت' ہر وقت اس کے منہ سے بو آتی تھی۔

حنا نے مجھے بتایا کہ راجہ جنسی طور پر بے حد کمزور تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹر حکیم اور وید ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جو اس کو دن بھر انجکشن لگاتے۔ طلا کا استعمال کراتے اور متعدد کھانے کی دوائیاں دیتے تب کہیں جا کر مہاراجہ رات کی اپنی کارکردگی کے لئے تیار ہوتے۔ اور پھر وہ ریچھوں کی طرح ساری رات بیچاری حنا کو جھنجھوڑتے رہتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ محترمہ خودکشی کرنے کی سوچنے لگ گئی۔

جب حنا کی مہاراجہ کے ساتھ شادی ہوئی تو اس میں انگریز وائسرائے گورنر اور دوسرے لاتعداد انگریز افسروں نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر اسے ہندوستان بھر کی ریاستوں کے راجوں مہاراجوں ' نوابوں اور ان کی رانیوں اور بیگمات نے بے بہا تحفے دیئے۔ ان میں بڑے بڑے قیمتی زرو جواہرات کے ہار بھی تھے۔ مہاراجہ کے ساتھ جب حنا نے شادی کی تھی اس وقت اس نے ایم اے میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ اب مہاراجہ سے اجازت حاصل کر لی کہ میں بمبئ واپس جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ وہ ماں کے پاس بمبئ آ گئی۔ وہاں فسادات شروع ہو گئے۔ اور ایک دن اس کی ماں بازار گئی اور پھر واپس نہ آئی۔ حنا نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملی۔ ان حالات کے پیش نظر حنا دل برداشتہ ہو کر بمبئ سے کراچی آ گئی اور یہاں کرنل سعید سے اس کی ملاقات ہوئی۔

میں حنا کے ساتھ پانچ چھ مہینے متواتر ملتا رہا۔ ہم دونو بس ایک دوسرے کی کمپنی کو پسند کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بعد میں حنا نے مجھے بتایا کہ تمارے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیسے تو کہنے لگی۔ تمہاری قربت اور محبت جو ہر قسم کی ہوس ' حرص اور طمع سے پاک ہے اس سے میرے اندر بڑی عجیب سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیسی۔ کہنے لگی۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اگر مزید کچھ عرصہ آپ کی قربت مجھے میسر رہی تو میرے اندر کی عورت پھر سے زندہ ہو جائے گی۔

حنا کو مجھ سے ملنے کی ایک یہی کشش تھی ۔ کرنل سعید میرا حنا سے ملنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن حنا کے سامنے اس کی ایک بھی نہ چلتی تھی۔ ایک دن حنا نے مجھے بتایا کہ میں بیمار تھی۔ سعید میرے لئے دوائی لایا۔ مجھے انجیکشن لگایا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ چنانچہ بے ہوشی کے عالم میں اس نے مجھے ریپ کیا۔ اس سے حنا ناراض ہو کر کراچی چلی گئی۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ سعید سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ سعید سے پہلے اس نے مجھے بارہا کہا کہ میں اس سے شادی کر لوں لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں میرے دو بچے بھی ہیں۔ در اصل ہمارے سٹیٹس اور رہنے سہنے کے انداز میں بڑا فرق تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ چل سکتے تھے۔

چنانچہ جب اسے میری طرف سے مکمل ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو پھر اس نے میرے کہنے پر سعید صاحب سے شادی کر لی۔ یہ شادی لاہور فلیٹیز ہوٹل میں ہوئی۔

حنا کا ولی، وکیل اور سرپرست میں ہی تھا۔ نکاح نامہ پر میرے ہی دستخط تھے۔ میں نے ہی اسے رخصت کیا۔ کرنل سعید کا یہ کہنا کہ میں ان کی عدم موجودگی میں حنا سے آ کر ملتا تھا۔ سراسر غلط ہے۔ میں شادی کے بعد سے آج تک حنا کو نہیں ملا۔

اب اس کا خط ملا اور مجھے پتہ چلا کہ وہ بے آسرا لڑکی اس ظالم آدمی کے پنجوں میں جکڑی ہوئی پھڑ پھڑا رہی ہے۔ تو میں فوراً چھٹی لے کر پنڈی پہنچا۔ کرنل سعید صاحب کی کوٹھی پر آیا۔ بیل دی۔ سپاہی گل شیر آیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کیوں گرائیں۔

بھائی صاحب میں نے محترمہ حنا صاحبہ سے ملنا ہے۔

اس نے کافی دیر کی بحث اور چھان پھٹک کے بعد مجھے کوٹھی کے برآمدے میں ایک کرسی لا کر دی۔ میں بیٹھ گیا وہ کافی دیر اندر ڈرائنگ روم سے ٹیلی فون کرتا رہا۔ پھر مجھے اندر جا کر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پک اپ آ کر رکی جس سے کرنل سعید اترا۔ پک اپ کے اندر سے آٹھ دس آدمی اترے۔ کرنل سعید ان میں سے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے گل شیر کو بلایا اس سے کچھ باتیں کیں اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد کرنل سعید ان آدمیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئے۔ انہوں نے اندر داخل ہو کر گیلری کا اندر سے بولٹ بند کر دیا۔ وہ آدمی باہر گیلری میں کھڑے رہے۔ کرنل سعید اکیلا اندر آیا۔ میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا۔

تم یہاں کیوں آئے ہو۔ کرنل سعید نے غصے کے عالم میں کہا۔

آپ سے اور حنا سے ملنے آیا ہوں۔

حنا تمہاری کیا لگتی ہے...؟ ماں لگتی ہے۔

زبان سنبھال کر بات کرو۔ اگر میں تمہارے گھر نہ آیا ہوا ہوتا تو اس بے ہودہ بات کا تمہیں مزہ چکھاتا۔

اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر زور کا ایک چانٹا مارا۔

میں نے باکسنگ کا ایک ہی مکا اس کی کنپٹی پر مارا۔ وہ چاروں شانے چت گر پڑا۔ میں نے اوپر سے اس کو لاتیں ماریں۔ باہر جو آدمی کھڑے تھے وہ آگے بڑھے۔ میں نے پہلے آدمی کو بھی اسی طرح کا ایک پنچ کنپٹی پر مارا۔ اس نے بھی آگے آنے کی

تکلیف گوارا نہیں کی۔ پھر سپاہی علی محمد آگے آیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اللہ پاک نے میری لاج رکھ لی۔ تین فوجی اور طاقتور آدمیوں کو میں نے آن واحد میں ڈھیر کر دیا۔ ان کو اسی حالت میں چھوڑا اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اوار ڈرائنگ روم کا باہر سے کنڈہ لگایا اب مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ میں حنا کا کہیں پتہ چلاؤں۔ سب کمروں میں جھانک کر دیکھا کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ بڑا پریشان ہوا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کو تالا لگا تھا۔ غالباً یہ سٹور تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید اس میں حنا ہو۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اندر کوئی آدمی ہے۔ میں نے دروازہ ناک کیا۔ اندر سے کسی نے آہستہ سے پوچھا۔

کون ہو......؟

میں احمد ہوں۔

احمد تالا توڑنے کی کوشش کرو۔

میں نے گھوم پھر کر سریئے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اس سے میں نے بڑی آسانی سے تالا توڑ لیا۔ حنا مجھ سے دوڑ کر لپٹ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ باتیں کرنے کا وقت اب نہیں ہے۔ جلدی نکلنے کی کوشش کرو۔ اس نے جلدی سے اپنا ضروری سامان لیا۔ اور کپڑے تبدیل کئے اور ہم نے کوٹھی کی پچھلی طرف سے نکل کر درمیانی فینس عبور کی۔ اور ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ کوٹھی کے برآمدے میں بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے حنا کی پذیرائی کی۔ حنا نے ان کو کہہ کر ان کے خاوند بریگیڈیئر فہیم رضوی صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی اور ان کو پوری صورت حال سے مختصر طور پر آگاہ کیا۔ اور پھر بریگیڈیئر صاحب نے ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب کو کہہ کر پورا ایکشن لیا۔ اس کے بعد کے واقعات میرے سامنے نہیں ہوئے۔ اس لئے میں ان کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

جناب عالی.....!! میں انہی گزارشات کے ساتھ اپنا بیان ختم کرتا ہوں۔

پریذیڈنٹ :۔ کرنل سعید! آپ صوبیدار احمد صاحب سے کچھ پوچھنا چاہیں گے۔

نہیں سر.....!!

اچھا صوبیدار صاحب آپ کا شکریہ - آپ فارغ ہیں - لیکن یہاں ہی رہیں۔ کہیں واپس لاہور نہ چلے جائیں۔

نہیں سر! مجھے اے جی صاحب نے بتا دیا ہے۔ میری ATTACHMENT یہاں ہی سگنلز ڈائریکٹوریٹ کے ساتھ ہو گئی ہے۔

میں کہیں جاتا نہیں ہوں۔ جب تک یہ کیس چلتا رہے گا - میں یہاں ہی رہوں گا۔

ہاں ٹھیک ہے۔

تھینک یو............ اور پھر احمد سیلوٹ کر کے باہر نکل آیا۔

پریذیڈنٹ نے کورٹ اردلی کو بلایا اور حکم دیا کہ بابا محمد شفیع جو کرنل سعید کا کک ہے اس کو بلاؤ۔ اردلی سلام کر کے چلا گیا۔ اور پھر بابا محمد شفیع بیڑی پیتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ پریذیڈنٹ نے اس سے کہا۔

بابا بیڑی پھینک دو۔ عدالت میں سگریٹ بیڑی پینا منع ہے۔

جناب عالی ....!!! معافی چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر گیلری کے دروازے سے بیڑی باہر پھینک دی اور اسے پاؤں سے مسل دیا۔ اور پھر بالوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے ٹھیک کرتا ہوا واپس اندر آ گیا۔

بابا۔ بیٹھ جاؤ۔ پریذیڈنٹ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بابا محمد شفیع کرسی پر بیٹھ گیا۔

پریذیڈنٹ صاحب نے اس سے پوچھا۔

بابا۔ آپ کب سے کرنل سعید کے پاس نوکری کر رہے ہیں۔

حضور دو سال سے۔

کرنل صاحب تنخواہ وغیرہ ٹھیک ٹھاک دیتے ہیں۔

جناب ٹھیک دیتے ہیں۔

تمہارے کرنل صاحب کی شادی کب ہوئی ہے۔

جناب عالی تقریباً چھ سات ماہ ہو گئے ہیں۔

یہ آپس میں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ناراض وغیرہ تو نہیں۔

جناب عالی.....!!! میں تھوڑی دیر کے لئے انہیں کھانا کھلانے کے لئے آتا ہوں۔ اس وقت تو یہ مجھے ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔

یہ دونوں صبح، شام کھانا اکٹھا کھاتے ہیں۔

حضور پہلے تو اکٹھا کھاتے تھے۔ لیکن اب تقریباً ایک ماہ سے کرنل صاحب الگ کھاتے ہیں۔ اور بیگم صاحب کے لئے کھانا خود وہ اور کبھی گل شیر کھانا ان کے کمرے میں لے کر جاتا ہے۔

آپ نے پوچھا نہیں.....؟ کہ بیگم صاحبہ کا کھانا وہاں کیوں جاتا ہے۔

جناب پوچھا تھا۔ کرنل صاحب کہنے لگے۔ بیگم صاحبہ بیمار ہیں اس لئے کھانا وہاں ہی کھائیں گی۔

کوئی پرہیزی کھانا آپ ان کو بیگم صاحبہ کے لئے الگ پکا کر دیتے تھے۔

نہیں جناب۔ وہی کھانا جو گھر میں پکتا تھا۔ وہی لے جاتے تھے۔

آپ کبھی بیگم صاحبہ کی بیمار پرسی کے لئے ان کے کمرے میں گئے تھے۔

نہیں جناب گل شیر نے مجھے کہا کہ کرنل صاحب کا حکم ہے کہ بیگم صاحبہ کے کمرے میں کوئی بھی نہ جائے۔

آپ کی موجودگی میں کبھی کوئی آدمی بیگم صاحبہ کو ملنے کے لئے آیا۔

نہیں جناب کبھی نہیں آیا۔

یہ آدمی بھی کبھی نہیں آیا۔ پریذیڈنٹ نے احمد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

نہیں جناب کبھی بھی نہیں آیا۔

بابا تمہارے کرنل صاحب نے چوہے بھی پال رکھے ہیں۔

بس سرکار ان کو یہ نیا شوق لگا۔ پہلے تو نہیں تھے۔ اب تقریباً دس پندرہ دن ہوئے ہیں کہیں سے لے آئے ہیں۔

ان چوہوں کو کیا کرتے ہیں۔ کھیلتے ہیں ان کے ساتھ۔

سرکار مجھے تو خبر نہیں۔

انہوں نے یہ چوہے اپنے بیڈ روم میں رکھے ہوئے ہیں۔

نہیں سرکار اردلی کی کوٹھڑی میں پڑے ہیں۔

آپ نے کب دیکھے ہیں۔

سرکار میں نے گل شیر کو ایک آدھ دفعہ چوہوں کا یہ پنجرہ ادھر لاتے لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

اچھا بابا یہ بتاؤ کبھی تم نے دیکھا ہو کہ کرنل صاحب نے اپنی بیگم کو بیدوں سے مارا ہو۔

نہیں سرکار مجھے اس کی خبر نہیں ہے۔

پریذیڈنٹ: اگر کسی نے بابا محمد شفیع سے کوئی سوال پوچھنا ہو تو وہ پوچھ سکتا ہے۔

نہیں سر کچھ نہیں پوچھنا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

اچھا بابا جی آپ جائیں۔ بہت شکریہ آپ کا۔

سرکار آپ کا بھی بہت شکریہ۔ اور بابا محمد شفیع اپنے کام پر چلا گیا۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

کیپٹن طارق اب دیکھ کر بتاؤ کہ کس آدمی کے بیان قلمبند ہونے سے رہ گئے ہیں۔

سر ایم پی کا زخمی سپاہی خورشید عالم اور زاہدہ حنا کے بیانات باقی ہیں۔

ٹھیک ہے سپاہی خورشید عالم کو بلاؤ۔

اس نے آکر سیلوٹ کیا اور پریذیڈنٹ کے کہنے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

بیان نمبر........ سپاہی خورشید عالم۔ ملٹری پولیس یونٹ راولپنڈی۔

جناب عالی........! آج صبح تقریباً گیارہ بجے میں دوسرے جوانوں کے ساتھ ڈیوٹی پر کرنل سعید احمد صاحب کی کوٹھی پر آیا۔ تھوڑی دیر میں ایڈجوٹنٹ جنرل صاحب۔ ڈائیریکٹر میڈیکل سروسز اور پرووسٹ مارشل بریگیڈیئر رضوی صاحب بھی وہاں آ گئے۔ کوٹھی کا مین گیٹ اندر سے بند تھا۔ اندر سے آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب نے حکم دیا کہ دروازہ ناک کرو۔ میں نے دروازہ ناک کیا۔ تو اندر سے کسی نے پوچھا۔

کون ہے۔

دروازہ کھول۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔

دروازہ نہیں کھل سکتا۔

کیوں نہیں کھل سکتا۔

کرنل صاحب کا حکم ہے۔

تم دروازہ کھولو۔ جنرل صاحب کا حکم ہے۔

کسی کا بھی حکم ہو نہیں کھل سکتا۔ جب تک کرنل صاحب مجھے حکم نہیں دیں گے۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔

کرنل صاحب اگر اندر ہوں تو ان سے جا کر پوچھ لو کہ جنرل صاحب کا حکم ہے کہ دروازہ کھولو۔

جاؤ جاؤ - بڑے آئے جرنیلوں کا رعب دینے والے۔

میرے پاس ہی کھڑے دو جرنیل صاحبان اور پرووسٹ مارشل صاحب یہ باتیں سن رہے تھے۔ اس پر ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب نے مجھے حکم دیا کہ جوان دیوار چڑھ کر اندر کو کود جاؤ اور فوراً دروازہ کھول دو۔ میں ایک دم دیوار پر چڑھ گیا اور اندر کود گیا۔ اندر جا کر دیکھا کہ سپاہی گل شیر گیٹ کے اندر کرسی ڈال کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور گیٹ کو اندر سے تالا لگایا ہوا تھا۔ میں نے اس سپاہی کو کہا کہ باہر تین جرنیل صاحبان اور ملٹری پولیس کی کافی نفری کھڑی ہے - جنرل صاحب آرڈر دے رہے ہیں کہ گیٹ کھولو۔ سپاہی گل شیر میرے ساتھ اس بات پر لڑ پڑا۔ کہ تم بغیر کرنل سعید صاحب کی اجازت کے ان کی کوٹھی میں کیوں آئے ہو۔ پاس ہی ان کی یونٹ کی ایک پک اپ کھڑی تھی۔ جس کے باہر تقریباً سات آٹھ آدمی کھڑے گپیں ہانک رہے تھے۔ میری اور سپاہی گل شیر کی تلخ کلامی سن کر وہ بھی ہمارے پاس آ گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ میرے شور اور واویلے پر میرے باہر کے ساتھیوں کو جنرل صاحب نے حکم دیا کہ سب کود جاؤ۔ تقریباً بیس ایم پی والے دیوار پھاند کر اندر آ گئے۔ ان کو جب ان لوگوں نے دیکھا تو بھاگنے کی کوشش کی - لیکن انہوں نے سب کو پکڑ لیا۔ پھر سپاہی گل شیر نے اپنی جیب سے چابی نکال کر گیٹ کھولا اور جنرل صاحبان اور دوسرے سب لوگ اندر آ گئے۔

کیاان آدمیوں میں اس وقت صوبیدار میجر فتح علی خان بھی شامل تھے۔
جواب... نہیں جناب میں نے تو اس وقت انہیں وہاں دیکھا ہی نہ تھا۔
سوال..... کرنل سعید اور اس کے سات جو آدمی تھے اس وقت وہ کہاں تھے....؟

جواب...... جناب اندر کہیں ہوں گے۔ وہ باہر نہیں آئے تھے۔
پریذیڈنٹ کسی کو اگر اس گواہ سے کوئی سوال پوچھنا ہو تو؟
نہیں سر... سب نے یک زبان ہو کر کہا۔
اور پھر خورشید عالم سیلوٹ کر کے واپس باہر چلا گیا۔
پریذیڈینٹ نے بیل دی۔ کورٹ اردلی اندر آیا تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ زاہدہ حنا کو بلائیے۔
بہت اچھا۔ اور پھر وہ سپاہی باہر نکل گیا۔ حنا صاحبہ ساتھ کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کورٹ اردلی ان کو بلا کر لے آیا۔
انہوں نے بڑے ہی مہذب طریقے سے ہاتھ کے اشارے سے ان کو آکر سلام کیا۔
محترمہ...!! تشریف رکھئے۔ پریذیڈنٹ نے بڑے مہذب انداز میں کہا۔
وہ سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی بائیں طرف کرنل سعید گھبراہٹ کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب سے حنا اندر آئی تھی کرنل سعید نے اپنی نظریں اسی پر مرکوز کی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ حنا ایک دفعہ اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھے تو وہ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کر کے اس سے معافی مانگ لے۔ لیکن حنا نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔
کرنل سعید نے اٹھ کر پریذیڈنٹ سے استدعا کی۔
جناب عالی......! اگر فاضل عدالت مجھے چند منٹوں کی اجازت دے تو حنا صاحبہ سے تخلئے میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔
کیوں حنا صاحبہ کیا خیال ہے آپ کا۔ پریذیڈنٹ نے حنا کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

سر۔ مجھے افسوس ہے اب بات چیت کا وقت گزر گیا ہے۔ میں اب ان کے ساتھ کوئی بات نہیں کر سکتی۔

پریذیڈنٹ۔ ساری کرنل سعید۔ اچھا کاروائی شروع کی جاتی ہے۔

ہاں محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ آپ اپنا بیان شروع کریں۔

سر کھانا تیار ہے۔ پہلے لوگ کھانا کھالیں۔ یہ کاروائی تو رات گئے تک چلے گی۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ پہلے کھانا کھالیتے ہیں۔

کرنل رضوان اور کیپٹن طارق اٹھ کھڑے ہوئے۔ محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ نے پریذیڈنٹ صاحب کے قریب جاکر آہستہ سے ان سے بات کی۔

سر۔۔۔ کرنل سعید اور اس کے ساتھ جو دو اسکورٹ ہیں ان کو بھی آپ کھانے کے لئے کہیں۔ میں نے کافی آدمیوں کے لئے کھانے کا انتظام کروا دیا ہے۔ اسی لئے آپ مہربانی سے ایم پی کے میجر شاہ صاحب۔ صوبیدار میجر فتح علی خان اور احمد صاحب کو بھی کہیں کہ وہ بھی کھانے کے لئے چلیں۔

پریذیڈنٹ صاحب نے حنا صاحبہ کے کہنے کے مطابق ان سب لوگوں کو کہا۔ باقی نے تو خاموشی اختیار کی لیکن کرنل سعید کہنے لگا۔ سر مجھے معاف فرمایئے میں یہاں کھانا نہیں کھا سکتا۔ میں میس میں رنگ کر دیتا ہوں۔ ہم تینوں کا کھانا وہاں سے آ جائے گا۔ سعید صاحب وہاں سے کھانا آتے آتے دیر ہو جائے گی۔ ہم اپنا کام مکمل نہیں کر سکیں گے۔

سر کون۔ سی لڑائی لگی ہوئی ہے۔ کل مکمل ہو جائے گا۔

نہیں اے جی صاحب نے مجھے آرڈر دیا ہے کہ یہ کام آج رات ہی کو مکمل کرنا ہے۔

اے جی صاحب کا نہ جانے اس کیس میں کیا انٹرسٹ ہے۔ وہ تو خود اس کیس میں ایک فریق بنے ہوئے ہیں۔

نہیں سعید صاحب آپ ایسی غلط بات نہ کریں۔ پریذیڈنٹ صاحب نے کہا۔

نہیں میں سچ کہتا ہوں۔

کرنل سعید اور اس کے ساتھ جو دو اسکورٹ تھے وہ وہاں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک آفیسر نے اے ایم سی میس میں ٹیلی فون کیا کہ تین آدمیوں کا کھانا کرنل سعید کی کوٹھی پر بھیج دو۔ ابھی دوسرے لوگ کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ان آفیسرز کا کھانا بھی میس سے آگیا۔

سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اور کورٹ نے اپنی کاروائی شروع کر دی۔

زاہدہ حنا صاحبہ سے پریذیڈنٹ صاحب نے کہا۔

محترمہ آپ اس کرسی پر آ جائیں۔

وہ اٹھ کر کورٹ کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ ان سے تھوڑا ہٹ کر بائیں طرف کرنل سعید بیٹھا تھا۔ پریذیڈنٹ صاحب نے باقی سب لوگوں کا باہر چلے جانے کے لئے کہا۔ کرنل سعید کے اسکورٹ بھی اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب اندر صرف کورٹ کے ممبران اور ایک ٹائپسٹ رہ گیا۔ ان کے علاوہ کرنل سعید اور ان کی بیوی زاہدہ حنا۔ پریذیڈنٹ نے کمرے کا دروازہ بند کر دینے کے لئے کورٹ ارذلی کو حکم دیا۔ اس نے جب دروازہ بند کر دیا۔ تو پریذیڈنٹ زاہدہ حنا سے گویا ہوئے۔

محترمہ اب آپ اپنا بیان شروع کریں۔

بہتر سر.....!

سر میرا نام زاہدہ حنا ہے۔ میرے والد نواب سعادت علی خان نوابان اودھ میں سے ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی جاگیر لکھنؤ کے نواح میں ہے۔ میرے والد کی کوئی اولاد نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے میری والدہ کے ساتھ شادی کر لی جو اس وقت لکھنؤ کے ایک کالج میں پڑھاتی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد میرے والد نے میری ماں سے استعفا دلوا دیا۔ اور پھر وہ ایک گھریلو خاتون بن کر رہ گئیں ان کی شادی کے دو سال بعد میں پیدا ہوئی۔ میرے ماں باپ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔

جب میں تین سال کی ہوئی تو نواب صاحب نے مجھے ایک انگلش میڈیم سکول میں داخل کروا دیا۔ اور ساتھ ہی ہوسٹل میں بھی داخلہ لے دیا۔ دن گزرتے گئے۔

جب میری عمر بارہ سال ہو گئی تو میری ماں اور باپ کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں میری ماں نے نواب صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر جلد ہی ان کو بمبئی کے ایک گرلز کالج میں پڑھانے کی جاب مل گئی۔ اور اس طرح ہم دونو ماں بیٹی بمبئی منتقل ہو گئیں۔ اس کے بعد نواب صاحب نے ہماری کوئی خبر نہ لی۔ مجھے ساری عمر یہ رنج رہے گا کہ میرے باپ نے کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ اور نہ ہی کبھی مجھے اپنے پاس بلوایا ہے۔ میری ماں چند ہی سالوں میں اس کالج کی پرنسپل بن گئیں۔

میں نے بی ایس سی کر لیا تھا اور ایم ایس سی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ایک دن اپنی ماں کے ساتھ تاج محل ہوٹل کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے وہاں گئی۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی ایک بڑی ریاست کے مہاراجہ تھے۔ وہاں میری ماں کی اور میری ملاقات اس راجہ سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ جب بھی بمبئی آتے ہمارے گھر ضرور آتے۔ اور بے شمار قیمتی تحائف میرے لئے لاتے۔ آخر کار انہوں نے میری ماں سے کہہ کر مجھ سے شادی کر لی۔ شروع میں تو میں اس شادی میں خوش تھی لیکن جلد ہی مجھے اس غلیظ آدمی سے نفرت ہو گئی۔ اس راجہ کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ کالا کلوٹا۔ ٹھگنا سا قد بہت ہی گندے پیلے رنگ کے دانت' منہ سے ہر وقت بدبو کے بھبکے اڑا کرتے تھے۔ وہ سوتا تھا تو منہ کھلا رکھتا تھا جس کی وجہ سے اس کے منہ کے اندر مکھیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ قابل نفرت بات کہ وہ سوتا تو اس کے منہ سے متواتر رالیں اس کی گالوں پر بہہ بہہ کر اس کی گردن پر گرتی رہتی تھیں۔

وہ جنسی طور پر بہت کمزور آدمی تھا۔ حقوق ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ اب بھی اپنی ہوس پرستی کے شوق میں دو چار سال کے بعد نئی شادی کرتا تھا۔ اپنی جنسی کمزوری کا علاج کے لئے اس نے ایک حکیم۔ ایک ڈاکٹر اور ایک وید مستقل ملازم رکھے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب طرح طرح کے کشتے اسے کھلاتے۔ وید صاحب امساک بڑھانے کے لئے مختلف قسم کے روغن تیار کرتے اور پھر مہاراجہ صاحب کو خصوصی مساس کے لئے دیتے جبکہ ڈاکٹر صاحب مختلف جنسی ٹیکے دن بھر لگاتے رہتے اور تب کہیں رات کو جا کر راجہ صاحب راغب ہوتے۔

چونکہ ان انواع و اقسام کی دوائیوں کے بیجا استعمال سے ان کی قوت حس

تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ نشے کی حالت میں متواتر چھ چھ گھنٹے مجھے ریچھ کی طرح دبوچے بھنبھوڑتے رہتے۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے میرا جسم دہکتے کوئلوں میں رکھ دیا گیا ہے۔ میں چیختی چلاتی رہتی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ تقریباً پانچ چھ ماہ کی مسلسل غلط کارروائیوں کی وجہ سے میرا جسم بے حس ہو گیا اور مجھے کسی قسم کے جنسی تشدد کا پتہ نہ چلتا۔ میں اپنے آپ کو پتھر کی ایک بے جان سل سمجھتی اور بے حس و حرکت پڑی رہتی۔

میں نے مہاراجہ سے کچھ عرصے کے بعد علیحدگی اختیار کر لی۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو اس میں ہندوستان کے سب راجوں۔ مہاراجوں' نوابوں اور والیان ریاست نے شرکت کی۔ ہندوستان بھر سے بڑے بڑے لوگ' سرکاری افسر' گورنر حتیٰ کے وائسرائے نے بھی شرکت کی۔ مجھے بے بہا تحائف دیئے۔ بلا مبالغہ ان کی قیمت کروڑہا روپے ہو گی۔ جب میں مہاراجہ سے علیحدگی اختیار کر کے واپس بمبئی آنے لگی تو انہوں نے مجھ سے کوئی ہیرے جواہرات اور زیورات واپس نہ لئے۔ اور یہ سب کچھ میں اپنے ساتھ لے آئی۔ جو آج تک میں خرچ کر رہی ہوں اور ختم ہونے میں نہیں آتے۔

کرنل سعید کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میں نے اس کے ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات چرائے تھے۔ یہ حضرت تو اپنی تنخواہ بینک سے نکلواتے ہی نہ تھے۔ سب خرچہ مجھ سے لے کر کرتے تھے۔ کار میں نے خریدی تھی اس کار میں اس نے کبھی ایک پیسے کا پیٹرول بھی نہیں ڈلوایا۔ میں نے تین فل ٹائم نوکر رکھے ہوئے تھے۔ ان کو تنخواہ میں دیتی تھی۔ کوٹھی کرائے پر میں نے لی تھی اس کا ماہ بماہ کرایہ میں ادا کرتی تھی۔

سر کرنل سعید کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ میں جب اسے کراچی ملی تھی تو میرے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور میں کلفٹن میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ میں اس وقت ایک اچھے خاصے معقول سے ہوٹل میں رہائش پذیر تھی۔ میں اگر چاہتی تو ساری عمر تاج محل فلیٹز فلیش مین میں رہ سکتی تھی۔ میرے مالی وسائل اتنے اچھے تھے کہ میں نے اس کے چند ٹکوں کی خاطر تو اس کے ساتھ شادی نہیں کی۔

یہ صاحب بڑے ہی پست اخلاق کے آدمی ہیں۔ ایک دن جہلم میں میں بیمار تھی تو اس نے دوائی کے بہانے مجھے نشہ آور گولیاں لا کر کھلائیں اور بے ہوشی کے

انجکشن لگا دیئے اور اس طرح یہ شخص رات بھر میرے ساتھ زنا بالجبر کرتا رہا۔ مجھے دوسرے دن شام کو جاکر معمولی سا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے جسم کا متعلقہ حصہ انسانی سیمن SEMEN سے بری طرح سے آلودہ تھا۔ میری شلوار اتری ہوئی پائنتی کی طرف پڑی تھی اور سب بستر آلودہ تھا۔

دوسرے دن شام تک یہ میرے پاس نہ آیا۔ کیوں کہ اس کے دل میں چور تھا اور یہ مجھے فیس نہ کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگ لی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا کہ یہ اب اپنے کئے پر نادم ہے۔

مجھے اس سے سخت نفرت ہو گئی تھی میں اس کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے الگ ہونا چاہتی تھی۔

احمد صاحب جہلم ہی میں مجھے ایک حادثے کے نتیجے کے طور پر ملے۔ احمد صاحب آپ کے سامنے ہیں۔ یہ ایک عام سے فرد ہیں۔ کوئی اتنے خوبصورت بھی نہیں لیکن میں یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے اندر جو آدمی ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ تمامتر مردانہ خصوصیات کا مرقع ہے ان کی MANLY VIRTUES نے مجھے ان کا شیدائی بنا دیا ہے یہ مجھے ایک دوست تو سمجھتے تھے لیکن ایک ایسی عورت کبھی نہیں سمجھا جس سے موقع پرست مرد موقعہ میسر آنے پر فوراً جنسی آسودگی حاصل کرنے کی ٹھانتے ہیں۔ اتنے سٹرانگ نروز NERVES کا کوئی جوان آدمی میں نے نہیں دیکھا میں آپ کے سامنے اللہ پاک کی ذات کو حاضر و ناظر جان کر اور قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت کے باوجود ہمارے درمیان کبھی جنسی مواصلت نہیں ہوئی۔ ہمیشہ احمد صاحب نے خود بھی اور مجھے بھی اس حسرتناک انجام سے بچایا۔ ان کی یہی خصوصیات ہیں جن پر میں جان دیتی ہوں۔

احمد صاحب کے سمجھانے بجھانے پر میں نے کرنل سعید سے شادی کی۔ حالانکہ میں اپنے طور پر یہ شادی نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن احمد کی بات کو میں رد نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ بڑی مشکل سے یہ ایک ماہ میرے ساتھ نارمل حالات میں رہا۔ پھر اس نے تقاضا شروع کر دیا کہ میں اپنے زیورات اور جیولری

اس کو دے دوں۔ اور میرے بینک کے اکاؤنٹ میں وہ بھی میرا شریک ہو جب میں نے یہ بات ماننے سے پس و پیش کی تو اس نے مجھے بدنی سزا دینا شروع کر دی اور اکثر بیدوں سے مجھے مارتا جب اس پر بھی میں نے اس کے سامنے سرینڈر نہ کیا تو اب سے تقریباً ایک ماہ قبل اس نے اور اس کے اردلی گل شیر دونوں نے مل کر میرے ساتھ اخلاق سے نہایت گرا ہوا سلوک کیا۔

اُن کی اس بے ہودہ حرکت سے میں قطعاً ناآشنا تھی اس سے پہلے میں نے ایسی انسانیت سوز حرکت کے متعلق کسی سے نہ سنا تھا۔ میرے وہم گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ اتنا بڑا افسر اس قدر ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہے۔

ایک دن بعد دوپہر کرنل سعید اور گل شیر میرے کمرے میں آئے۔ گل شیر کے ہاتھ میں چوہوں سے بھرا ہوا ایک لوہے کا پنجرہ تھا۔

وہ پنجرہ اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ سعید کے حکم پر اس نے ٹخنوں کے پاس سے میری شلوار باندھ دی۔ سعید نے میرے دونوں ہاتھ ایک رسی سے میرے پیچھے باندھ دیئے۔ پھر مجھے کھڑا ہونے کا حکم دیا میں کھڑی ہوئی تو اس نے انتہائی بے غیرتی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک غیر مرد کے سامنے میری شلوار کھول دی۔ اور پھر گل شیر کو کہنے لگا کہ پنجرے سے ایک ایک کر کے چوہے پکڑ پکڑ کر اس کنجری کی شلوار میں ڈالتے جاؤ اس نے جونہی پنجرے میں ہاتھ ڈالا۔ چوہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ پر چوہوں کے کاٹنے اور پنجوں کی خراشیں نہایت واضح تھیں۔

اس پر کرنل سعید کو غصہ آ گیا۔ اس نے گل شیر کو کہا۔ ادھر آؤ۔ تم اس کی شلوار کو تھام کر رکھو۔ اس نے اپنے ہاتھ پر رومال لپیٹ لیا اور جلدی جلدی وہ سب چوہے میرے شلوار میں چھوڑ دیئے۔ چوہوں نے گھبرا کر اچھل کود شروع کر دی۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے میں بے بس تھی۔ رونے چلانے پر وہ لمبے لمبے خوفناک شیطانی قہقہے لگاتے اور میری بے بسی پر خوشی کا اظہار کرتے۔ ان کی یہ سزا جاری تھی کہ میں نے گل شیر کی منت سماجت کی اس کے پاؤں پکڑ کر ان پر روتے ہوئے اپنا سر رکھ دیا۔ اس کا قدرے دل پسیجا تو اس نے اتنی مدد کی کہ مجھے ڈاک کا ایک لفافہ لا کر دیا۔ میں

نے احمد صاحب کے نام خط لکھا اور وہ خط اس شخص یعنی گل شیر نے کمال مہربانی سے سپرد ڈاک کیا۔

خط پوسٹ کرنے کے دو دن کے بعد احمد صاحب یہاں پہنچ گئے اور انہوں نے اس کمرے کا تالا توڑ کر مجھے حراست سے نکالا۔ جس میں ایک ماہ سے محبوس تھی۔ اس کے بعد پھر انہوں نے جلدی سے مجھے پورے واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کیا اور احمد نے کرنل سعید اور اس کے دو ساتھیوں کو ڈرائنگ روم میں پنچ مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ تینوں وہاں گرے پڑے تھے کہ احمد ان کو وہاں بند کر کے میری طرف آگیا۔ اور میری گلو خلاصی کرائی۔

وقت بہت کم تھا میں نے جلدی سے کپڑے بدلے۔ اپنا ضروری سامان اپنے اٹیچی کیس میں بند کیا اور احمد کو ساتھ لے کر ملحقہ کوٹھی جس میں برگیڈیئر فہیم رضوی صاحب رہتے ہیں جا کر پناہ لی۔ ان کی بیگم نے مہربانی کی اور اس مشکل وقت میں ہماری مدد کی اور رضوی صاحب کو ٹیلی فون کر کے گھر بلا لیا۔ جب وہ آئے تو ان کے ساتھ ایڈجوٹنٹ جنرل صاحب اور ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز بھی تھے۔ اسی وقت میجر شاہ صاحب ملٹری پولیس کے جوانوں کو لے کر موقعہ پر پہنچ گئے۔ ورنہ کرنل سعید مجھے رضوی صاحب کی کوٹھی سے زبردستی گھسیٹ لاتا۔ اور اپنے آدمیوں سے احمد صاحب کی بری طرح پٹائی بھی کرواتا۔ لیکن اللہ کا بڑا فضل ہوا ہے اور اس کے سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور صیاد خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا۔

حضور والا۔۔۔ میں انہی گزارشات کے ساتھ اپنا بیان ختم کرتی ہوں۔ اور فاضل عدالت سے استدعا کرتی ہوں کہ میری ڈاکٹری رپورٹ پروسیڈنگز کے ساتھ EXIBIT فرمائے۔

پریذیڈنٹ: کرنل سعید آپ کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔

جی جناب۔

پوچھئے۔

حنا تم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ میں قرآن کریم پر قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ میرے احمد صاحب کے ساتھ کوئی جنسی تعلقات نہیں ہیں۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں اب بھی کہتی ہوں۔

لیکن میں نے تمہیں کئی بار احمد صاحب کے ساتھ سویا ہوا دیکھا ہے۔

یہ سراسر بہتان ہے۔ آپ بھی قرآن اٹھا کر یہ بات کریں۔ میں قرآن اٹھا کر اس کا جواب دوں گی۔

قرآن اس غرض کے لئے اللہ نے نہیں اتارا۔ کرنل سعید نے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کہا۔

پریذیڈنٹ۔ آپ دونوں یہ بات سن لیں۔ کوئی ایسا سوال پوچھیں جس کا براہ راست آپ دونوں سے تعلق ہو۔

ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

کرنل سعید۔ بس سر۔ اب میں مزید اور کوئی سوال نہیں پوچھنا چاہتا۔

پریذیڈنٹ نے زاہدہ حنا کی ڈاکٹری رپورٹ پروسیڈنگز کے ساتھ EXIBIT کر کے ان کا بیان کلوز کر دیا۔

لیڈی ڈاکٹر جس نے زاہدہ حنا کی میڈیکل کی تھی ان کے بیان صرف رہ گئے تھے۔ وہ کورٹ نے فیصلہ کیا کہ کل صبح ریکارڈ کئے جائیں گے۔ انہوں نے میجر شاہ صاحب کو حکم دیا کہ کل صبح سویرے آپ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کو یہاں لے آئیں تاکہ مقررہ وقت پر پروسیڈنگز میں افسران بالا کو دے سکوں۔

جن لوگوں کو میجر شاہ نے کوارٹر گارڈ بند کرنا تھا۔ ان کو گارڈ کی حفاظت میں کوارٹر گارڈ بھیج دیا۔ کرنل سعید کو اس کے اسکورٹ میس میں واپس لے گئے۔ اب حنا کے لئے رہنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ اور احمد وہاں ہی قیام پذیر رہے۔ وہ رات کا بہت تھوڑا حصہ سوئے ورنہ ساری رات ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

حنا نے بابا محمد شفیع کو کہہ کر ایک تھرمس چائے کا بھروا کر اپنے پاس رکھ لیا اور پھر اسے چھٹی دے دی۔

ایک دفعہ گل شیران کے پاس یہ پوچھنے کے لئے آیا کہ۔

"بیگم صاحبہ اگر بازار سے کوی چیز منگوانی ہو یا میری سروس کی ضرورت ہو تو میں یہاں ہی موجود ہوں۔"

گل شیر بہت شکریہ۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم پر خوش ہوں کہ تم نے اپنی ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے بعد آخر کار سچا بیان دے کر میری مدد کی ہے۔

بیگم صاحب۔ میں اپنے کئے پر بہت نادم ہوں۔ دراصل میں کرنل صاحب کے سب ناجائز حکم مانتا رہا جو مجھے نہیں ماننے چاہئے تھے۔

اچھا بہت شکریہ آپ کا۔ آپ آرام کریں رات زیادہ ہو گئی ہے۔

گل شیر کے چلے جانے کے بعد دو محبت کرنے والوں نے اپنا دفتر دل کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیا۔ ان چھ مہینوں میں جو کچھ بھی ان پر بیتا تھا اس سے انہوں نے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد حنا پھٹی پھٹی نظروں سے چھت کی طرف نظریں اٹھا کر رونے لگ جاتی۔ جس سے احمد کی آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔

احمد تمہارے خیال سے اس قضئے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ حنا نے احمد کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اللہ بہتر کرے گا۔ ویسے بادی النظر میں تو سعید کے بچ کر جانے کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اور مجھے اس ذلیل اور کمینے آدمی سے چھٹکارا مل جائے۔

مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا اور یہ اپنے انجام کو بھی پہنچے گا۔ تمہاری گلو خلاصی ہو جائے تو اب تم سوچ سمجھ کر اپنی مرضی سے قدم اٹھانا۔

نہیں احمد اب میں کسی مرد کی غلامی ہرگز قبول نہ کروں گی۔ یہ لوگ نظر کچھ آتے ہیں۔ اور ہوتے کچھ ہیں۔

سب دنیا تو ایک جیسی نہیں ہوتی۔ برے بھلے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تو ہمارا کام ہے۔

احمد صاحب زندگی کے فیصلے زیادہ سوچ بچار اور چھان پھٹک سے نہیں کئے جاتے۔

تو کیسے کئے جاتے ہیں۔

بس جو دل فیصلہ کرے۔ اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

حنا دل کے فیصلے جذبات کی رو میں بہہ کر اکثر کئے جاتے ہیں۔ جن کا منطقی انجام اچھا نہیں ہوتا۔

احمد۔ ابھی تو نہ جانے کیا ہو گا۔ کیا پتہ کوئی بڑا افسر اچانک کہیں سے ٹپک پڑے اور سعید کی آوٹ آف دی وے مدد کر کے اسے چھڑا لے۔ پھر یہ سارا معاملہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔

نہیں میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔ چونکہ دو تین بہت ہی سینئر جرنیل صاحبان کے ذاتی نوٹس میں یہ سب مناقشہ ہے۔ وہ سب حالات سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ احمد نے بڑے وثوق سے کہا۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔

انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا۔ مجھے اپنے اللہ پر پورا یقین ہے کہ ہم دونوں بیگناہ ہیں۔ وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔

اچھا احمد تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ اگر خدا کرے میری اس موذی آدمی سے جان چھوٹ جائے۔ تو کیا تم میرا ہاتھ تھامنے کے لئے تیار ہو گے۔۔

ارے نیک بخت وہی ڈھاک کے تین پات۔ جہاں سے چلے تھے۔ گھوم پھر کر پھر اس موڑ پر آ گئے ہیں۔ اگر میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا تو میں نے اسی وقت ہی تمہارا ہاتھ تھام لیا ہوتا۔ جب شروع میں تم نے حالات سے گھبرا کر منجدھار کی تاریک گہرائیوں سے مجھے مدد کے لئے پکارا تھا۔

کہو احمد۔ ابھی تک تمہارے حالات جوں کے توں ہیں۔

محترمہ۔ چھ ہی ماہ گزرے ہیں۔ جو آپ کو اور مجھے چھ صدیاں لگ رہے ہیں۔

تو پھر میں کیا کروں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

حضور یہ قبل از مرگ واویلا ہے۔ تحمل سے کام لیں۔ ابھی اس کیس کا جلدی بھی فیصلہ ہوا تو کم از کم ایک ماہ ضرور لگ جائے گا۔ ایک ماہ بڑی مدت ہوتی ہے۔

یہ ایک مہینہ یا جو عرصہ بھی ہوا میں تمہارے پاس رہوں گا۔ حالات و واقعات کا ساتھ ساتھ جائزہ لیتے جائیں گے اور پھر اسی کے مطابق مناسب فیصلہ کریں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔

"اچھا نیند تو نہیں آ رہی۔"

"سخت نیند آ رہی ہے۔ گزشتہ رات گاڑی میں بھی نہیں سو سکا۔"

"آؤ میری گود میں سر رکھ کر سو جاؤ۔"

کیوں مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھواتی ہو۔

کیوں ان باتوں سے آدمی پھانسی چڑھ جاتے ہیں۔

جی ہاں ناکردہ گناہوں کی بھینٹ۔

آؤ چلیں پھر سو جائیں۔

آپ جائیں میں ادھر ہی سو جاؤں گا۔ میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ سعید پابند ہو گیا ہے لیکن آپ کی اور میری نگرانی کرنے والی سینکڑوں آنکھیں کھلی ہیں۔ آپ کو ہر قدم پر محتاط ہو کر رہنا پڑے گا۔

چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارا بستر ادھر ہی لے آتی ہوں۔ لیکن پلنگ کیسے لاؤں گی۔

پلنگ کی کیا ضرورت ہے۔ میں چادر بچھا کر قالین پر سو جاؤں گا۔

نہیں حضور۔ یہاں سانپ بہت ہیں۔

اچھا تم مجھے ایک تکیہ اور ایک چادر لا دو۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔

اور پھر حنا میرے لئے تکیہ اور چادر لے آئی۔

میں نے ڈرائنگ روم کی اندر سے کنڈی لگا دی۔ ویسے مجھے بجلی کی روشنی میں نیند نہیں آتی لیکن میں نے اس خیال سے لائٹ آف نہ کی کہ اگر کوئی ہم دونو کی حرکات و سکنات کو واچ کر رہا ہے تو اسے خواہ مخواہ شک نہ گزرے۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

کسی نے دروازہ ناک کیا تو میری آنکھ کھلی۔ میں نے دل میں کہا کہ ابھی تو سویا ہوں ۔ یہ کم بخت کون ہے میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دیکھا تو بابا محمد شفیع میرے لئے بیڈ۔ ٹی (BED TEA) جسے میرا ایک دوست (BAD TEA) کہتا ہے لے کر کھڑا ہے۔ میں نے ان سے کہا۔

بابا جی یہ آپ نے کیوں تکلیف کی ہے۔ یہ بیڈ ٹی تو بڑے لوگ پیتے ہیں۔ میں تو آپ کے ساتھ کا آدمی ہوں۔

بیٹا میں تو بیڈ ٹی پیتا ہوں۔ اگر صبح اٹھ کر چائے نہ پیوں تو دن بھر مجھ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

بہت خوب بابا جی۔ اور ہم دونو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور پھر بابا محمد شفیع چائے رکھ کر چلا گیا۔

میں چائے کی گرم گرم پیالی اٹھائے قالین پر بیٹھ کر بڑے مزے سے چائے پی رہا تھا کہ حنا بھی اپنی پیالی اٹھائے ہوئے آ گئی۔

اسلام علیکم....!! حضور رات کیسے گزری۔

تمہارے بغیر جیسے گزرتی ہے ویسے ہی گزری ہے۔

مین نہ کہتی تھی۔ تمہیں کہ نیند نہ آئے گی۔ آؤ میرے کمرے میں آ کر سوؤ۔

ادھر مجھے نیند آ جاتی؟ آگ کے بستر پر بھی کبھی کسی کو نیند آئی ہے؟
اگر جذبۂ محبت سچا ہو تو آگ کا بستر بھی پھولوں کی سیج بن جاتا ہے۔
وہ سچے لوگوں کے لئے، حق کی راہوں پر چلنے والوں کے لئے۔
کیا آپ کا جذبہ محبت سچا نہیں ہے؟
یہ جذبہ میری اپنی ذات تک محدود ہے۔ جو میرے نفس امارہ کی پیروی کرتا ہے۔ سچا کہاں ہو گا۔

میں نے تم سے بار ہا کہا کہ میرے سامنے تم یہ فلسفیانہ گفتگو مت کیا کرو سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔ تمہاری یہ الٹی سیدھی باتیں فوج والوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اسی لئے انہوں نے تمہیں کارنر کیا ہوا ہے۔ اور تم نے کوئی ترقی نہیں کی۔

نہیں محترمہ.....!! میں اسی کیلئے بر(CALIBRE) کا آدمی ہوں۔ کوئی ایکسٹرا آرڈنری ذہین و فطین نہیں۔ فوج میں بڑے بڑے قابل لوگ ہیں جو اب تک نچلے رینکس میں ملازمت کر رہے ہیں۔ مجھ سے وہ بدرجہا بہتر ہیں۔
چلو ٹھیک ہے مان لیتی ہوں تمہاری بات۔
اب کیا پروگرام ہے.....؟
ابھی تو میں بیڈ (Bed) ٹی پی کر سوتا ہوں۔ جسم ابھی ہلکا نہیں ہوا۔
حضور اگر اجازت دیں تو مٹھی بھر دوں۔
کیوں گنہگار کرتی ہو۔ تم محلوں میں رہنے والی ایک خاک نشین پر صرف نظر کرم ہی رکھو تو کافی ہے۔
چھوڑو احمد اس بات کو۔ ہر پھر کر بات پھر اسی موضوع پر پہنچ جاتی ہے جس سے تم الرجک ہو۔
نہیں محترمہ میں الرجک نہیں ہوں۔ کاش میں تمہاری بات ماننے کے قابل ہوتا۔ اچھا بھئی تم بھی جا کر سو جاؤ۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔
میں تو اب تم سے باتیں کروں گی۔
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور چادر لے کر سو گیا۔
حنا نے ایک دو دفعہ چادر مجھ سے کھینچ لی لیکن میری منت سماجت کرنے پر

مان گئی۔ چادر مجھے دے دی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔ اور میں دس بجے تک سوتا رہا۔

وہ دن ہم نے چھٹی کا گزارا کسی طرف سے ہمیں کوئی بلاوا نہ آیا۔ دن بھر بیٹھے مزے سے چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

دوپہر کے کھانے پر جب بریگیڈیئر فہیم صاحب گھر آئے تو حنا نے ان سے جا کر گزارش کی۔

سر......! سعید کو تو اب کلوز اریسٹ کر کے لئے گئے ہیں۔ جنرل صاحب نے اسی کی وجہ سے ہمارا ٹیلی فون بند کروایا تھا۔ آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ جنرل صاحب سے کہہ کر ہمارا ٹیلی فون ریسٹور کروا دیں۔

اچھا بہن میں جا کر جنرل صاحب سے گزارش کرونگا۔

بہت شکریہ آپ کا۔

اور پھر حنا اٹھ کر نازیہ سے باتیں کرنے لگ گئی۔

وہ تھوڑی دیر اکٹھی بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ پھر حنا نازیہ سے اجازت لے کر واپس اپنے گھر آ گئی۔

کیوں حنا آپ کہاں گئی تھیں۔

میں بریگیڈیئر فہیم صاحب کے پاس گئی تھی کہ وہ جنرل صاحب سے کہہ کر ہمارا ٹیلی فون ریسٹور کروا دیں۔

انہوں نے کیا کہا۔

کہا تو ہے آج ہی ہو جائے گا۔

چھوڑو ٹیلی فون ریسٹور ہو گیا تو اور زیادہ بادریشن ہو گی۔

ارے بھئی سہولت بھی تو زیادہ ہو گی۔

سعید صاحب بھی تو تم سے بات چیت کر سکیں گے۔

قسم ہے جو اس ملعون سے بات کروں تو۔

آج مجھے بھی میرے ڈائریکٹوریٹ والے کسی یونٹ کے ساتھ اٹیچ کر دیں

گے۔

آپ سے ڈیوٹی بھی لیں گے۔

یونیفارم میرے پاس نہیں ہے۔ اب مجھے دو تین دن کی چھٹی لے کر لاہور جانا پڑے گا۔ تاکہ اپنی یونیفارم اور دوسرا ضروری سامان لا سکوں۔۔

بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ لاہور جاؤں گی۔ کم از کم ایک دن تو فلیٹیز میں رہیں ۔گے۔ انار کلی کا چکر لگائیں گے۔

احمد تم نے اللہ یار خان کا مجھے نہیں بتایا۔ وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔

حنا تمہاری شادی ہو گئی۔ تو اللہ یار خان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ بس ایک ہی بات کہتا۔ "صاب جی سوہنی کبوتری اڈ گئی اے۔" اب میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اللہ یار کو جا کر ملوں گی۔ تم اس سے کہنا۔ اللہ یار خان سوہنی کبوتری کو میں تمہارے لئے پکڑ کر لے آیا ہوں۔"

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

دوسرے دن صبح کرنل رضوان نے لیڈی ڈاکٹر فرزانہ صاحبہ کے بیان قلمبند کئے اور کاغذات مکمل کر کے جنرل حمید صاحب کو دے دیئے۔ جنرل صاحب نے جج ایڈووکیٹ جنرل کو ٹیلی فون کیا کہ میں آپ کو ایک سمری آف ایوی ڈینس بھیج رہا ہوں۔ کسی سینئر آفیسر کو یہ دیں اور ان کو کہیں کہ وہ اسے دو گھنٹے میں دیکھ لیں۔ پھر آپ اس آفیسر کو لے کر میرے پاس آئیں۔ اب آٹھ بجے ہیں۔ آپ لوگ دس بجے آ جائیں۔ میں لاگ ایریا کمانڈر کو بھی یہاں ہی بلوا لوں گا۔ سب بیٹھ کر ڈسکس کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ کورٹ مارشل کنوین کرنے کا آرڈر آج ہی آؤٹ ہو جائے۔ اور یہ کیس ایک ہفتہ میں ختم ہو جائے۔۔

بہتر سر.......!!!

جج ایڈووکیٹ جنرل ۔ ان کے سینئر لیگل آفیسر اور لاگ ایریا کمانڈر دس بجے جنرل صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ چائے آ گئی۔ چائے پینے کے بعد جنرل صاحب نے JAG سے پوچھا۔

سمری آف ایوی ڈینس آپ نے دیکھی ہے۔

سر میں نے جستہ جستہ دیکھی ہے۔ خورشید صاحب کو میں نے دی تھی۔ یہ اسے تھارولی Thoroughly دیکھ کر آئے ہیں۔

اچھا کرنل خورشید یہ بتایئے اس سمری آف ایوی ڈینس کی سب کاروائی

قاعدے قانون کے مطابق ٹھیک ہوئی ہے۔

سر ٹھیک ہوئی ہے۔

اس میں کوئی سقم تو نہیں۔

کوئی خاص نہیں۔

اس کا فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کنوین ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے سر۔

دیکھ لیجئے۔ ملزمان کو سول سے وکلاء انگیج کرنے کی اجازت ہو گی۔ آپ کا میاں محمود علی قصوری صاحب سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ بروہی صاحب سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔

سر....!! ملزمان جس کو چاہیں۔ بے شک انگیج کر لیں۔ کیس کنوکشن Conviction والا ہے۔

کرنل خورشید یہ کیس فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے سامنے آپ ہی کنڈکٹ کریں گے؟

سر۔ میں ہی کروں گا۔ تیاری کے لئے کم از کم ایک ہفتہ درکار ہو گا۔

ٹھیک ہے آپ کو کافی ٹائم ملے گا۔

بریگیڈیئر کورٹ کی تشکیل آپ کر لیں۔ قانون کے ماہر افسران کا آپ انتخاب کر لیں۔ اگر لاگ ایریا کی جورسڈیکشن Jurisdiction سے باہر ہوں تو مجھے بتا دیں ہم یہاں سے کنوینگ آرڈر نکال دیں گے۔

نہیں سر--- ہمارے پاس اس سٹیشن پر ایک بڑا اچھا لیگلی کوالیفائیڈ لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ دو میجر بھی ایل ایل بی ہیں۔ میں انہیں ڈیٹیل کر دوں گا۔

ٹھیک ہے۔ آپ بھی اس دن وہاں ایک آدھ چکر لگا لیں۔

یہ کورٹ کہاں کنوین ہو گا۔

سر--- لاگ ایریا میں کریں گے۔

ٹھیک ہے۔ گو اہیڈ۔ (Go ahead)

جب یہ سب باتیں طے ہو گئیں تو سب نے ایک ایک کپ چائے کا پیا اور

پھر اپنے اپنے دفتروں کو چلے گئے۔ بریگیڈیئر ملک صاحب جاتے وقت سب کاغذات اپنے ساتھ لے گئے۔ اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا کر انہوں نے لاگ ایریا کے لاء آفیسر کو بلایا۔ سمری آف ایوی ڈینس دکھائی۔ انہوں نے بریگیڈیئر صاحب کو بتایا کہ آپ کی پاور میں فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کنوین کرنا نہیں ہے۔ یہ جنرل ہیڈ کوارٹر ہی کنوین کرے گا۔

بریگیڈیئر ملک نے ایڈجوٹنٹ جنرل صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی انہوں نے ان کو کہا کہ میں J A G سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔J A G نے جنرل صاحب کو بتایا کہ ان کی یہ بات ٹھیک ہے اس کا کنوینگ آرڈر جی ایچ کیو سے ہی جاری ہو گا۔ بریگیڈیئر ملک کو اے جی صاحب نے کہا کہ آپ وہ سب کاغذات جوں کے توں واپس بھجوا دیں۔ اور ساتھ ہی ان آفیسرز اور ان کی یونٹوں کے نام بھی لکھ بھیجیں۔ تاکہ آج کنوینگ آرڈر اشوع ہو جائے۔

فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے انعقاد کا فیصلہ ہو گیا۔ مندرجہ ذیل افسران کورٹ کے ممبران ڈیٹیل ہوئے۔

۱...... لیفٹیننٹ کرنل حسن اختر ------ پنجاب رجمنٹ۔

۲...... میجر محمد شریف ---- آرمرڈ کور۔

۳..... میجر سرفراز علی ---- بلوچ رجمنٹ۔

کورٹ آج سے دس دن بعد جی ایچ کیو لائبریری میں کنوین ہو گا۔

سب ملزمان اور گواہان کو میجر ایم اے شاہ ملٹری پولیس مقررہ تاریخ پر ساڑھے سات بجے جی ایچ کیو لائبریری میں حاضر کرنے کا بندوبست کریں گے۔

O

مقررہ تاریخ پر جی ایچ کیو میں فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کنوین ہوا۔ تقریباً دس دن تک کورٹ کی کاروائی جاری رہی۔ کرنل سعید نے اپنے لئے سول سے کوئی وکیل نہ منگوایا۔ بلکہ اپنا کیس خود ہی ڈیفینڈ کیا۔ شاید وہ اس کیس کو سیریس نہ لے رہے تھے۔ چونکہ ان کا کوئی لیگل بیک گراؤنڈ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے جس طرح سمری آف ایوی ڈینس کے وقت رویہ اختیار کیا تھا اب بھی ان کا وہی رویہ رہا۔ کسی ملزم کی طرف سے گواہان پر کوئی معقول جرح نہ کی گئی۔

کورٹ کی راہنمائی کے لئے جج ایڈووکیٹ جنرل برانچ کا ایک افسر اس پوری سماعت کے دوران وہاں موجود رہا۔ کورٹ نے بڑے غور و خوص کے بعد اس کیس کا مندرجہ ذیل فیصلہ کیا۔

۱.... پی اے لیفٹیننٹ کرنل سعید احمد اے ایم سی۔

(ا) دس سال قید سخت۔

(ب) ڈسمسل فرام آرمی سروس۔

۲..... لانس نائیک علی حسین اے ایم سی۔

(ا) سات سال قید سخت۔

(ب) ڈسمسل فرام آرمی سروس۔

۳.... سپاہی علی محمد۔ اے ایم سی۔

ا) سات سال قید سخت

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۴ ..... سپاہی گل شیر اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۵ ..... حوالدار فتح محمد اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۶...... سپاہی محمد افضل ۔ اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۷ ..... سپاہی شیر محمد۔ اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۸ ...... سپاہی طارق علی۔ اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمس فرام آرمی سروس۔

۹......سپاہی حق نواز۔ اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمسل فرام آرمی سروس۔

۱۰...... سپاہی حسن محمد۔ اے ایم سی۔

(ا) دو سال قید سخت۔

(ب) ڈسمسل فرام آرمی سروس۔

مندرجہ بالا سب سزائیں سول جیل میں کاٹی جائیں گی۔

کلوز اریسٹ کا پریڈ سزا میں شمار کیا جائے گا۔

جب پریذیڈنٹ یہ فیصلہ سنا چکے تو انہوں نے ملٹری پولیس کے آفیسر انچارج کو حکم دیا کہ ان سب آدمیوں کو اپنی کسٹڈی میں لے لو۔

دیکھتے ہی دیکھتے کرنل سعید پر شدید دل کا دورہ پڑا اور وہ گر گیا۔ پاس کھڑے ہوئے آدمیوں نے اسے اٹھایا لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ایمبولینس منگوائی گئی۔ اور گارڈ کی نگرانی میں اسے فوجی ہسپتال بھیج دیا گیا۔ دل کا دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے راہ ہی میں جان دے دی۔

جب ہسپتال میں اسے سٹریچر پر ڈال کر نیچے اتارا گیا تو اس وقت تک وہ فوت ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ اپنے حسرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ گارڈ کمانڈر ہسپتال والوں سے کرنل سعید کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ لے کر واپس آ گیا۔ اور وہ سرٹیفکیٹ کورٹ کے پریذیڈنٹ صاحب کو دے دیا گیا۔

○

کرنل سعید اپنی زندگی کی کٹھن منزل طے کر کے اپنے آخری سفر کی تیاری کے لئے مارچری میں ایک لکڑی کے تختے پر پڑا تھا۔ آدمی زندگی بھر کتنی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے لیکن اس کا انجام کتنا حسرتناک ہوتا ہے۔ کیا دوست کیا دشمن سب اس اندوہناک سانحہ پر کس قدر رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور مرنے والا ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر لواحقین کی امداد کا محتاج نظر آتا ہے کہ وہ اسے جلد از جلد ایک اجلے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی ابدی ماں (قبر) کی گود میں جا کر سلا دیں۔ آگے کا حال اللہ پاک کی ذات بہتر جانتی ہے۔

آج زاہدہ حنا اور سعید کے دکھوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ حنا دل میں سوچنے لگی۔ سعید جیسا بھی تھا مجھ سے منسلک تو تھا۔ ہم ایک دوسرے کی پہچان تھے۔ نیک بخت آدمی کو لالچ نے مار دیا۔ اس کی نظر میں آدمی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ چمکتے ہوئے ہیرے جواہرات اس کی نظر میں آدمی اور اس کی آدمیت سے زیادہ قیمتی تھے۔ بھلے مانس آدمی اس دو دن کی زندگی کے لئے تو کتنے الٹے سیدھے کام کرتا تھا۔ یہ سونا یہ ہیرے جواہرات اگر تو مجھ سے محبت کے نذرانے کے طور پر مانگتا تو میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تمہیں دے دیتی۔ لیکن ان کے حصول کے لئے تم نے کتنے غیر انسانی رویئے اختیار کئے۔ خدا تمہیں بخشے تم نے مجھ پر تو جو مظالم ڈھائے ہیں میں تو خدا کے واسطے تمہیں معاف کرتی ہوں اور تمہاری مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔

حنا سوچوں کے اس بھنور میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"میں زاہدہ حنا بول رہی ہوں۔"

محترمہ میں جنرل حمید صاحب کا سٹاف آفیسر بول رہا ہوں۔ جنرل صاحب آپ کے ہسبنڈ کی اچانک موت پر بے حد افسوس کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اور کچھ اور جنرل صاحبان آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہم آ جائیں۔

جناب ان کی بڑی مہربانی ۔ میں اب ہسپتال جا رہی ہوں۔ تا کہ ان سے میت لے کر اس کے کفن دفن کا انتظام کر سکوں۔

اچھا محترمہ۔ آپ دو منٹ ہولڈ آن کریں۔

بہتر۔

محترمہ جنرل صاحب فرما رہے ہیں میں نے یونٹ والوں کو آرڈر دے دیا ہے وہ میت ہسپتال سے حاصل کر کے غسل وغیرہ کا اور کفن دفن کا سارا انتظام کریں گے۔ ان کا جنازہ یہاں سے ہی اٹھایا جائے گا۔ شام کو چار بجے نماز جنازہ ہو گی۔ اس کے بعد ان کو وہاں ہی فوجی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا جائے گا۔

اچھا جناب ۔ آپ جنرل صاحب کا شکریہ ادا کر دیں۔ ٹھیک ہے میں گھر پر ہی رہوں گی۔ جو صاحبان بھی آنا چاہیں بسرو چشم آئیں۔

شکریہ۔

حنا صاحبہ نے صوبیدار میجر فتح علی خان صاحب کو ٹیلی فون کیا کہ مہربانی سے دو شریف سے سپاہی ہماری کوٹھی پر بھیج دیں جو دس بجے رات تک یہاں رہیں گے۔

"بہتر بیگم صاحبہ۔"

صوبیدار میجر فتح علی خان نے بڑی نیاز مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں دو سپاہی آ گئے۔ حنا نے ان سے ڈرائنگ روم ٹھیک کروایا۔ اور پھر ایک آدمی کو بابا محمد شفیع کی امداد کے لئے اس کے حوالے کر دیا۔ ابھی وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ جی ایچ کیو کے بہت سے آفیسرز جن میں زیادہ تعداد سینئر افسران کی تھی۔ وہاں پہنچ گئے۔ حنا نے ان سب کا استقبال کیا سب نے کرنل سعید کی اچانک موت پر

حنا کے پاس تعزیت کی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھے۔ چائے پی اور پھر واپس چلے گئے۔

دو بجے کے قریب صوبیدار میجر فتح علی خان' کرنل سعید کی میت کو ایک ایمبولینس گاڑی میں رکھ کر لے آیا۔ اس کے ساتھ پندرہ بیس فوجی سفید کپڑوں میں ملبوس اور ان کی یونٹ کے مولوی صاحب ایک الگ تھری ٹن لاری میں آ گئے۔ میت کو ایمبولینس سے اتار کر ایک کھلے کمرے میں رکھا گیا۔ وہاں قالینوں پر بیٹھ کر مولوی صاحب اور ان فوجی سپاہیوں نے ختم قرآن کا اہتمام کیا۔ تین بجے تک ختم شریف مکمل ہو گیا۔ مولوی صاحب اور دوسرے حاضرین نے میت کے ایصال ثواب کے لئے دعا مانگی۔

اس کے تھوڑی دیر کے بعد کرنل سعید کی پوری یونٹ وہاں پہنچ گئی۔ تقریباً پونے چار بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ وہاں سے قریب ہی ایک کھلے گراؤنڈ میں نماز جنازہ ہوئی۔ اے ایم سی اور جی ایچ کیو کے تقریباً سب افسران نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ ساڑھے چار بجے نماز جنازہ سے فارغ ہو کر میت کو فوجی قبرستان میں دفن کرنے کے لئے لے گئے۔ جہاں مرحوم کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔۔

ان تمام مرحلوں پر حنا ساتھ ساتھ رہی۔ ساڑھے پانچ بجے وہ اپنی کوٹھی پر واپس آ گئی۔ اور پھر تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ تین چار روز کے بعد یہ سلسلہ کچھ کم ہوا۔ تو ایک دن جنرل حمید صاحب بمع بیگم کے حنا کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ حنا نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کی۔ بیگم حمید صاحبہ نے حنا سے کہا۔

بیٹی آپ کے خاوند کی اچانک موت پر بے حد صدمہ ہوا ہے۔ اللہ پاک ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی طاقت دے۔ (آمین)

شکریہ۔ بیگم صاحبہ۔

بیٹی اب آپ کا آئندہ کے لئے کیا پروگرام ہے۔ جنرل حمید صاحب نے پوچھا۔

سر میرا ارادہ ہے کہ میں تین چار دن کے بعد احمد صاحب کے ساتھ لاہور شفٹ کر جاؤں۔ وہاں آنے والے دنوں کا پروگرام بناؤں گی۔

نہیں بیٹی۔ وہاں کیوں شفٹ ہوتی ہیں۔ آپ سعید صاحب کی

ڈیوز (DUES) لینے تک یہاں ہی قیام کریں۔

نہیں سر....!! میں سعید کے ڈیوز نہیں لوں گی۔

اس کا اور وارث کون ہے۔

یہاں پاکستان میں تو کوئی نہیں۔ البتہ بھارت میں ان کے والد ہیں۔

نہیں بیٹی۔ قانونی اور شرعی وارث آپ ہی ہیں۔ آپ کا حق فائق ہے۔

سر میں ان پیسوں کو لے کر کیا کروں گی۔ میرا ضمیر ساری زندگی مجھے کوستا رہے گا۔ جیتے جی جس شخص کو میں اچھا نہ سمجھتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد میں اس آدمی کے بقایا جات کیسے وصول کر سکتی ہوں۔

تو بیٹی اس رقم کا کیا ڈسپوزل ہو گا۔

سر آپ فوجی شہیدوں کی بیواؤں اور بچوں کی بھلائی پر خرچ کر دیں۔

ہاں آپ کی یہ تجویز ٹھیک ہے۔ تو بیٹی میں متعلقہ افسران کو کہوں گا۔ وہ آپ سے ایک سرٹیفکیٹ دستخط کروالیں۔

ہاں سر۔ بے شک کروالیں۔

تو بیٹی آپ عدت پوری ہونے پر احمد صاحب کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں۔

سر۔۔ اگر احمد صاحب میرے ساتھ شادی کر لیتے تو اتنا یہ جھنجھٹ نہ کھڑا ہوتا۔ وہ میرے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔

تو آپ کے آپس میں کیا تعلقات ہیں۔

سر ہم دونو ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اچھا بھئی آپ کی مرضی۔

سر میں آخری بار احمد صاحب سے پوچھوں گی کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لیں۔ اگر انہوں نے کر لی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں واپس انڈیا چلی جاؤں گی۔

انڈیا میں آپ کا کون ہے۔

سر میری ماں ریٹائرڈ پرنسپل ہیں۔ میرے والد نواب سعادت علی خان

نوابان اودھ میں سے ہیں۔ لکھنؤ کے قریب ہماری بہت بڑی جاگیر ہے۔ میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔

تو آپ ماں باپ کو چھوڑ کر اکیلی کیسے پاکستان آگئیں۔

سر میری ماں بمبئی کے ایک گرلز کالج سے ابھی ریٹائرڈ ہوئی ہی تھیں کہ فسادات شروع ہو گئے۔ وہ ایک دن بازار گئیں۔ پھر لوٹ کر نہ آئیں۔ میں نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملیں۔ پورے ہندوستان میں فسادات زوروں پر تھے اس لئے میں ڈر کے مارے لکھنؤ نہ جا سکی اور اس طرح کراچی آگئی۔

احمد کو آپ کے ساتھ شادی کرنے میں کیا تامل ہے۔

سر دراصل بات یہ ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اس کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ ان پر ظلم ہو گا۔

بات تو بیٹی ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ صاحب معقول آدمی ہیں۔ اچھا بیٹی ہمیں اجازت دیں ہم جاتے ہیں۔

سر آپ کی بڑی نوازش۔ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے اس کیس میں میری بڑی مدد کی۔

نہیں بیٹی آپ ایک بے آسرا خاتون تھیں۔ پھر سعید نے حد سے زیادہ آپ پر ظلم روا رکھے۔ یہ میرا فرض تھا۔ جو کچھ میں نے کیا۔

سر آپ کی بندہ پروری ہے۔

جنرل حمید اور ان کی بیگم اٹھ کھڑے ہوئے۔ حنا ان کو مین گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ گیٹ پر تھوڑا رکے تو حنا کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے جنرل صاحب سے پوچھ ہی لیا۔

سر میں تو ابھی دو چار دن میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کرنل سعید کے سامان کی ڈسپوزل کا کیا ہو گا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔

بیٹی یہ سب سامان آپ کا ہے۔ جس طرح سے چاہیں اسے ڈسپوز کر لیں۔

نہیں سر میں یہ سامان نہیں لینا چاہتی۔

تو احمد صاحب کو دے دیں۔ وہ لے لیں۔

سر وہ بھی نہیں لیں گے۔

آپ کی نہ لینے کی وجہ تو سمجھ آ سکتی ہے لیکن انہیں کیا تکلیف ہے۔

نہیں سر وہ یہ بات نہیں مانیں گے۔

کیوں وہ گھر سے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔

نہیں اتنے بڑے بھی نہیں ۔ لیکن حریص آدمی نہیں۔ اگر ایسے ہوتے تو شروع ہی میں مجھ سے شادی کر کے کروڑوں روپوں کے مالک بن جاتے۔ اگر آپ کہیں تو میں ان سے بات کر لیتا ہوں۔

نہیں سر آپ بات نہ کریں۔ وہ یہ بات نہیں مانیں گے۔ اور آپ کو خواہ مخواہ کوفت ہو گی۔

نہیں بیٹی کوفت کی کیا بات ہے۔ اگر اس نے نہ مانا تو پھر میں بریگیڈیئر فہیم صاحب کو کہہ کر یہ سامان ڈسپوز کروا دوں گا۔

ٹھیک ہے سر۔

تو آپ احمد صاحب کو بلوا لیں۔ میں ان سے پوچھ لیتا ہوں۔

اچھا سر۔۔۔ آپ آیئے برآمدے میں کرسیوں پر تشریف رکھیں۔ میں ان کو بلا کر لے آتی ہوں۔

وہ کہاں ہیں۔

ادھر ہی ہیں۔ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے ہیں۔

اچھا۔ بلوایئے۔

حنا گئی تو احمد ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اس کو جگا کر بتایا کہ ایڈجوٹینٹ جنرل صاحب تشریف لائے ہیں۔ اب واپس جا رہے ہیں تمہیں بلا رہے ہیں۔

اچھا میں منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے ابھی آیا۔ تقریباً پانچ منٹ میں احمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے جاتے ہی سلام کیا۔

آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ حنا چونکہ دو چار روز میں یہاں سے چلی جائیں گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کرنل سعید کا سب سامان ایک دو دن میں

ڈسپوز کر دیں۔

سر۔ از راہ کرم یہ کام آپ ان کی یونٹ کے صوبیدار میجر صاحب کے سپرد کریں۔

وہ تو بیٹا میں کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سامان میں سے جو بھی اپنے لئے لے جانا چاہیں۔ وہ پہلے لے لیں۔ بعد میں جو سامان بچے گا وہ یونٹ والے ڈسپوز کر دیں گے۔

سر میں نے یہ سامان لے کر کیا کرنا ہے۔ میں ایک غریب گھر کا فرد ہوں۔ ہماری ضروریات نہایت محدود ہوتی ہیں۔ کسی لمبی چوڑی چیز کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی۔

بیٹے۔۔ قالین، صوفے، الماریاں، کپڑے، کراکری، اور فرنیچر وغیرہ ہے۔ آپ پہلے اپنے لئے سیلیکٹ کر لیں۔ بعد میں جو سامان بچ جائے گا وہ یونٹ والے لے جائیں گے۔

نہیں سر مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ چند چیزیں میں بابا محمد شفیع کو کہوں گا وہ لے جائے۔

بابا محمد شفیع کون ہے۔

سر کرنل صاحب کا کک تھا۔

ہاں ٹھیک ہے۔

میں حنا کو کہوں گا وہ کار آپ کو دے دے۔

سر۔ آپ کی بڑی نوازش ۔ میں معمولی سٹیٹس کا آدمی ہوں۔ مجھے کار کی کیا ضرورت ہے۔ اور کار کرنل سعید صاحب کی تھی بھی نہیں۔ وہ تو حنا نے اپنے پیسوں سے خریدی تھی۔ کرنل سعید صاحب تو اپنی تنخواہ بینک سے نکلواتے ہی نہ تھے گھر کے سب اخراجات حنا برداشت کرتی تھی۔

حنا کی آمدنی کے کیا ذریعے تھے۔

سر یہ جب انڈیا سے آئی تھیں تو اپنے ساتھ ہیرے جواہرات، زیورات اور بہت سی نقدی لائی تھیں۔ وہی خرچ کر رہی ہیں۔

تو یہ اچھا نہیں ہے کہ وہ سب آپ کو مل جائے۔
نہیں سر میری غیرت یہ قبول نہیں کر سکتی۔
اچھا میاں۔ آپ کی مرضی۔
اور پھر جنرل صاحب اور ان کی بیگم اجازت لے کر واپس اپنی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

حنا اور احمد اٹھ کر اندر کمرے میں آ گئے۔ اب بھی وہ احمد سے پہلے کی طرح پیار کرتی تھی لیکن آئے دن کی ٹھوکروں نے اب اس کو محتاط کر دیا تھا۔ اب وہ رات کی تنہائیوں میں بھی احمد کے ساتھ لیٹ کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے سے گھبراتی تھی۔ اگرچہ ایسا کرنے کو اس کا جی چاہتا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکتی تھی۔ وہ یوں سمجھتی جیسے مکانوں کی دیواریں بھی ان کی چغلی کھانے لگیں گی۔

آج کرنل سعید کو مرے ہوئے تیسرا دن تھا۔ احمد لاہور واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ حنا اس سے بار بار اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ ابھی آپ چند روز اور رہیں۔ میں یہاں کے کام نمٹا لوں تو پھر اکٹھے چلے جائیں گے۔ لیکن احمد یہ بات نہ مانتا تھا۔

حنا میں چلتا ہوں ـ تم جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ گی تو آ جانا۔

تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ میں لاہور پہنچ گئی ہوں۔

دفتری اوقات کے بعد ہمارے دفتر میں آپ فون کر کے ڈیوٹی کلرک کو بتا

دیں۔ وہ مجھے اطلاع کر دے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

چلو ٹھیک ہے۔ کل چلے جانا۔ بلکہ میں کار پر تمہیں چھوڑ کر آؤں گی۔

نہیں حنا اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں آرام سے ریل گاڑی سے چلا جاؤں گا۔

ایک دن تمہارے ساتھ اور کمپنی رہتی۔

حنا۔ یہ ایک دن بہت تھوڑا ہے۔ اگر ایک سو سال بھی ہم اکٹھے رہیں تو یہ چاہت کی آگ تو ٹھنڈی نہ ہو گی۔

ہاں یہ تو تمہارا کہنا صحیح ہے۔ یہ آگ تو جنسی مواصلت کے بغیر ٹھنڈی نہیں ہوتی اور تمہیں اس سے اجتناب ہے۔

حنا پھول دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ نہ کہ توڑنے کے لئے۔

حضور نئے سرے سے الف بے نہ پڑھانی شروع کر دیں۔ میں آپ کو ترغیب نہیں دے رہی۔ آپ اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ میں اپنی جگہ پر قائم ہوں۔

اس لئے تو یہ نبھتی چلی آ رہی ہے۔ ورنہ ہم کب کے ایک دوسرے کو بھول گئے ہوتے۔ اور اگر کبھی یاد بھی آتی تو یوں لگتا جیسے دو اجنبی تھوڑی دیر کے لئے ہمسفر رہے ہوں اور پھر الگ ہو کر اپنی اپنی راہوں پر چل نکلے ہوں۔

اچھا مجنوں صاحب۔ سچ مچ کی دنیا کی طرف لوٹئے میری بات سنئے۔

جی ارشاد۔ یہ غلام گوش بر آواز ہے۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گی۔

میں ابھی تو اپنا مومنٹ آرڈر لینے کے لئے جاتا ہوں۔ واپس آ کر صحیح صورت حال کا علم ہو گا۔

احمد نے وہاں سے اپنے ڈائریکٹوریٹ کے ہیڈ کلرک کو ٹیلی فون کیا وہ احمد کے ساتھ کے تھے۔

صوبیدار میجر۔ حسن جاوید۔

جاوید !! میں احمد بول رہا ہوں۔

یار احمد تمہارا سنا ہے کہ کسی کام سے یہاں آئے تھے اور کسی کیس میں

گواہ کے طور پر تمہیں روک لیا گیا ہے........؟

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔

تو آ جاؤ نا۔ ذرا گپ شپ کریں گے۔

مجھے یار آج رات کی گاڑی سے واپس لاہور جانا ہے۔ تم میرا مومنٹ آرڈر اور ریلوے وارنٹ مجھے بھجوا دو۔

بھئی یہ تو ڈائریکٹر صاحب سے پوچھنا پڑے گا۔

تو پوچھ لو نا۔ یہ کیا مشکل ہے۔

تم کہاں سے بول رہے ہو۔

میں کوٹھی نمبر ۳۱۴ ہسپتال روڈ سے بول رہا ہوں۔

یہ کس کی کوٹھی ہے۔

کرنل سعید کی۔

وہ جس کا اگلے دن ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔

جی ہاں۔

تم وہاں کیا کر رہے ہو۔

بھئی میں انہی سے ملنے آیا تھا۔

یار میں نے سنا ہے تم نے گواہی بھی اسی بیچارے کرنل کے خلاف دی ہے۔

تم بھی بیچارے ہو۔

اس کرنل سے تمہارا کیا رشتہ تھا۔

چھوڑو یار فضول باتیں۔ جا کر ڈائریکٹر صاحب سے پوچھ کر میرا موومنٹ آرڈر نکالو اور مجھے یہاں بھجوا دینا۔

بہت اچھا حضور۔ کہیں میری ہجو نہ لکھ دینا۔

شام کو احمد کو موومنٹ آرڈر مل گیا۔ حنا نے دیکھا تو بہت ہی رنجیدہ خاطر ہوئی۔ اور جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے کھڑکی کے باہر دور خلاؤں میں تیرتے ہوئے بادل کے آوارہ ٹکڑوں کو دیکھتی رہی۔ احمد کے پاؤں کی چاپ سنی تو پہلو

بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ احمد نے حنا کے کندھوں کو جھنجھوڑا۔ لیکن حنا اسی طرح ساکت پڑی رہی۔

کیوں حنا خیریت تو ہے۔

وہ کچھ نہ بولی۔

احمد نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسکا منہ اوپر کیا۔ احمد نے دیکھا حنا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

کیوں حنا خیریت تو ہے؟

تمہاری بلا سے۔

تم پر پھر یہ کیوں دورے پڑنے لگ گئے ہیں۔

احمد تمہاری یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ تم کسی آدمی کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتے۔

حنا ۔ ہر آدمی کے اپنے دکھ ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہیں سینے سے لگائے۔ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ حنا آج کل کسے اتنی فرصت کہ وہ دوسروں کو کریدتا پھرے۔ معمولی سی بات بھی ہو تو تم اسے اپنے اوپر طاری کر لیتی ہو۔

احمد تم تو بڑے کٹھور ہو۔ تم پر تو بڑے سے بڑا کوئی حادثہ بھی اثر نہیں کرتا۔ تم ہر موقع پر تپتے ہوئے صحراؤں میں مجھے مصیبتیں اور ذلتیں سہنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہو۔

حنا میں نے بارہا بتایا ہے اور تمہیں یہ بات اچھی طرح پتہ بھی ہے کہ میرا سوسائٹی میں کوئی مقام نہیں ہے۔ میں ان بڑے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لائق نہیں۔ اب تک ہم دونو پر جتنی مصیبتیں آئی ہیں یہ اسی لئے آئی ہیں کہ میں گندی نالی میں رینگنے والا ایک کیڑا ہوں جس سے کوئی آدمی بھی نہیں ڈرتا۔

اچھا میاں جاؤ۔ تم خوش رہو۔ مجھ پر جیسا بھی وقت آن پڑا گزار لوں گی۔

اچھا تم بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں۔

خدا کے لئے احمد بار بار یہ بات مجھ سے مت پوچھو۔ تمہیں پتہ

میرے دکھوں کا مداوا کیا ہے۔

وہی ڈھاک کے تین پات۔ آج سے دو سال پہلے ہم جس مقام سے چلے تھے۔ گھوم پھر کر پھر اسی جگہ پر آ گئے ہیں۔

اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ہم دونو یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے مر گئے ہیں۔ اس نام کا کوئی آدمی میری زندگی میں کبھی نہیں آیا اور تم بھی سمجھ لینا کہ حنا نام کی ایک عورت تھی جو مر گئی ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئی ہے۔

احمد کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے اپنا سامان اٹھا کر وہ آخری بار حنا کے پاس اس کے کمرے میں آیا۔ حنا بدستور دیوار کی طرف منہ کر کے سسکیاں لے رہی تھی اس نے روتے ہوئے حنا سے کہا۔

اچھا حنا۔ خدا حافظ۔ میں تو اب جا رہا ہوں۔

حنا نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ بدستور اپنے غموں کے بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی تھی۔ احمد دل شکستگی کے عالم میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے میں آ کر رک گیا اور پلٹ کر ایک نظر حنا کو دیکھا۔ حنا ابھی تک دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ احمد دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ گاڑی جانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ ریلوے وارنٹ تبدیل کروانے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔

دور دور تک کہیں کوئی تانگہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھائے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کافی دور آ گیا کہ پیچھے سے ایک کار لمبے لمبے ہارن بجاتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ یہ حنا تھی وہ خود اسے چلا رہی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

احمد آؤ بیٹھو۔۔۔ میں تمہیں سٹیشن پر چھوڑ آتی ہوں۔

نہیں حنا۔ اب سٹیشن نزدیک ہے۔ آپ جائیں آپ کی مہربانی۔ میں چلا

جاؤں گا۔

نہیں تم بیٹھو۔

نہیں حنا اب میں تمہاری گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتا۔ حنا میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ جب ہم دونو کو ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہونا ہے۔ اس دوراہے سے ہم دونو کی راہیں الگ ہو رہی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اب بچھڑے تو پھر زندگی بھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔ اور پھر دونو اپنی اپنی آگ میں جل کر مرجائیں گے۔

خدا کے لئے احمد ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت نہیں ہے۔ وہ جس آدمی کے بل بوتے پر میں طوفانوں سے بھی ٹکر لیتے ہوئے نہیں ڈرتی اسی آدمی سے میں مقابلہ کیسے کر سکتی ہوں۔ میں تو اس کے سامنے بے دست و پا ہوں۔

حنا۔ میرا سروس کا معاملہ ہے۔ میں اتنے دنوں سے یونٹ سے غائب ہوں۔ اب مجھے آپ جانے دیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

احمد اب تم میرے ساتھ لوٹ آؤ۔ رات کو جی بھر کر باتیں کریں گے۔ صبح سویرے میل ٹرین سے چلے جانا۔ میں تمہیں خود سٹیشن آ کر چھوڑ جاؤں گی۔ آئندہ کے لئے جو بھی پروگرام بنانا ہو گا اسے آج حتمی شکل دے دیں گے۔

نہیں حنا میں رک نہیں سکتا۔

احمد خدا کے لئے میری آخری التجا قبول کر لو۔

حنا خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ احمد نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور ان آنسوؤں کو پونچھا جو اس کی گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اور پھر کسی نامعلوم جذبے سے مغلوب ہو کر سٹیشن کی طرف چل پڑا۔

وہ تھوڑی دور جاتا پھر ایک لمحے کے لئے پلٹ کر پیچھے کو دیکھتا اور پھر نئے عزم سے اپنی منزل کی طرف چل پڑتا۔ حنا بدستور اپنی کار کی کھڑکی سے سر باہر نکالے اس جادوگر کو جاتا دیکھ رہی تھی۔ جس نے اپنے سحر سے اسے مسحور کر رکھا تھا اور وہ دنیا جہان کے خوبصورت اور دولت مند مردوں کو ٹھکرا کر اس جادوگر کا پیچھا کر رہی تھی۔

وہ سوچتی یہ بھی عجیب آدمی ہے۔ مجھ سے تعلق توڑ کر جا بھی رہا ہے اور

پھر کسی موہوم امید کے سہارے محض اس لئے پلٹ کر دیکھ لیتا ہے کہ حنا کھڑی ہے یا چلی گئی ہے۔ حنا کی دلی کیفیات کا کسی شاعر نے کتنا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔

نادر وہ جا رہا تھا تعلق بھی توڑ کر
مڑ مڑ کے بار بار مجھے دیکھتا بھی تھا

وہ عقل کے صحراؤں میں گھومنے والا جادوگر ایک موڑ سے مڑ کر حنا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حنا کے دل کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ وہ کار لے کر احمد کے تعاقب میں چل پڑی۔ احمد سے آگے نکل کر سڑک کے ایک کنارے جا کر کھڑی ہو گئی اور بڑی حسرت بھری نظروں سے احمد کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھتی رہی۔ محبت کرنے والے لوگ بھی عجیب پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں۔ احمد پاس سے گزرا تو ایک لمحے کے لئے اس نے نظریں پھیر کر حنا کو دیکھا اور پھر رکے بغیر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آگے کو چلتا رہا۔ حنا معصوم بچوں کی طرح زار و قطار رونے لگ پڑی۔

لیکن احمد بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ وہ غموں کا یہ بوجھ اٹھائے آگے کو نکل گیا۔ سامنے ریلوے سٹیشن تھا اس نے جاتے ہی اپنا ریلوے وارنٹ تبدیل کروایا اور پھر اندر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ ٹرین آنے ہی والی تھی وہ ایک بینچ پر بیٹھ کر سٹیشن پر آئے ہوئے لوگوں کی بدحواسی دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کا ذہن حنا کی طرف سے ہٹ کر یہ چھل پہل دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

زیادہ دیر نہ گزری ہو گی کہ لاہور جانے والی میل ٹرین آ گئی۔ اور وہ اپنا اٹیچی اٹھائے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں داخل ہو گیا اس ڈبے میں ایک نوبیاہتا جوڑا پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ احمد کے اندر آنے سے وہ دلہن کچھ ڈسٹرب ہو گئی۔ اس نے ایک نظر اس خاتون کو دیکھا۔ اس کے خدوخال بالکل یونانی تھے۔ ایسے خدوخال جو کسی بھی مصور کے شاہکاروں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ مگر حقیقی زندگی میں کہیں بھی نظر نہیں

آتے۔

اس لڑکی کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جب کہ مرد چالیس کے پیٹے میں تھا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں بڑی دل فریب تھیں۔ ان میں بلا کی گہرائی تھی۔ ان حسین آنکھوں میں ہمالیہ کی جھیلوں کی ساری نیلاہٹ سمٹ کر آگئی تھی۔ وہ مرد اس لڑکی کے بالکل قریب بیٹھا آہستہ آہستہ اس کے کان میں باتیں کر رہا تھا۔ اس لڑکی پر اس کی باتوں کے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ وہ لڑکی اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تو وہ ہمہ تن گوش ہو کر اس کے اور قریب کھسک جاتا۔ جس پر وہ لڑکی ناک بھوں چڑھا کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتی۔

احمد کو اس کمپارٹمنٹ میں بیٹھے بمشکل دو تین منٹ ہوئے ہوں گے۔ کہ حنا پھلوں سے بھرے ہوئے دو لفافے لے کر اندر آگئی اس اجنبی مرد نے حنا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حالانکہ اس نے کوئی میک اپ نہ کیا ہوا تھا۔ کپڑے بھی کوئی خاص اچھے نہ پہنے ہوئے تھے۔ وہی جو گھر میں پہنے ہوئے تھے انہیں میں بغیر منہ ہاتھ دھوئے اور کنگھی کے وہ آگئی تھی۔

اس اجنبی کی ساتھی عورت بھی بہت خوبصورت تھی لیکن مردوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی بیویوں کو اپنی بیوی سے زیادہ خوبصورت سمجھتے ہیں۔ اور جہاں بھی موقعہ ملے تاک جھانک ضرور کرتے ہیں۔ شاید اسی سنہری اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ صاحب بھی حنا کو مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

حنا نے وہ دونو لفافے سیٹ پر رکھ دیئے اور احمد کے ساتھ بغیر کسی جھجھک کے بیٹھ گئی۔ احمد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور پھر آنسو اس کی گالوں پر ڈھلک پڑے۔ حنا نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اور پھر اس سے کہنے لگی۔

حوصلہ کرو بہادر لڑکے۔

احمد۔ حنا سے آنکھیں نہ ملا سکتا تھا۔ اٹھ کر ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ وہ اجنبی مرد جو اب تک ان دونو کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ احمد اپنے ڈبے کے سامنے کھڑا رومال سے اپنی تر آنکھوں

کو خشک کر رہا تھا۔ حنا جلدی سے نیچے گئی اور اسے اپنے بازوؤں کے سہارے واپس اپنے ڈبے میں لے آئی۔ اور بڑے ہی ملتجیانہ انداز میں احمد سے کہنے لگی۔

احمد مجھ سے آخر کیا اتنی بڑی خطا ہوئی ہے جس کی تم مجھے اتنی کڑی سزا دے رہے ہو۔

حنا مجھے خود کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیا کروں۔

آخر اتنی جلدی بھاگ آنے میں کیا مصلحت تھی۔

میں خود نہیں سمجھتا۔

احمد اگر تم اجازت دو تو ایک لفافہ پھلوں کا میں تمہارے اس خوبصورت ساتھی کو دے دوں۔ تاکہ تمام راستے یہ تم پر مہربان رہے اور محبت بھری نظروں سے دیکھتی جائے اور اس طرح تمام راستے تمہارا دل بہلا رہے۔

احمد۔ حنا کی اس نئی شرارت سے ہنس پڑا۔ ہاں ضرور دو۔

حنا نے اٹھ کر پھلوں کا بھرا ہوا ایک لفافہ اس اجنبی حسینہ کی نذر کر دیا۔

اس حسن کی دیوی نے دوسری دیوی کا یہ تحفہ شکریئے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اور حنا سے پوچھنے لگی۔

یہ صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں۔

اس بھری دنیا میں میرا سب کچھ یہی ہے۔

آپ کا ہسبنڈ ہے۔

ارے پگلی۔ اپنے ہسبنڈ سے تو دو دن میں پیار ختم ہو جاتا ہے۔ خون کی حدت کم ہوئی۔ اور ادھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا۔ میرا خاوند تو بڑی بڑی قسمیں اٹھا کر کہتا ہے کہ میں زندگی بھر تمہاری جوتیوں میں پانی پیوں گا۔

شروع میں سبھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ چند ہی روز میں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ تو مزاج بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اچھا باجی آپ بتائیں ناں کہ یہ آدمی آپ کا کیا لگتا ہے۔

یہ میرا دوست ہے۔ لیکن ہماری دوستی میں جنس کا کوئی عمل دخل نہیں

ہے۔

ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو تقریباً ناممکن ہے۔

بس اس آدمی کا یہی کمال ہے۔ کہ یہ مقررہ حد سے تجاوز نہیں کرتا۔

یہ شادی شدہ آدمی ہے۔

بالکل شادی شدہ ہے۔ اس کے بچے بھی ہیں۔

آپ نے اس کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی۔

وہ چاہت کی ٹھنڈی اور میٹھی آگ ختم ہو جاتی تو محبت بھی اپنی موت خود ہی مر جاتی۔ حنا نے گھڑی کی طرف دیکھا تو چونک اٹھی اور وہاں سے اٹھ کر احمد کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

احمد اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سعید کے سب ڈیوز میں وصول کروں گی۔ بابا محمد شفیع کی دو جوان بیٹیاں گھر میں بیٹھی ہیں۔ ان کی شادی اس لئے نہیں ہو رہی کہ بابا کے پاس ان کو دینے کے لئے کچھ ہے نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ سعید کے پیسوں کا بڑا حصہ میں بابا محمد شفیع کو دوں۔ تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کر سکے۔ بقایا پیسوں میں سے پانچ ہزار میں گل شیر خان کے گھر اس کے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کے لئے بھجواؤں گی۔ ۔ جو رقم بچے گی وہ جی ایچ کیو کے شہیدوں کی بیواؤں کے فنڈ میں جمع کروا دوں گی۔ اگر تم قبول کرو تو اس میں سے کچھ رقم میں تمہارے نام کر دوں۔

نہیں ہرگز نہیں۔ اس ملک میں مجھ سے زیادہ مستحق لوگ موجود ہیں۔ آپ تلاش کر کے ان کو دیں۔

اچھی بات ہے۔ میں نے اسی لئے تمہارا نام فہرست میں شامل نہیں کیا۔ کہ تم اسے پسند نہ کرو گے۔

اچھا کیا ہے۔

اگر میرا قیام طویل ہو گیا تو میں ہفتہ دس دن گزارنے کے لئے لاہور آ جاؤں گی۔ تاکہ فرصت میں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

ٹھیک ہے۔

گاڑی نے وسل دی۔ وہ دلہن بے قرار ہو گئی۔ اس کا وہ ساتھی اب

تک نہ لوٹا تھا۔ نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر سر نکال کر پلیٹ فارم پر اس جم غفیر میں اپنے خاوند کو متلاشی نظروں سے دیکھنے لگ جاتی۔ اس نیک بخت آدمی کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ وہ قدرے پریشان ہو گئی۔

حنا نے اٹھ کر احمد کو دونو گالوں پر بوسے دیئے۔ احمد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی عقیدت سے چوم لیا۔ گاڑی نے دوسری وسل دی اس کے ساتھ حنا ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر آ گئی۔ احمد کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ حنا نے اس اجنبی عورت کے قریب آ کر کھڑکی سے اسے کہا۔

محترمہ آپ کا خاوند نہ جانے کدھر چلا گیا ہے۔ آپ اتر جائیں۔ اور سامان بھی اتار لیں۔

وہ یہی باتیں کر رہی تھی کہ گاڑی نے ایک مختصر سی وسل دی۔ اور پھر بڑی آہستگی سے چل پڑی۔ اس کے ساتھ اس اجنبی خاتون کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ اتری نہیں بلکہ بدستور باہر دیکھے جا رہی تھی کہ کہیں اس کا خاوند نظر آ جائے۔

لیکن اس کا خاوند کہیں بھی نظر نہ آیا۔ نہ جانے اس پر کیا آفت آن پڑی تھی کہ وہ اپنی نو بیاہتا حسین و جمیل بیوی کو ایک غیر آدمی کے ساتھ ریل کے ایک اکیلے ڈبے میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔

ریل گاڑی آہستہ آہستہ رینگتے رینگتے پلیٹ فارم سے باہر آئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ بجلی کی روشنیاں عجیب ہی خوشنما منظر پیش کر رہی تھیں۔ احمد آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ حنا کی باتیں سن کر اس اجنبی خاتون کی ڈھارس بندھی تھی کہ اس کے ساتھ جو جوان آدمی سفر کر رہا ہے۔ اس سے جوان اور خوبصورت عورتوں کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ یہ آدمی کم از کم ان کو ریپ نہیں کر سکتا۔

عورتوں کی بھی بڑی عجیب نفسیات ہے۔ فلرٹ سے فلرٹ عورت بھی پہلے کسی مرد کی طرف پیش قدمی نہیں کرتی۔ اگر ایسی کسی عورت کو کوئی مرد ریپ کرنے کی کوشش بھی کرے تو یہ پوری قوت سے اپنی عصمت کی مدافعت کرتی ہیں۔

بہرحال صوبیا کو اس برہمچاری قسم کے آدمی سے کوئی خوف نہ تھا۔ جب کوئی عورت اور مرد اس مقام پر ہوں تو پھر ان کے درمیان چاہت کے سوتے پھوٹنے

شروع ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ دونو بالکل خاموش ایک دوسرے کو اگنور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ صوبیا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ وہ کسی کسی وقت چوری نظر سے احمد کی نظریں بچاتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھ لیتی دل میں کہتی۔

شکل بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ آدمی بھی جوان ہے۔ کوئی افسر معلوم ہوتا ہے۔ حنا کتنی خوبصورت ہے - ہے بھی لاکھوں میں ایک - یہ دونو بڑے ہی سٹرانگ نروز کے آدمی ہیں۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی جنسی تجربات میں ملوث نہیں ہوئے۔ نہ جانے یہ آدمی حنا سے کیوں روٹھ کر جا رہا ہے۔ وہ اسے کتنا منانے کی کوششیں کرتی رہی لیکن یہ نہ مانا۔ ان دونو کا یہ کتنا مثالی جوڑا ہے۔ ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ جدائی کے تصور ہی سے ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

یکایک اسے سہیل یاد آگیا۔ نہ جانے اس پر کیا افتاد آ پڑی ہے۔ دو منٹ کے لئے باہر گیا ہے۔ پھر پلٹ کر ہی نہیں آیا۔ اس آدمی نے بھی لاہور جانا ہے۔ چلو لاہور تک تو اس آدمی کا ساتھ رہے گا لیکن اس کے منہ پر تو ایک مہر سکوت لگی ہوئی ہے۔ اگر میں نے اس کو نہ بلایا تو یہ اگر ساری زندگی بھی اس ڈبے میں میرے ساتھ بیٹھا رہا تو یہ بندہ خدا پیش قدمی نہیں کرے گا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو یہ سفر کیوں کر کٹے گا۔

وہ سوچنے لگی - نہ جانے سہیل میرے متعلق کیا سوچ رہا ہو گا۔ مرد بڑے شکی ہوتے ہیں۔ اب تک نہ جانے کیا کیا شکوک اس کے ذہن میں جنم لے چکے ہوں گے۔ عورت کوئی میٹھی گولی تو نہیں ہوتی کہ ہر کوئی جب چاہے اسے ہڑپ کر لے۔ اسے اس بات سے تسلی ہوئی کہ سہیل اسے اتنی جلدی دھتکار کر اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھے حاصل کرنے کے لئے پورے اسی ہزار روپے بڑے خان کو دیئے ہیں۔ خان نے مہمان خانہ کی حویلی کا دروازہ کھول کر اسے سب لڑکیاں دکھائیں تھیں۔ ان میں اور بھی بہت سی لڑکیاں پنجاب سے تعلق رکھتی تھیں۔ میری طرح اعلی تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ لیکن سہیل نے ان سب لڑکیوں میں سے مجھے ہی پسند کیا۔ اور خان کو اسی ہزار روپے دے کر مجھے خرید لیا اور پھر میرے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ دو دن میں اور سہیل بڑے خان کے مہمان بن کر رہے۔ سہیل ٹھیک ٹھاک ہے بس عمر میں ذرا زیادہ ہے۔ اور میرا خیال ہے اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں۔

چلو جیسا بھی ہے ٹھیک ہے کم از کم اس نے مجھے ایک دہکتے ہوئے جہنم سے چھٹکارا تو دلایا ہے۔ ورنہ نہ جانے کب تک دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجھے بھی بڑے خان اور اس کے دوستوں کے بستروں کی زینت بننا پڑتا۔ گاڑی اب اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ گاڑی ایک پل پر سے گزری تو گاڑی کی آواز بڑی خوفناک ہو گئی۔ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اس اجنبی نوجوان کو دیکھا جو سگریٹ پی کر دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا۔ اور اپنے خیالات کے منجدھار میں گم تھا۔

صوبیا نے پھلوں والا لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں نہایت عمدہ قسم کے پکے ہوئے کیلے تھے۔ اس نے سفر کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنی سیٹ سے اٹھ کر پھلوں کا وہ لفافہ نہایت مودبانہ انداز سے جھک کر احمد کے سامنے پیش کیا۔

احمد نے اس خاتون کو پہلی دفعہ دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ پہلی دفعہ حسن کی دیوی ڈیانا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اس خاتون کا جسم ایک بہت ہی قیمتی لیکن باریک ساڑھی میں لپٹا ہوا تھا۔ جو اس کے جسم کے خطوط کو کچھ یوں ہی سا چھپاتی تھی اس ساڑھی سے اس کے سنہری بدن کی پرچھائیاں جھانکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

محترمہ شکریہ! حنا میرے لئے بھی پھل چھوڑ گئی ہے۔

چلئے اب تو لے لیں۔

شکریہ۔ اور احمد نے آگے کو ہاتھ بڑھا کر لفافے سے ایک کیلا نکال لیا۔

وہ خاتون مسکرا پڑی اور احمد کو یوں لگا جیسے چاروں طرف پھول کھل اٹھے ہوں۔ اور پھولوں کی مسکراہٹ سے ہر طرف فضا میں عطر بیز مہک پھیل گئی ہو۔ خاتون خوش ہو گئی۔ اور اظہار مسرت کرتی ہوئی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

محترمہ آپ کا نام کیا ہے......؟ احمد نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

جناب .....!! میرا نام صوبیا ہے۔

آپ کا نام کیا ہے....؟ صوبیا نے قدرے توقف سے پوچھا۔

میرا نام احمد ہے۔

وہ خاتون جو آپ کو چھوڑنے آئی تھی۔ آپ کی کیا لگتی ہے۔

میری دوست ہے۔

آپ دونو شادی شدہ ہیں۔

جی میں شادی شدہ ہوں میرے بچے بھی ہیں۔ حنا بھی شادی شدہ تھی۔ کچھ دن ہوئے ہیں ان کے ہسبنڈ کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔

کیا میں آپ کے ساتھ اس سیٹ پر بیٹھ جاؤں.....؟

اگر آپ کو اچھا لگتا ہے تو ضرور بیٹھیں۔ اور پھر صوبیا احمد کے ساتھ اس کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اگر آپ کے ہسبنڈ آپ کو یوں میرے ساتھ بیٹھاہوا دیکھ لیں تو پھر.......؟

تو پھر کیا۔ زیادہ سے زیادہ نکال دیں گے۔ میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔

حنا اور آپ میں لڑائی نہ ہو گی۔

اس کے تو بقول آپ کے۔ آپ کے ساتھ جنسی تعلقات نہیں ہیں۔ پھر لڑائی کس بات کی۔

تو آپ ان تعلقات پر آمادہ ہو سکیں گی۔

وقت تو آنے دیں۔

اور ان باتوں کے ساتھ صوبیا نے احمد کی گود میں سر رکھ دیا اور اس برتھ پر لیٹ گئی۔ احمد اس کے اس بے تکلفانہ رویئے سے گھبرا گیا۔ قدرت نے اس آڑے وقت میں اس کی مدد کی۔ گاڑی لمبی لمبی سیٹیاں بجاتے ہوئے آہستہ ہونے لگ گئی۔ اس اظہار جرات پر احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کھول کر یہ دیکھنے لگا کہ کون سا اسٹیشن آ رہا ہے۔ گاڑی گوجرخان ریلوے سٹیشن میں داخل ہو چکی تھی۔ صوبیا گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے حواس مجتمع کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور پہلے کی طرح نو بیاہتا لڑکیوں کی طرح لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ احمد عورت کی اس فطرت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ سوچنے لگا۔

چاہے مرد ہو یا عورت اسے اپنی جھوٹی انا کا کتنا خیال ہوتا ہے۔ ہر آدمی دل کا کتنا کمینہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی نظروں میں کتنا پارسا دکھائی دینا چاہتا ہے۔ اس کا جو اصلی چہرہ ہوتا ہے اس پر اس نے اور کتنے نقلی چہرے چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی

عورت کتنی خود سپردگی کے عالم میں میری گود میں لیٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے یہ اپنی خواہشوں کے الاؤ میں جل رہی تھی۔ اب جھوٹی انا اور نام و نمود کی خاطر اس نے اپنی سب خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا ہے اور ایک لمبا گھونگھٹ نکال کر اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچالیا ہے۔

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر رک گئی۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ سٹیشن ماسٹر اور اس کے ساتھ اس کا ایک ماتحت سیکنڈ کلاس کے اس ڈبے میں جھانکتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ دونو صوبیا کی سیٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے۔

محترمہ آپ کا نام صوبیا بی بی ہے......؟

جی ہاں۔

آپ کے خاوند کا کیا نام ہے۔

سہیل اختر۔

آپ نے کہاں جانا ہے.....؟

لاہور....

آپ کے میاں پنڈی رہ گئے ہیں۔ انہوں نے سٹیشن ماسٹر صاحب پنڈی کی معرفت فون کیا ہے کہ میری بیوی صوبیا بی بی سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھی ہے۔ اسے گوجر خان میں اتار لیں۔ میں بس سے گوجر خان آ رہا ہوں۔

نہیں سٹیشن ماسٹر صاحب میں معافی چاہتی ہوں۔ میں یوں دوسرے آدمیوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔

یہ صاحب جو بیٹھے ہوئے ہیں آپ کے میاں کے جاننے والے ہیں۔

میرا خیال ہے نہیں۔

پھر آپ ان کے ساتھ کیسے اکیلی ان کے ڈبے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔

ہم دونو میاں بیوی پہلے اس ڈبے میں بیٹھے تھے کہ یہ صاحب بعد میں آئے۔

آپ دونو کا یوں اکیلا سفر کرنا قابل اعتراض ہے۔

آپ مجھے لیڈیز سیکنڈ کلاس میں بٹھا دیں۔

اس طرح بہت سے لوگوں کو شفٹ کرنا پڑے گا۔

صاحب اگر کوئی پرابلم ہے تو میں دوسرے ڈبے میں شفٹ ہو جاتا ہوں۔ احمد بیچ میں بول اٹھا۔

میں اکیلے ہرگز اس ڈبے میں نہ بیٹھوں گی۔ یہ صاحب یہیں بیٹھے رہیں۔ مجھے کیا کہیں گے کھا تو نہیں جائیں گے۔

گاڑی کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ چونکہ وہ متواتر سیٹیاں بجا رہی تھی۔ اور اب صرف گارڈ کی وسل اور سگنل کا انتظار تھا۔ سٹیشن ماسٹر عاجز آ کر گاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

"اچھا بی بی تمہاری مرضی" میں پنڈی سٹیشن ماسٹر صاحب کو بتا دیتا ہوں۔ کہ بی بی گاڑی چھوڑ کر ہمارے ساتھ آنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ خاتون اپنے خاوند کا لاہور ریلوے اسٹیشن کے سیکنڈ کلاس کے لیڈیز ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرے گی۔ جب تک وہ خود وہاں نہیں آئیں گے یہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ کہیں نہیں جائیں گی۔

گاڑی چل پڑی شہر کی حدود ختم ہوئی تو گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ صوبیا اپنی سیٹ سے اٹھ کر پھر احمد کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے دونو بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیئے۔ اب احمد کو اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا اس بلائے بے درماں سے تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔

صوبیا مجھے افسوس ہے ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ ہم ایک ساتھ اکٹھے زیادہ دور تک نہ چل سکیں گے۔

وہ کیوں۔ آپ پر کوئی پابندی ہے۔

آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ہے لیکن میں ان کی پرواہ نہیں کرتی۔

محترمہ.....!!! مجھے افسوس ہے میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔

کم از کم لاہور تک کے اس سفر کو تو خوشگوار بنائیں۔

وہ کس طرح۔

مجھے قبول کر کے۔

محترمہ.....!!! مجھ میں یہی کمزوری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر عورت اپنی مقررہ حد میں رہے۔ کوئی کسی کے حقوق سلب نہ کرے۔

عورت کی کیا مقررہ حدود ہیں۔ وہ صرف عورت ہے۔ وہ جب بھی کسی مرد سے ملے تو ایک عورت کے روپ میں ملے۔ آئیں آپ ان مختصر سے نشاط انگیز لمحوں کو امر بنا دیں۔ خدا کے لئے مجھے پارسائی کے کرب میں مبتلا نہ کریں۔ پتہ نہیں پھر کبھی زندگی میں ملیں گے بھی یا نہیں۔ نا آسودگی کا کرب مجھے سے نہ سہا جائے گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

محترمہ.....!!! سہیل اختر صاحب کو کیسے فیس کرو گی۔

اس کو پتہ نہیں ہے۔ وہ مجھے بدمعاشوں سے خرید کر لایا ہے۔ مجھے جن بدمعاشوں نے ٹریپ کیا وہ بلا مبالغہ اپنے کئی کئی دوستوں کو روزانہ ساتھ لا کر میری اجتماعی عصمت دری کرتے رہے ہیں۔ جن سے میری جنس حس تیز ہو گئی ہے۔ سہیل اختر بیچارہ کس باغ کی مولی ہے۔ یہ روگ تو اب جاتے جاتے جائے گا وہ بھی اگر میں آپ جیسے آدمی کے ساتھ رہوں تو تب نارمل ہو سکتی ہوں۔ وگرنہ اس جنسی الاؤ میں ہر آئے دن شدت ہی آتی جائے گی۔ اور ایک دن میں کپڑے پھاڑ کر پاگل ہو جاؤں گی اور گھر سے نکل کھڑی ہوں گی۔ وہ روتی ہوئی اپنی سیٹ پر جا کر لیٹ گئی۔ اور بہت دیر تک منہ چھپائے سسکیاں لیتی رہی۔ احمد اسکی یہ حالت نہ دیکھ سکا اور اٹھ کر اسکی سیٹ پر جا بیٹھا اور اسکا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے کندھوں کو آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگ گیا جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کو گود میں لئے تھپتھپا رہی ہو صوبیا کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ اس نے احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے پلٹ کر اپنا چہرہ اوپر کی طرف کیا اسکی آنکھوں سے کاجل بہہ بہہ کر اس کی سنہری گالوں کو آلودہ کر رہا تھا۔ پاس پڑے ہوئے ایک کپڑے سے احمد نے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ صوبیا کی کچھ ڈھیر بندھی۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں احمد کو لے لیا اور دیوانگی کے عالم میں اس کا منہ چومنے لگ گئی۔

اب احمد نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ جونہی گاڑی جہلم ریلوے سٹیشن پر

جا کر رکے گی وہ اپنا ڈبہ تبدیل کر لے گا۔ تاکہ کرب کی جس سولی پر وہ مصلوب ہے اس سے جان چھوٹے۔ سوہاوہ آیا۔ اس نے آہستہ سے صوبیا کا سر اپنی گود سے ہٹا کر سیٹ پر رکھ دیا اور خود کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ وہ دینہ تک کھڑکی میں ہی کھڑا رہا۔ اور صوبیا بدستور آنکھیں بند کئے اپنی سیٹ پر پڑی تھی۔ احمد تھوڑی دیر کے بعد اسے پلٹ کر دیکھ لیتا اور اطمینان کر لیتا کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔

جب گاڑی دینہ سے آگے نکلی تو اس نے پلٹ کر صوبیا کو ایک نظر دیکھا۔ وہ تھک ہار کر سو گئی تھی۔ احمد نے اسی موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنی سیٹ پر آ کر اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ جہلم آنے سے پہلے وہ اپنا سب سامان اپنے اٹیچی کیس میں بند کر چکا تھا۔ اور اسے اٹھا کر اپنے پاس کھڑکی کے قریب لا کر رکھ دیا تھا۔ جہلم ابھی دور تھا لیکن پھر بھی احمد اس مصیبت سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا یہ جنسی مریضہ مجھے بھی اپنے ساتھ جنسی دلدل میں لت پت نہ کر دے اور میں نے آج تک جس آبگینے کو بچا بچا کر رکھا ہے اس جادو گرنی کے سحر سے چور چور نہ ہو جائے۔

یکایک صوبیا کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی پہلی نظر احمد کی سیٹ پر پڑی۔ اسے خالی دیکھا تو اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پلٹ کر راستے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ احمد کھڑا تھا۔ اس کا اٹیچی کیس اس کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔

آپ تو کہہ رہے تھے میں نے لاہور جانا ہے۔ اور آپ سامان سمیٹے ہوئے دروازے میں کھڑے بھاگنے کے لئے تیار ہیں۔ صوبیا نے احمد کو تشویشناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہاں میں نے لاہور جانا تھا۔ لیکن اب پروگرام بدل دیا ہے۔ اب جہلم ایک دن کے لئے رکوں گا۔

جہلم کس کے پاس جانا ہے۔

میرے دوست ہیں ان کے پاس ایک دن ٹھہروں گا۔

میں بھی آپ کے ساتھ آؤں گی۔

معافی چاہتا ہوں۔ محترمہ....!!! اب مجھے آپ جیل بھجوا کر دم لیں گی۔

آپ کو کون سالا جیل بھیج سکتا ہے۔ جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں

آپ بے فکر رہیں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

نہیں مجھے آپ معاف فرمائیں۔ میں بڑا شرمیلا آدمی ہوں۔ عورتوں کی کمپنی سے ویسے ہی گھبراتا ہوں۔

آپ مرد نہیں ہیں۔

ہوں لیکن صرف اپنی بیوی کے لئے۔ زندگی بھر میں نے کسی عورت تک رسائی حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اور جو بغیر کسی تگ و دو کے ہاتھ آ جائے۔

وہ یقیناً میری منکوحہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک یہ جھک نہیں ماری۔

آپ میری صرف ایک گزارش مانیں۔

فرمائیں۔

آپ یہاں بریک جرنی (Break Juerney) نہ کریں۔ میرے ساتھ لاہور تک آئیں۔ کم از کم یہ طویل سفر تو آپ کی کمپنی کی وجہ سے خوشگوار رہے گا۔

یہ بات مجھے منظور ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ٹھیک ہے۔

بالکل ٹھیک ہے۔

وعدہ۔

پکا وعدہ۔۔

میں کسی نئی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جاؤں۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میری طرف سے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو گی۔

چلئے۔ قبول۔ اور احمد اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر واپس سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا اور صوبیا بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

صوبیا کو اس کی قربت سے بھی ایک گونہ سکون ملتا تھا۔ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی اور احمد سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگ گئی۔

کیوں صوبیا تمہارا خاوند جنسی طور پر توانا آدمی نہیں ہے کیا۔

جنسی طور پر ٹھیک ٹھاک ہے۔ نارمل آدمی ہے۔ پرورٹ Pervert نہیں ہے۔ کہ ہر وقت عورت سے چمٹا رہے۔

اور تمہاری یہی ڈیمانڈ ہے۔

ظاہر ہے میں جب ایسے ماحول کو چھوڑ کر آ رہی ہوں جہاں عورت دس دس مردوں کو جنسی آسودگی فراہم کرتی ہے۔

اس خان کے ہاں بھی یہی حال تھا۔

جی ہاں۔

وہ کوئی براتھل رن کرتا ہے۔

نہیں براتھل نہیں۔ اس کے دوست یار مفت میں راتوں کو بیچاری نصیبوں جلی لڑکیوں کو شراب پی کر چھوڑتے رہتے۔ خان بھی آتا تھا لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ۔ جو لڑکی اس ماحول میں مہینوں رہی ہو اس کی سیکشوئل پرورژن کا کیا حال ہو گا۔ ایسی بد قسمت لڑکیوں کو تو سیکس کے بغیر اور کچھ بجھائی ہی نہیں دیتا۔

سہیل صاحب نے فی الواقع آپ کے ساتھ شادی کی ہے یا کیا پتہ وہ کوئی قحبہ خانہ چلاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے۔

تو تمہارے خیال میں ایسی لڑکیاں قحبہ خانوں کے دلالوں کے پاس دل جمعی سے گزر اوقات کرتی ہیں۔

احمد صاحب مجھے اس کا ذاتی طور پر تو کوئی تجربہ نہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جو ان پڑھ لڑکیاں یہ لوگ لے کر جاتے ہوں گے وہ تو وہاں ٹک جاتی ہوں گی لیکن پڑھی لکھی لڑکیاں شروع میں کچھ دن (SEXUAL PLEASURE) کے لئے رہ جاتی ہوں گی لیکن آخر کار وہاں سے بھاگ جاتی ہوں گی۔

وہ کیوں......؟

پڑھی لکھی لڑکیوں کی وژن بڑی براڈ ہوتی ہے اور وہ آئندہ کو پیش آنے والے حالات و واقعات کو پہلے سے ہی دیکھ لیتی ہیں اور اس طرح سے ان کا منطقی انجام

بھی ان کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔

آپ کتنی پڑھی ہوئی ہیں۔

میں بی اے ہوں۔ ایم اے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہی تھی کہ ٹریپ ہو گئی اور بدمعاشوں نے مجھے اس حال میں پہنچایا۔

آپ اس ماحول سے نجات پانا چاہیں گی۔

جانتے بوجھتے کون دوزخ میں رہنا چاہتا ہے۔

اب تم آزاد ہو۔ بجائے اس کے کہ تم سہیل اختر کا انتظار کرو اور وہ پہنچ جائے اور پھر تمہیں پہلے کی طرح لئے لئے بازار حسن کی زینت بنا دے۔

احمد صاحب آپ کی بات ٹھیک ہے۔ گھر والے مجھے کیسے منہ لگائیں گے۔ ہمارے معاشرے میں تو جو لڑکیاں گھروں سے اپنے عاشقوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں ان کے ماں باپ ان کو منہ نہیں لگاتے۔ اور وہ بدقسمت لڑکیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قحبہ خانوں کی زینت بن کر لوگوں میں جنسی بیماریاں پھیلاتی رہتی ہیں۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ وہ اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ انہیں اس بات کا قطعاً کوئی دھیان ہی نہ رہا کہ جہلم ریلوے سٹیشن آنے والا ہے۔ ابھی وہ اپنے ہوش بھی مجتمع نہ کرنے پائے تھے کہ ان کے ڈبے کا دروازہ کھلا۔ اور حنا ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح اندر آ گئی۔ ریل کا وہ چھوٹا سا ڈبہ ایک انوکھی خوشبو سے مہک اٹھا۔ احمد اور صوبیا نے حنا کو دیکھا تو وہ دونو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتی ٹرین میں حنا نے احمد کو دیکھ لیا تھا اور پھر یہ بھی بغور دیکھا تھا کہ کوئی آدمی اس کی گود میں سر رکھے پڑا ہوا ہے۔

حنا نے اندر آ کر دیکھا تو وہاں صرف احمد اور صوبیا ہی تھے۔ یہی خوبصورت اور جوان لڑکی احمد کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ حنا کے خدشات واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان دونو نے اٹھ کر حنا کا بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

احمد تم جلدی سے اپنا سامان اٹھا کر باہر میری گاڑی میں رکھو۔

کیوں خیریت تو ہے۔

خیریت ہی تو نہیں ہے۔

کچھ بتاؤ تو سہی۔

احمد خدا کے لئے موقعہ کی نزاکت کو سمجھو۔ یہ وقت تمہیں تفصیلات بتانے کا نہیں ہے۔ یہ وقت عمل کا ہے۔ تم جلدی سے باہر نکلو۔

احمد جلدی سے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ پاس ہی صوبیا کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ وہ بھی اپنا سامان باندھنے لگ گئی۔ آپا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ صوبیا نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

تمہارے خریدار بھی بس آیا چاہتے ہیں۔ تم بھی مت گھبراؤ۔

احمد اور حنا ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئے۔ حنا کی گاڑی وہاں کھڑی تھی۔ اس میں وہ جلدی سے آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اس وقت تک صوبیا پلیٹ فارم سے باہر نہ نکلی تھی۔ حنا جلدی سے گاڑی چلا کر بجائے پنڈی، لاہور یا جہلم شہر کی طرف جانے کے جہلم چھاؤنی کی طرف چلی گئی۔ راستے میں ایک ہوٹل میں وہ تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ وہاں منہ ہاتھ دھویا اور چائے وغیرہ پی۔ جب تازہ دم ہوگئے تو پھر دریا کے کنارے گرجا گھر کی گراؤنڈ چلے گئے۔ جہاں ایمرجنسی میں احمد کی یونٹ قیام پذیر تھی۔ احمد نے خصوصیت سے وہ جگہیں دیکھیں جہاں پوسٹ آفس کی باونڈری وال کے ساتھ احمد کا خیمہ ہوا کرتا تھا۔ دو سال گزر گئے تھے لیکن خیمہ کا وہ گڑھا ابھی تک اسی طرح موجود تھا۔

تھوڑی دیر وہ وہاں ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑے اپنی ماضی کی یادوں کو دہراتے رہے۔ اس درخت کے نیچے ہمارے دفتر کا خیمہ تھا۔ یہاں میجر ظہور الحق ملک صاحب بیٹھتے تھے۔ یہاں اللہ یار خان اور اس کے ساتھیوں کا خیمہ تھا۔ گرجے کے کمپاؤنڈ میں بھی گئے۔ وہ جگہ بھی دیکھی جہاں کور کمانڈر صاحب بیٹھتے تھے۔ اور جہاں احمد اور حنا کا کیس ان کے سامنے پیش ہوا تھا اور جس سے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا گیا تھا۔

آخر میں حنا نے کہا کہ چلو اپنی وہ کوٹھی بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ مال روڈ پر وہ کوٹھی تھی۔ وہ گیٹ کے پاس باہر سڑک پر رک گئے اور بڑی حسرت بھری نظروں سے کوٹھی کو اس کے دو سال پرانے مکینوں کو تصور ہی تصور میں چلتا پھرتا دیکھتے رہے۔ سب ملازم اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ باوجود غور سے دیکھنے کے بھی انہیں کرنل

سعید کہیں نظر نہ آیا۔ کرنل سعید کو یاد کر کے وہ دونو بڑے غمگین ہو گئے۔ احمد کہنے لگا۔

حنا....! اب سعید بیچارے کی مغفرت کی دعا کرو۔ اب اس کا رشتہ ہم سے ٹوٹ گیا ہے اور اس کا معاملہ اب اللہ کے سپرد ہے۔

احمد نے وہ پلی جو اس کوٹھی کے سامنے مال روڈ پر تھی خصوصیت سے حنا کو دکھائی۔

حنا جب تم مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر کراچی چلی گئی تھی تو میں دیوانگی کی حالت میں اکثر اسی پلی پر آ کر بیٹھا کرتا تھا اور اس کوٹھی کے مکینوں کو اپنے تصور میں چلتا پھرتا دیکھتا تھا اور تمہاری شبیہہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک دن کرنل سعید صاحب نے دیوانگی کی حالت میں مجھے اس پلی پر بیٹھا ہوا دیکھا تو میرے قریب آ کر گاڑی روکی اور مجھ سے کہنے لگا۔

"اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" "جاؤ اپنی نوکری کرو کیوں اپنا کیریر خراب کر رہے ہو۔"

میں نے ان سے کہا تھا۔

کرنل صاحب....!!! مجھے تو اس کوٹھی کے سارے مکین جوں کے توں اپنے اپنے کاموں میں منہمک نظر آتے ہیں۔

"کہاں ہیں۔ تمہارا تو دماغ ہی چل گیا ہے۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے تو نظر آ رہے ہیں۔ آپ کو اللہ نے دیکھنے والی وہ نظر ہی نہیں دی۔ تمہیں اب شاکس (بجلی کے جھٹکوں) کی ضرورت ہے۔ اور وہ تمسخر آمیز لہجے میں ہنستا ہوا گاڑی کو چلا کر آگے کو بڑھ گیا۔

احمد چھوڑو ماضی کی ان یادوں کو نہ دہراؤ۔ یہ بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں۔ اور کرب و اضطراب کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اٹھو اب چلیں۔

کہاں۔

O

پنڈی چلو تو اچھا ہے۔ اگر نہیں چل سکتے تو میں تمہیں لاہور چھوڑ آتی ہوں۔

نہیں میں بس سے چلا جاؤں گا۔ میرا جانا ضروری ہے۔ تم ایسا کرو۔ وہاں کے اپنے سب معاملات سلجھا کر ایک ہفتہ میرے ساتھ تم لاہور آ کر گزارو ان سات دنوں میں مستقبل کا سب پروگرام طے کریں گے۔ ہاں تم نے یہ بتایا نہیں کہ تم کار لے کر میرے پیچھے کیوں بھاگم بھاگ آئی ہو۔

تم نے صوبیا کے ڈیزائنز کا تو پتہ نہیں لگالیا۔

بالکل لگا لیا ہے۔ اسی لئے تو اسی حالت میں چلی آئی۔ اور پھر تم دونو کو رنگے ہاتھوں پکڑ بھی لیا ہے۔

کیوں ہم قابل اعتراض حالت میں تھے۔

نہیں ابھی ابتدا تھی۔ اس مقام تک بھی یہ محترمہ آپ کو لے جاتیں۔

آپ نے تو اسکو فروٹ دیا۔ اس سے دوستی بنانا چاہتی تھیں۔

ٹھیک ہے دوستی بنانا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ ایک عام سی عورت مجھے نہیں لگی۔ وہ ایک گینگ کی مجھے رکن لگتی ہے۔

آپ کو کیسے شک پڑا۔

شک یوں پڑا۔ کہ ایک شخص اپنی نو بیاہتا خوبصورت اور جوان بیوی کو ایک غیر اور جوان آدمی کے ساتھ عالم تنہائی میں چھوڑ کر ریلوے سٹیشن سے باہر ایک بدمعاش سے کھڑا کانا پھوسی کر رہا تھا۔ جونہی مجھے دیکھا تو چپ ہو گئے۔ گاڑی وسل دے رہی تھی اور وہ اطمینان سے کھڑا اس آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی سٹیشن کی حدود سے باہر بھی نکل گئی۔ وہ دونو وہاں ہی کھڑے رہے۔ میں دور کھڑی ان کی نقل و حرکت کو بغور واچ کر رہی تھی۔ گاڑی نکل جانے کے کافی دیر بعد وہ دونو ایک کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ تمہیں فالو کریں گے۔

گاڑی کو پنڈی سٹیشن سے نکلے ہوئے آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ وہ دونو وہاں سے چلے گئے۔ میں نے پیٹرول پمپ پر آ کر پیٹرول ڈلوایا سیدھی گھر گئی۔ جلدی سے واش کیا۔ کپڑے بدلے کچھ پیسے لئے۔ پسٹل لیا۔ اور بابا محمد شفیع کو بتایا کہ میں کہیں جا رہی ہوں۔ شاید رات تک واپس نہ آ سکوں۔ تم گھر کا خیال کرنا۔

بٹی تم کسی قسم کا فکر نہ کرو۔

اور پھر میں چلی آئی۔ میرا خیال تھا کہ میں گوجر خان تم سے مل جاؤں گی اور تمہیں ٹرین سے اتار لوں گی۔ لیکن میرے گوجر خان پہنچنے سے پہلے گاڑی وہاں سے جا چکی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑی سپیڈ سے جہلم کا رخ کیا اور خدا کی مہربانی سے اس سے پیشتر کہ تم ان بدمعاشوں کے پھندے میں پھنس جاتے میں تم تک پہنچ گئی۔ اور میں نے تمہیں اور صوبیا کو جس حالت میں دیکھا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ خوبصورت لڑکی بھی اس گینگ کی سرگرم رکن ہے۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

احمد کے کہنے پر حنا نے اس کو لاریوں کے اڈے پر چھوڑا اور خرچے کے لئے پانچ سو روپے اس نے احمد کو دیئے۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا لیکن حنا کے بار بار کے اصرار پر اس نے لے لئے۔ حنا اس کے لئے ٹکٹ لے آئی اور پھر اس کا اٹیچی کیس اٹھا کر اس کے ساتھ لاری میں آ گئی۔ احمد کو ڈرائیور کے پیچھے ایک خالی سیٹ مل گئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ حنا لاری سے اتر کر نیچے کھڑی اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہاں جتنے بھی مرد مسافر تھے سب کی نظریں حنا پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی پرواہ کئے بغیر احمد کے پاس کھڑی اس سے باتیں کرتی رہی۔ حنا نے لاری کلینر سے پوچھا۔

بھائی صاحب لاری چلنے میں ابھی کتنی دیر ہے....؟

بی بی جی۔ دس منٹ رہتے ہیں۔

حنا اڈے کے باہر سڑک سے احمد کے لئے فروٹ لے کر جلدی واپس آ گئی۔ احمد نے اپنی سیٹ پر ایک بیگ رکھ دیا۔ اور خود نیچے اتر آیا۔ وہ لاری سے ہٹ کر ذرا دور ایک شکستہ سے بینچ پر بیٹھ کر فروٹ کھانے لگ گئے۔ حنا نے احمد سے کہا۔

احمد تم کل مجھے میرے گھر کے پتہ پر خط ضرور لکھنا کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔

ٹھیک ہے میں ضرور لکھوں گا۔

ڈرائیور لاری میں بیٹھ کر ہارن دینے لگ گیا۔ حنا اور احمد اٹھ کر لاری کی طرف آ گئے۔ احمد لاری میں سوار ہو گیا جب کہ حنا اس کے پاس والی کھڑکی کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی۔ جب لاری نے ہارن دیا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگ گئی تو حنا نے احمد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مصافحہ کیا اور لاری چل پڑی۔ حنا کھڑی اسے ویو کرتی رہی۔ اور پھر لاری اڈے کی حدود سے نکل کے باہر کھلی سڑک پر آ گئی۔ حنا بھی اپنی کار لے کر چوراہے پر آ کر تھوڑی دیر کے لئے رکی لاری جب اس کے پاس سے گزری تو اس نے احمد کو آخری بار سلام کیا اور پھر گاڑی کو موڑ کر پنڈی جانے والی سڑک کی جانب کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کار اور لاری ایک دوسرے سے دور ہوتی گئیں اور آخر کار ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئیں۔ احمد جہلم سے گزر رہا تھا۔ افتخار یوسف زئی۔ رؤف ظفر، شیخ احسان الحق، امداد ہمدانی اور استاد جوگی جہلمی کا شہر۔ وہ سوچنے لگا۔ جہلم سے میری کتنی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ میں سید عبدالحمید عدم، سید جعفر طاہر اور زاہدہ حنا کو یہاں ہی ملا تھا۔ اس لحاظ سے جہلم میرے لئے حسین یادوں کا شہر ہے۔ لیکن سب دوست گردش روزگار کے ٹھکرائے ہوئے اپنے غموں کا بوجھ اٹھائے نہ جانے اب کہاں ہوں گے۔ البتہ وہ مہ وش (حنا) اب سے تھوڑی دیر پہلے میرے پاس تھی۔ اس وقت میں اپنے مقدر پر نازاں تھا۔ دنیا کی ایک حسین عورت میرے پاس تھی۔

یہ سب دوست سنیما کی متحرک تصویروں کی طرح ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے آ جاتے۔ میں انہی خوش کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ لاری کھاریاں جا پہنچی۔ میرے ساتھ سیٹ پر جو آدمی بیٹھا تھا وہ بہت دیر سے مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اس کو ہمت نہ پڑتی۔ آخر اس نے جی کڑا کر کے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

آپ کہاں جائیں گے۔

لاہور۔

یہ خاتون جو آپ کو بس پر بٹھانے آئی تھی۔ یہ کون ہے.....؟

کیوں جی آپ کو اچھی لگتی تھی۔

وہ شرما گیا۔ اور پھر لاہور تک اس سے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

میں غروب آفتاب کے ساتھ خیریت سے اپنی یونٹ میں پہنچ گیا۔ مین گیٹ سے سیدھا دفتر میں گیا۔ ڈیوٹی کلرک بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو بڑے پر تپاک انداز میں آ کر ملا۔

اجمل آج تمہاری ڈیوٹی ہے۔

جی سر۔

کتنے بجے کھانا کھا کر آ جاؤ گے۔

سر....!! سات بجے جاؤں گا۔ ساڑھے سات تک واپس آ جاؤں گا۔ کوئی کام ہو تو حکم کریں۔

اجمل کام یہ ہے کہ نو بجے میرا پنڈی سے ٹیلی فون آئے گا۔ آپ نام پوچھیں ان سے اگر وہ زاہدہ حنا صاحبہ ہوں تو ان کو یہ میسج دے دیں کہ احمد صاحب خیریت سے چھ بجے اپنے میس میں پہنچ گئے ہیں۔ آپ پنڈی کتنے بجے پہنچی ہیں۔ بیٹے یہ دو باتیں ہیں۔ ایک میرا بتانا کہ میں لاہور خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ دوسرا آپ پنڈی کب پہنچی ہیں۔

بہتر سر....!!

پھر جناب آپ ڈیوٹی اردلی کے ذریعے مجھے اس کا جواب ایک کاغذ پر لکھ کر بھیجیں۔

بہتر سر....!!

اور پھر میں اپنے میس کی طرف چلا گیا۔ میرا وفادار ساتھی۔ اللہ یار خان میرے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ لتا کے گانوں سے بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو خوشی کے مارے کھل اٹھا۔ لپک کر میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا۔ میں تھکا ماندہ آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

کیوں سر بہت تھک گئے ہیں۔ بڑے دن لگا دیئے ہیں آپ نے۔ آپ تو دو دن کی چھٹی گئے تھے۔

وہاں ایک کیس ہو گیا تھا۔ جس میں، میں ضروری گواہ تھا۔ اس لئے جی

ایچ کیو والوں نے مجھے روک لیا۔

کیا کیس ہو گیا تھا۔

کوئی افسروں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے گواہی کے لئے روک لیا گیا۔

لیکن آپ تو گاؤں گئے تھے۔ یہ پنڈی کیسے پہنچ گئے۔

نہیں اللہ یار خان۔ میں نے تو دو دن کی چھٹی پنڈی جانے کے لئے لی تھی۔

صاحب جی۔ پھر اس سوہنی کڑی کا تو کوئی چکر وکر نہیں۔

نہیں اللہ یار خان۔ سوہنی کڑی اب ایک کرنل کی بیوی ہے۔ مجھ جیسے غریبوں کو وہ اب کہاں لفٹ دیتی ہے۔

نہیں صاحب جی۔ یہ بات نہیں مانتا۔ وہ سوہنی کڑی اس دنیا میں آپ سے اچھا کسی کو نہیں سمجھتی۔

تمہیں کیسے پتہ چلا۔

صاحب جی یہ بال ایسے تو نہیں سفید کئے۔

اس نے سفید بالوں کی لٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

میں اور اللہ یار خان ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میرے میس کے ساتھیوں کو جب پتہ چلا کہ میں پنڈی سے واپس آ گیا ہوں تو وہ سب میرے کمرے میں آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے میرے کمرے میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔

اوئے اللہ یار خان کوئی صدقہ خیرات وغیرہ کرو۔ تمہارا صاحب پنڈی سے خیریت سے واپس آ گیا ہے۔

کیوں صاحب جی۔ ان کی خیریت سے واپس آنے کی کوئی امید نہ تھی۔

قطعاً نہیں...!! یہ جس آگ سے کھیل رہا ہے۔ وہ کسی دن اس کو جلا کر بھسم کر دے گی۔ صوبیدار میجر نے بڑے نپے تلے لہجے میں کہا۔

اگر چہ یہ میرے ساتھیوں کی ہنسی مذاق میں کہی ہوی باتیں تھیں۔ لیکن تھیں سو فیصد درست۔ میں اپنی بساط سے بڑھ کر کام کر بیٹھا تھا۔ بقول شخصے "کہاں راجہ

بھوج اور کہاں گنگو تیلی" میں ایک دیہاتی نادان۔ محلوں میں رہنے والی مہ وشوں سے عشق کرتا تھا۔ فوج میں بالکل ہی معمولی درجہ بلکہ تیسرے درجے کا ملازم تھا۔ مقابلہ کرنیلوں اور جرنیلوں سے کرتا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا حماقت کی بات ہو سکتی ہے۔

پیچھے گھر میں نہ ماں نہ باپ۔ نہ بہن نہ بھائی۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو میری فرمانبردار بیوی اور معصوم بچوں کا کیا حشر ہوتا۔ لیکن عشق مصلحت اندیش نہیں ہوتا۔ وہ تو آنکھیں بند کر کے آگ میں کود پڑتا ہے۔ جن کے جذبے سچے ہوں ان کے لئے وہ آگ گلزار بن جاتی ہے۔ مجھ میں تو کوئی خاصیت نہ تھی لیکن اللہ پاک نے مجھے ہر مرحلے پر ہر قسم کی آلودگیوں میں ملوث ہونے سے بچایا۔

اللہ یار خان کینٹین سے چائے لے کر آیا۔ سب نے چائے پی اور کافی دیر تک یہ دھما چوکڑی جاری رہی۔ وہاں ہی سے سب اٹھ کر میس میں کھانا کھانے کے لئے چلے گئے۔ کھانا کھا کر سٹنگ روم میں آ بیٹھے کہ نو بجے کی خبریں سنیں گے

ابھی بیٹھے خبریں سن ہی رہے تھے کہ دفتر اردلی آیا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دے دیا۔ میں نے اس سے کہا تم تھوڑی دیر باہر ٹھہرو۔ میں نے کاغذ کھولا۔ ڈیوٹی کلرک کی طرف سے وہ رقعہ میرے نام تھا۔

سر۔۔۔!!! حنا صاحبہ نے خود ٹیلی فون کیا ہے اور کہا ہے میں چار بجے خیریت سے گھر پہنچ گئی تھی۔ راستے میں وہ آدمی مجھے مندرہ کے پاس جی ٹی روڈ پر ملے تھے۔ وہی دو آدمی تھے جو صبح سٹیشن پر میں نے دیکھے تھے۔ وہ کار بڑی تیز رفتاری سے چلا رہے تھے۔ میرا لباس ایسا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔ سب خیریت ہے۔ کوئی فکر نہ کریں۔ اپنی خیریت سے مطلع کریں۔

سر میں نے محترمہ کو بتا دیا ہے کہ احمد صاحب شام کو چھ بجے خیریت سے اپنی یونٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ محترمہ سلام کہتی تھیں۔

میں نے باہر آ کر دفتر اردلی کو بتایا کہ آپ واپس دفتر چلے جائیں۔ اور اجمل کو کہیں کہ آپ کا بہت شکریہ۔

دوسرے دن صبح دفتر گیا تو سب سے پہلے میں ایڈجوٹینٹ کو جا کر ملا۔

صاحب کب آئے ہیں۔

سر۔۔۔!!! کل شام کو آیا ہوں۔

آپ تو گاؤں نہیں گئے تھے۔

نہیں سر۔۔۔۔!! پنڈی گیا تھا۔

وہاں کیا کیس ہو گیا۔ جس میں آپ کی گواہی بڑی ضروری تھی۔

میں نے مختصراً ایڈجوٹنیٹ کو سب قصہ سنایا۔

اچھا صاحب میں ذرا کرنل صاحب کو آپ کے آنے کا بتا دوں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ احمد صاحب واپس آئیں تو مجھے فوراً بتائیں۔

ٹھیک ہے صاحب آپ کرنل صاحب کو جا کر بتائیں۔ اور پھر ایڈجوٹنیٹ کرنل صاحب کے پاس چلے گئے۔

تقریباً دو منٹ کے بعد انہوں نے درمیان والے دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر چلا گیا۔

جاتے ہی فوجی دستور کے مطابق کرنل صاحب کو سیلوٹ کیا اور پھر ان کی میز کے سامنے اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

اعجاز تم جاؤ کام کرو۔ کرنل صاحب نے ایڈجوٹنیٹ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ وہ درمیان والے دروازے سے اپنے دفتر میں واپس آ گئے۔

ایڈجوٹنیٹ کے چلے جانے کے بعد کرنل صاحب نے مجھے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے کرسی اٹھا کر ان کی میز کے سامنے رکھ لی اور اس پر آرام سے بیٹھ گیا۔

صاحب اس کیس سے کب فارغ ہوئے ہیں......؟

پرسوں سر.....!!

یہ ایڈجوٹنیٹ جنرل اور ڈائریکٹر آف سگنل کے ساتھ آپ کے خصوصی مراسم کیسے ہیں۔

کوئی مراسم نہیں۔

انہوں نے یکے بعد دیگرے آپ کے لئے مجھے ٹیلی فون کئے ہیں۔

پھر میں نے ان کو گزشتہ دو سال کے واقعات نہایت وضاحت اور تسلسل سے سنائے اور پھر اب میں یہ طویل سفر طے کر کے پنڈی کے اس نئے واقعہ تک آ پہنچا۔ جب کرنل صاحب کو میں نے بتایا کہ کرنل سعید نے حنا کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ اسے ایک ماہ سے قید تنہائی میں بند رکھا ہوا تھا۔ اور اس پر کیسے کیسے انسانیت سوز مظالم ڈھاتا۔ پھر میں نے ان چوہوں والی غیر انسانی سزا کا سنایا تو وہ لرز اٹھے۔

وہ ایک دم چلاتے ہوئے کہہ اٹھے ایسے ننگ انسانیت کو جینے کا کوئی حق نہیں۔

پھر میں نے اپنی وہاں آمد سے لے کر روانگی تک کے پورے واقعات پوری تفصیل سے ان کو سنائے اور آخر میں یہ بتایا کہ موصوف کا فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کنوین ہوا جس میں انہیں دس سال کی قید سخت کی سزا ملی اور ساتھ ہی فوجی ملازمت سے ڈسمس کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ سن کر کرنل سعید پر ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا اور اسی دن فوت ہو گیا۔

تو آپ اس کا کفن دفن کر کے آئے ہیں۔

سب انتظام میں نے اور حنا نے کئے تھے۔

تو اب آپ کا کیا پروگرام ہے....؟

کس چیز کے متعلق سر----!!!

اب آپ اور حنا آپس میں شادی رچا رہے ہیں۔

جی نہیں۔ یہ شادی اگر میں نے کرنی ہوتی تو آج سے دو سال پہلے ہی کر لیتا۔

تو پھر اب تک آپ اتنی جدوجہد کیوں کرتے آ رہے ہیں۔

حنا سے ایک ذہنی اٹیچمنٹ کی وجہ سے۔

اس ذہنی اٹیچمنٹ سے آخر آپ کو کیا حاصل ہوا ہے۔ یا آئندہ کس چیز کا حصول متوقع ہے۔

اس کے ساتھ تعلقات سے مجھے ایک روحانی مسرت نصیب ہوتی ہے۔ اور یہی باطنی مسرت ہی میری زندگی کا ماحصل ہے۔

سر مجھے تو پتہ نہیں۔ نہ ہی میں نے ان سے کوئی گزارش کی۔

یہ سب کیا قصہ ہے......؟ یہ آپ نے اپنے آپ کو اس جلتی آگ میں کیونکر جھونک دیا۔

سر یہ ایک طویل داستان ہے۔ اگر آپ کے پاس اتنا وقت ہو اور آپ یکسوئی سے سن سکیں تو میں جناب کے گوش گزار کروں۔

ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ پوری تفصیل سے یہ قصہ سنائیں۔

سر یہ قصہ نہیں ہے۔ یہ ایک سچی آپ بیتی ہے۔

اچھا آپ تھوڑا توقف کریں۔ پہلے چائے پیتے ہیں۔ آپ کا موڈ بھی کچھ ٹھیک ہو گا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر میں آپ کی سرگزشت سنوں گا۔

ٹھیک ہے سر!

اور پھر کرنل صاحب نے اردلی کو یونٹ کینٹین سے چائے لانے کے لئے کہا۔ اتنی دیر میں ہم بیٹھے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ اتنے میں چائے آ گئی اور ہم چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران میں جب کئی بار ایڈجوٹینٹ اور صوبیدار میجر نے اندر جھانک کر دیکھا کہ اگر کرنل صاحب فارغ ہوں تو وہ سرکاری معاملات کے متعلق ان سے بات چیت کریں۔ لیکن ہر بار وہ جھانک کر اور نادم ہو کر ناکام لوٹ جاتے۔ آخر کار کرنل صاحب نے تنگ آکر دونو دروازوں کی اندر سے کنڈی لگا دی۔

چائے پی چکے تو کرنل صاحب کو میں نے جہلم میں اپنی اور زاہدہ حنا کی حادثاتی ملاقات کا ذکر سنایا۔

ونڈر فل۔ انٹرسٹنگ۔ اچھا تو یہاں سے محبت کی ابتدا ہوئی۔

نہیں سر۔۔۔۔!! محبت نہیں کہہ سکتے۔ اسے آپ محض شناسائی سمجھیں۔

وہ کیوں.....؟

سر میں فوجی لنگروں کی دال روٹی کھانے والا ایک معمولی سا سپاہی محلوں میں رہنے والی بیگمات سے محبت کرنے کا کیسے دعویدار ہو سکتا ہوں۔

ارے میاں محبت میں امیر فقیر کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اچھا تو پھر آگے انہوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آپ کو سروس میٹرز میں کوئی تکلیف۔

نہیں سر۔۔ شکریہ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں۔

اچھا صاحب آپ ایسا کریں۔ یہ سب واقعات آپ کسی کو بھی نہ بتائیں۔

بہتر سر۔۔۔۔۔۔۔!!!

اور پھر میں ان کو سلام کر کے واپس ایڈجوٹینٹ کے پاس آ گیا۔

صاحب بڑی تفصیل سے گپ شپ کی ہے۔

بس سر ایسے ہی باتیں کرتے رہے ہیں۔

اچھا ٹھیک ہے آپ اپنے دفتر کا کام جا کر سنبھال لیں۔ آپ کی عدم موجودگی میں لڑکوں کو بڑی تکلیف ہوئی ہے۔

ٹھیک ہو جائے گا سر.....!!

میں اٹھ کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ میں جب درمیانی دروازے سے اپنے کمرے میں آیا تو میں نے صوبیدار میجر محمد خان کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اردو کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا اور ان سے پوچھا۔

سر کیا تازہ خبر ہے.....؟

بھئی میں تو تمہاری خبر لینے آیا ہوں۔

کیوں خیریت تو ہے۔

نیک بخت آدمی۔ تم دو دن کی چھٹی گئے۔ مہینہ لگا دیا روز کرنل صاحب مجھ سے پوچھتے تھے۔ "صاحب کوئی احمد صاحب کی خبر" زندہ بھی ہیں یا راہی ملک عدم ہو چکے ہیں۔

آپ نے ان کو کیا کہا۔

کیا کہا......؟ یہی کہا۔ کہ جناب ابھی تو زندہ ہیں لیکن اس کے طور طریقے مجھے اچھے نظر نہیں آتے۔ امید ہے جلد ہی راہی ملک عدم ہو جائیں گے۔

آپ نے کیوں کہا۔ آپ کو میرے حالات کی کیا ہے۔ آپ خواہ مخواہ ایسی فضول باتیں کرتے ہیں۔

یہ فضول باتیں ہیں......؟ مجھے تمہاری کوئی خبر ہی نہیں۔

آپ کو کس بات کی خبر ہو۔

تم پنڈی سے ہو تو وہاں یہ سب کیا ہلا گلا ہوا ہے۔ مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ کرنل صاحب نے مجھے بتایا تھا۔

تمہیں کس بات کا پتہ ہو۔ میں چھٹی پر تھا۔ یونٹ سے باہر تھا۔ تم صرف یونٹ کے ذمہ دار ہو۔ خبردار اگر پھر مجھ سے اس طرح کی بات کی

میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ اور پھر وہ غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔

فوج میں صوبیدار میجروں کی یہ خاص ذہنیت ہے کہ اگر کوئی پتہ بھی ہلے تو ان کو پتہ ہونا چاہئے۔ یہ نیک بخت لوگ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔

صوبیدار میجر نے کرنل صاحب کے کان بھرے ۔ ہمارے کرنل صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے صوبیدار میجر کو سمجھا بجھا دیا اور مجھے بلا کر ہم دونوں کی صلح کروا دی۔ اور اس طرح اس برخود غلط قسم کے صوبیدار میجر کی اکڑفوں دور ہو گئی اور پھر وہ میرا دوست بن گیا۔ لیکن اس کے دوست بننے کا مجھے یہ نقصان ہوا کہ وہ نیک بخت آدمی ہر وقت مجھے نصیحتیں ہی کرتا رہتا۔ جوانی میں نصیحتیں ایسے بھی اچھی نہیں لگتیں۔

مجھے پنڈی سے آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ کہ مین گیٹ کا سنتری میرے پاس آیا مجھے ایک چٹ تھما کر دی۔ چٹ پر صرف ایک لفظ لکھا تھا۔ ”حنا“

لیکن میرے لئے یہ معنی کا ایک دفتر تھا۔ وہ سپاہی واپس جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔

اسلم۔ یہ مہمان کہاں ہے۔

سر...!! گیٹ پر اپنی کار میں۔

اچھا میں آتا ہوں۔ آپ ان کو بتا دیں۔ اسلم کے ساتھ میں بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا۔ حنا سامنے کار میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے ویو کیا جسے اس نے ہاتھ ہلا کر ایکناج کیا میں پھر اندر اپنے دفتر میں آ گیا۔ حوالدار خوشی محمد کو بلایا اور اسے بتایا کہ میں مین گیٹ پر جا رہا ہوں اگر کوئی رنگ آئے تو اٹینڈ کر لینا۔

بہتر سر..!

میں گیٹ پر چلا گیا۔ حنا کو میں نے کہا کہ کار کو ذرا پیچھے کر لیں تا کہ ہمارے دفتر سے کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے۔ اس نے کار سڑک کے بائیں۔ بالکل پیچھے (HEDGE) کے ساتھ کھڑی کر دی اور اتر کر نیچے آ گئی۔

کب آئی ہیں آپ......؟ میں نے حنا سے پوچھا۔

پنڈی سے سیدھی تمہارے پاس آئی ہوں۔

فلیٹیز ابھی نہیں گئیں۔

میں نے کہا پہلے حضور کے نیاز حاصل کر لوں۔ وہاں تو جس وقت بھی جائیں جگہ مل جائے گی۔

کتنے دن رہنے کا پروگرام ہے۔

جتنے دن آپ نے کہا۔

میں تو چاہتا ہوں کہ آپ ساری زندگی میری نظروں کے سامنے رہیں۔

میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ آپ اپنا مائنڈ میک اپ کر لیں۔

میں کس وقت آؤں۔

اگر تم کہتے ہو تو میں یہاں ہی رک جاتی ہوں۔ تمہیں چھٹی ہو گی تو ساتھ لیکر چلی جاؤں گی۔

نہیں میں شام کو آؤں گا۔ پھر رات ادھر رہوں گا۔ سویرے تم مجھے یہاں چھوڑ جانا۔

منجور ہے.... لفظ منظور کو اس نے محبت بھرے لہجے میں بگاڑ کر ادا کرتے ہوئے کہا۔

اللہ یار خان کا کیا حال ہے........؟

اگر اسے پتہ چل گیا نا کہ سوہنی کڑی آئی ہوئی ہے تو وہ میرے یونٹ سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دے گا۔

ویسے ہے ٹھیک۔

بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔

اگر اس نے مجھے لے جانے پر آمادگی ظاہر کر دی تو میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

وہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔۔

یقیناً۔

کس وجہ سے۔

اس وجہ سے کہ تمہاری خدمت کرتا ہے اور ہر وقت تمہارے پاس رہتا ہے۔ اور تمہاری کمپنی انجائے کرتا ہے۔

میری کیا کمپنی ہے اس کو۔ میں تو اس کے ساتھ لمبی چوڑی بات ہی نہیں کرتا۔

کیسی بات کرتے ہو۔

صرف ہوں۔ ہاں میں۔

کتنی بری بات ہے۔ ایسے آدمی متکبر ہوتے ہیں۔

احمد نے اپنے دفتر کی طرف پلٹ کر دیکھا تو کمانڈنگ آفیسر برآمدے میں کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔ احمد شرما گیا۔

حنا کو کہنے لگا۔

حنا اب تم جاؤ۔ میں شام کو آؤں گا۔

اگر تم مجھے وقت بتا دو تو میں تمہیں میس سے آکر کولیکٹ کر لوں گی۔

نہیں کیوں تکلیف کرتی ہو۔ میں آسانی سے آجاؤں گا۔

حنا نے کار سٹارٹ کی اور اپنے ہوٹل کی طرف چلی گئی اور احمد اپنے دفتر میں واپس آگیا۔ خوشی محمد ابھی تک ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ احمد نے اس سے پوچھا۔

کیوں چودھری صاحب۔ کوئی رنگ وغیرہ۔

اور تو کوئی خاص نہیں۔ کرنل صاحب نے انٹرکام پر رنگ کیا تھا۔

کوئی کیس منگوایا تھا۔

نہیں آپ کا پوچھتے تھے۔

تو پھر آپ نے کیا کہا۔

میں نے کہا کہ وہ گیٹ پر کسی گیسٹ کے پاس کھڑے ہیں۔

کہنے لگے گیسٹ کو اپنے دفتر میں باعزت طریقے سے بٹھائیں۔ ان کی خاطر تواضع کریں۔ یہ کیا طریقہ ہے۔

آپ نے کیا کہا۔ میں نے کیا کہنا تھا۔ میں خاموش رہا۔ آخر میں مجھ سے کہنے لگے۔ احمد صاحب واپس آئیں تو انہیں کہیں کہ مجھے آکر ملیں۔

میں کرنل صاحب کے پاس گیا۔ سر آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔

احمد صاحب کوئی سولین مہمان آئیں تو انہیں اندر لے آئیں۔ اپنے پاس دفتر میں بٹھائیں۔ یا اگر چاہیں تو میس میں انہیں لے جائیں۔ یہ کتنا برا لگتا ہے کہ آپ نے یونیفارم پہنی ہوئی ہے اور قیدیوں کی طرح فینس کے پاس کھڑے ہو کر آپ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔

سر گیسٹ خاتون تھی۔ خواتین کو اندر لانا اچھا نہیں لگتا۔

کیوں اچھا نہیں لگتا۔

سر اگر میں ایسا کرتا تو سب سے پہلے صوبیدار میجر صاحب کا پارہ چڑھ جاتا۔ فوراً بھاگے بھاگے آپ کے پاس شکایت کرتے۔ اور اگر شنوائی نہ ہوتی تو پھر ایک گھنٹہ مجھے واعظ و نصیحت کرتے۔

آپ کی جب بھی کوئی لیڈی گیسٹ آئے اسے فوراً اندر اپنے دفتر میں لا کر بٹھایا کریں۔ اور چائے وغیرہ پلایا کریں۔

سر.........!!!! میری وہی پنڈی والی دوست خاتون آئی ہیں۔ فلیٹیز میں ٹھہری ہیں۔ آپ از راہ کرم مجھے اجازت دیں کہ میں ڈیوٹی آورز کے بعد وہاں چلا جایا کروں اور دوسرے دن صبح سویرے اپنی ڈیوٹی پر آجایا کروں۔

یس بائی آل مینز (Yes by all means) ۔ صوبیدار میجر کو ذرا بتا دینا۔

سر وہ مفت میں ناراض ہو گا۔ کہ میں نے ڈائریکٹ کمانڈنگ آفیسر صاحب کو کیوں کنٹیکٹ کیا ہے۔

اچھا میں بتا دوں گا اسے۔ کرنل صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

سر.....!! بہت شکریہ آپ کا۔

دفتری اوقات ختم ہوئے۔ میں میس میں آیا۔ لباس تبدیل کیا کھانا کھایا اور پھر مختصر سا سامان ایک چھوٹے سے بیگ میں ڈال کر چلنے لگا۔ تو میں نے اللہ یار خان کو بتایا۔

اللہ یار خان شہر میں میرے مہمان آئے ہیں پنڈی سے۔ وہ چار پانچ دن ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ میں بھی وہاں ہی جا رہا ہوں۔ صبح آ جایا کروں گا۔ تم فکر مت کرنا کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔

سر ابھی تو آپ پنڈی سے آئے ہیں۔ مہمان آپ کے پیچھے ہی آ گئے ہیں۔ آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

میں نے اللہ یار کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہنس کر کمرے سے باہر آ گیا۔

میں فلیٹیز میں پہنچا تو سیدھا استقبالیہ میں گیا۔ ایک کلرک ایک چھوٹے سے میز پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے جا کر پوچھا۔ جناب محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ سے مجھے ملنا ہے۔

آپ کہاں سے آئے ہیں؟

میں یہاں لاہور ہی میں رہتا ہوں۔

آپ ان کے کیا لگتے ہیں.....؟

میں ان کا چاچا لگتا ہوں۔

بھائی صاحب آپ آدمی تو ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہیں لیکن باتیں بڑی ٹیڑھی کرتے ہیں۔

ارے نہیں نیک بخت آدمی میں حقیقت میں ان کا چاچا ہی لگتا ہوں۔ آپ ان سے ٹیلی فون پر پوچھ لیں۔ اور ان کو بتا دیں کہ آپ کے چاچا احمد خان آئے ہیں۔

اچھا پوچھ لیتا ہوں۔ "رنگ کرتا ہے" آپ سات نمبر کمرے سے بول رہی ہیں نا۔

جی جناب۔ آپ کون بول رہے ہیں۔

محترمہ۔ استقبالیہ سے کلرک بول رہا ہوں۔ آپ کا نام زاہدہ حنا ہے۔

تمہارے پاس لکھا ہوا نہیں ہے۔

لکھا ہوا تو ہے۔

تو اب آپ کی کیا پرابلم ہے۔

محترمہ....!!! آپ کے چاچا احمد خان صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔

اچھا انہیں میرے کمرے میں بھیج دو۔

ہوٹل کا ایک نوکر چاچا احمد خان کو زاہدہ حنا کے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ احمد نے روم نمبر سات کا دروازہ ناک کیا۔

کون صاحب..........؟ حنا نے بستر سے لیٹے لیٹے پوچھا۔

محترمہ میں ہوں آپ کا چاچا احمد خان۔

حنا نے احمد کی آواز پہچان لی اور ایک دم لپک کر دروازے پر آئی۔ کنڈی کھولی اور بے تحاشا ہنستے ہوئے احمد سے لپٹ گئی۔ اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔ حنا نے ڈبل بیڈ روم لیا ہوا تھا۔ حنا کے ساتھ ایک نہایت ہی صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا۔ حنا یہ تو وہی کمرہ نہیں جس میں ہم پچھلی دفعہ آ کر ٹھہرے تھے۔

جی ہاں۔ وہی کمرہ ہے۔ خصوصی طور پر میں نے منیجر کے پاس جا کر یہ کمرہ لیا ہے۔ محض اس لئے کہ تمہاری اس کمرے کے ساتھ کتنی اٹیچمنٹ ہے۔

اور تم پھر سے میرے ساتھ اس کمرے میں چند روز رہو گے۔ تو گزشتہ چھ ماہ کے سب رنج و غم بھول جاؤ گے۔

یہ تو تم نے عقل مندی والی بات کی ہے۔

جناب میں ہوں ہی عقل مند۔ کوئی تمہاری طرح بدھو تھوڑی ہوں۔

اور وہ دونو ہنس پڑے۔ اور حنا نے اٹھ کر اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر دیوانوں کی طرح چومنا شروع کر دیا۔

مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ کہیں دور سے آذان کی آواز آ رہی تھی۔ احمد

نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور نماز والے کپڑے پہن کر بیگ سے جانماز نکال کر وہاں ہی قالین پر بچھا لیا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز مغرب کے بعد نماز شکرانہ پڑھی اور کافی دیر تک وہ مصلے پر بیٹھا اوراد و وظائف میں مشغول رہا۔ حنا اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ دل میں کہتی کاش میرا بھی ایسا خاوند ہوتا۔

مدت ہوئی تھی حنا نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ نہ جانے اس پر کس بات کا نفسیاتی اثر ہوا کہ اس نے بھی کپڑے تبدیل کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ احمد اس کو بڑی حیران کن نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حنا کو نماز پڑھنا نہیں آتا۔ وہ نماز پڑھ چکی تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

حنا میرے لئے بھی دعا مانگنا کہ اللہ میری مراد پوری کرے۔

اللہ پاک نے تمہاری مراد پہلے ہی پوری کر دی ہے۔

وہ بڑی دیر تک بیٹھے میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں کرتے رہے۔ وہ احمد کی گود میں سر رکھے لیٹی رہی اور گزشتہ چھ ماہ کے اذیت ناک واقعات حنا اس کو سناتی رہی۔

حنا اب تمہارا پنڈی کب تک رہنے کا پروگرام ہے۔

احمد سب سے ضروری کام ہے وہ میں آپ کو بتانا چاہتی تھی۔

کیا تم کسی کے ساتھ شادی کر رہی ہو۔

تمہیں اتنا بھی پتا نہیں کہ عدت کے دوران میں دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔

ویسے خیال کیا ہے۔

تم فضول باتیں نہ کرو۔ کبھی سیریس ہو کر بھی بات کیا کرو۔

محترمہ میں بالکل سیریس ہوں۔

اس موضوع پر تم سے بات کرنا فضول ہے۔

چلو چھوڑو اپنا پروگرام بتاؤ۔

میرا پروگرام یہ ہے کہ میں اب ایک ہفتہ یا دس دن تمہارے ساتھ رہوں گی۔ پھر میں پنڈی واپس جا کر بابا شفیع کی دو بیٹیوں کی شادی کا انتظام کرنا چاہتی

ہوں۔ مجھے یہ سن کر بے حد رنج ہوا کہ بابا کے پاس ان بچیوں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے ان کی شادی کہیں نہیں ہو رہی۔

تو آپ ان کے لئے سب جہیز وغیرہ کا انتظام کریں گی۔

جی ہاں۔ میں نے سوچا ہے کہ سعید کے جتنے ڈیوز ہیں۔ وہ میں لے لوں۔ ورنہ وہ سب لیپس ہو جائیں گے۔ اور یہ پیسے لے کر میں بابا محمد شفیع کی بیٹیوں کی شادی کر دوں۔ پانچ ہزار روپے میں گل شیر خان کے بیوی بچوں کو منی آرڈر کر دوں۔ اور تمہاری اجازت سے باقی سب رقم میں تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دوں۔

یہ کس خوشی میں۔

اس خوشی میں کہ آپ نے ہر کڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اور اپنے نفع نقصان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

میں تو اپنا معاوضہ کب کا وصول کر چکا ہوں۔

کیا وصول کیا ہے..؟ رسوائی۔ بدنامی اور ذلت۔

مجھے تمہاری جو محبت ملی ہے۔ وہ دنیا بھر کے زر و جواہر سے میرے لئے زیادہ قیمتی ہے۔

محبت سے تو پیٹ نہیں بھر سکتا۔ کل تم اپنی بیٹیوں کی شادی کرو گے۔ تو تمہارے پاس انہیں دینے کے لئے کیا ہے۔

یہ میرا درد سر ہے۔

میرا بھی تو درد سر ہے۔ میری بھی تو وہ اسی طرح بیٹیاں ہیں جیسی تمہاری ہیں۔

وہ ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کے فضل سے ان کا باپ زندہ ہے۔

احمد.... باپ تو میرا بھی زندہ ہے۔ لیکن اس نے کبھی آج تک ہمیں نہیں پوچھا۔

اچھا چھوڑو۔ اس قصے کو میری بات سنو۔

ہاں کہو۔

بابا محمد شفیع کی دونو بیٹیوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی کرو۔ گل شیر

خان کے گھر بھی پانچ ہزار روپے ضرور بھیجو۔ بقایا رقم میری ناچیز رائے میں پاکستان آرمی کے شہیدوں کے بچوں اور ان کی بیواؤں کی دیکھ بھال کے فنڈ میں جمع کرا دو۔

اگر تم نے میری استدعا ٹھکرا دی تو پھر ایسا ہی کروں گی۔

کھانا کھانے کے لئے ادھر جائیں گے یا ادھر منگانا ہے۔ حنا نے احمد کی مرضی معلوم کرنے کے لئے اس سے پوچھا۔

ادھر منگا لو تو اچھا ہے۔

ٹھیک ہے۔

حنا نے منیجر کو ٹیلی فون کر کے مینو بتا دیا۔ اور اسے کہا کہ دو آدمیوں کے لئے یہ کھانا آدھے گھنٹے میں بھجوا دے۔

حنا۔ ابھی تک انڈیا سے لائے ہوئے کتنے ہیرے جواہرات تمہارے پاس ہیں۔

کیوں آپ کو کوئی ضرورت ہیں......؟

بالکل نہیں۔

میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ سعید والی وہ بقایا رقم تم اپنے پاس کیوں نہیں رکھ لیتی۔ تقریباً دو سال سے تم بادشاہوں کی طرح سے دونو ہاتھوں سے لٹا رہی ہو۔ اگر تمہارا وہ قارون کا خزانہ ختم ہو گیا تو تم ایک ایک پیسے کو ترسو گی۔ یہ لوگ تمہیں ایک وقت کی روٹی دے کر تمہارے ساتھ جنسی مواصلت کے خواہاں ہوں گے۔ یہ اب تک جو تمہاری عصمت بچی ہوئی ہے یہ پیسوں کے زور سے بچی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات میں آپ خود اگر چاہیں تو تب کوئی تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ لیکن جس دن آپ کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو گا تو ہر طرف سے بھوکے کتے تمہارا یہ خوبصورت اور جوان جسم نوچنے کے لئے تم پر جھپٹنے کے ہر لمحہ تیار ہوں گے۔

حنا صاحبہ......! اس سیم و زر میں بڑی طاقت ہے یہ پیسے تم ضائع نہ کرو۔ سعید کے ڈیوز جو بچتے ہیں سنبھال کر رکھ لو۔ اور میری ناچیز رائے میں آخر کار آپ کو واپس انڈیا اپنی ماں کے پاس جانا ہی پڑے گا۔

احمد خدا کے لئے مجھے تم اس دہکتے ہوئے جہنم میں پھر لوٹ کر جانے کا

مشورہ نہ دو۔ جہاں موجو ہے۔ جہاں خوشیا ہے۔ یہاں پاکستان میں مجھے تمہاری وجہ سے بڑا حوصلہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں ایک ایسے سائبان کے نیچے بیٹھی ہوں۔ جس کے سائے میں بیٹھ کر میں ہر قسم کی کلفتوں سے محفوظ ہوں۔

حنا تمہارا کہنا بجا ہے۔ لیکن یہاں تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میں کچھ عرصے کے بعد فوج سے سبکدوش ہو کر گاؤں چلا جاؤں گا۔ ہمارے ہاں ایک دفعہ آدمی اگر گاؤں چلا جائے تو پھر وہ باقی دنیا سے کٹ کر وہاں کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر وہ شہروں کا رخ نہیں کرتا۔

میں خود تم سے کنٹیکٹ رکھوں گی

وہاں رہتے ہوئے پھر میں تمہاری مدد کو نہیں آ سکتا۔

تو میں ہی تمہارے گاؤں شفٹ کر آتی ہوں۔

کس حیثیت سے۔

ایک دوست کی حیثیت سے۔

دیہی زندگی میں ایک غیر مرد کی غیر عورت کے ساتھ دوستی کو وہ لوگ سو فیصد جنسی تعلقات پر مبنی دوستی سمجھتے ہیں۔۔ وہاں اس کے علاوہ ان کی نظر میں اور کسی قسم کی دوستی کا کوئی کنسیپٹ ہی نہیں ہے۔ ہمارے دیہی معاشرے میں کوئی جوان عورت کسی مرد سے یوں کھلے بندوں نہیں مل سکتی۔ چاہے ان کے درمیان کسی قسم کے کوئی جنسی تعلقات نہ بھی ہوں۔

ایک اور ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔

وہ کیا۔ حنا نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

بجائے بمبئی جانے کے آپ لکھنؤ نواب صاحب کے پاس چلی جائیں۔

نہ جانے وہ مجھے قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

ضرور قبول کریں گے۔ اگر تم وہاں سیٹل نہ ہو سکی تو واپس آ جانا۔ پھر یہاں پاکستان ہی میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر تمہاری شادی کر دوں گا۔

ایک دفعہ تم مجھے اندھے کنوئیں میں دھکا ضرور دو گے۔ تم چاہتے ہو کہ میں ایک دفعہ انڈیا جاؤں اور پھر خرابی بسیار کے بعد لوٹ کر آؤں۔

ایک دفعہ کوشش کر کے دیکھ لو۔

تم یہاں ہی کوئی غریب سا اور شریف سا آدمی دیکھ لو میں اس کے ساتھ شادی کو لوں گی۔ میں انڈیا واپس نہیں جانا چاہتی۔ کوئی خوشیا مجھے اپنی داشتہ بنا کر رکھ لے گا اور میری ساری پونجی دارو پینے میں پھونک دے گا۔ جب یہ پونجی ختم ہو جائے گی تو وہ ڈنڈوں سے مار مار کر سیڑھیوں سے لڑھکا دے گا۔ اور میں زمین تک آتے آتے لہولہان ہو چکی ہوں گی۔ اور میرے دانت ٹوٹ چکے ہوں گے۔ میں لہو لہان فٹ پاتھوں اور تھڑوں پر راتیں بسر کروں گی اور وہاں فٹ پاتھوں اور تھڑوں کے خوشئے اپنی جنسی بھوک مٹایا کریں گے اور پھر کچھ عرصے کے بعد جب میں کئی قسم کی جنسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاؤں گی تو وہ بھی مجھے دھتکار کر وہاں اپنی سلطنت کی حدود سے باہر بھگا دیں گے۔ اور پھر کچھ دنوں کے لئے میں نئے خوشیوں کے لئے مشق ستم بنی رہوں گی۔ اسی طرح جنس کے اس بحر ذخار میں ڈبکیاں کھاتے کھاتے ایک دن فٹ پاتھ پر ہی مر جاؤں گی۔ فٹ پاتھ پر مرنے والوں پر کوئی پرانی چادر بھی نہیں ڈالتا۔

حتیٰ کہ مکھیاں اسے کالا لباس پہنا دیتی ہیں۔ جب اس لاش کے ذریعے بہت زیادہ تعفن پھیل جاتا ہے تو کارپوریشن والے کمال مہربانی سے اس لاش کو اٹھا کر کوڑے کرکٹ کے ساتھ اپنے اس ٹرک میں ڈال کر لے جاتے ہیں۔ جانے کہاں؟

کون کفن دفن کرتا ہو گا۔ کوڑے کے ساتھ شہر سے میلوں دور کہیں ویرانے میں وہ لوگ پھینک دیتے ہوں گے۔ احمد انسانیت کی یہ کتنی بڑی تذلیل ہے۔ کم از کم یہاں مجھ سے ایسا تو نہیں ہو گا۔

تم نے میرے سر پر جو ہاتھ رکھا تھا تو میں خوش تھی۔ تمہاری (STRENGTH) کی وجہ سے میں سعید کے مظالم کے آگے ڈٹ گئی۔ اگر میں یہ چار کوڑیاں اس کے آگے ڈال دیتی تو کیا وہ عمر بھر مجھے اپنی بیوی بنا کر نہ رکھتا۔ دو وقت کی روٹی نہ دیتا۔

حنا..... تمہاری یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن میری جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے کبھی آپ کو کوئی فالس ہوپ (False hope) نہیں دلائی۔ ہمیشہ آپ سے صاف صاف باتیں کی ہیں۔ شروع ہی میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں آپ کو اپنا

نہیں سکتا۔ اور نہ ہی غلط تعلقات قائم کر سکتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں بہت ہی معمولی آدمی ہوں۔ ان کرنیلوں ' جرنیلوں کا مقابلہ تو کیا میں ان کا لگایا ہوا ایک دھچکا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں آپ کے کہنے پر سروس چھوڑ سکتا تھا اور ان کرنیلوں جرنیلوں سے جان چھڑا سکتا تھا۔ لیکن میرے پاؤں میں میری بیوی اور بچوں نے جو بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ میں ان کو نہ توڑ سکتا تھا۔ وہ بیڑیاں اب بھی میرے پاؤں میں موجود ہیں۔ میں ان کو نہیں توڑ سکتا۔

مجھے ایک دفعہ تم اپنے ساتھ اپنے گاؤں تو لے جاؤ۔ میں تمہاری بیگم سے ملوں۔ تمہاری بچیوں سے ملوں۔

حنا میرے گاؤں میں بیگمات قسم کی کوئی مخلوق نہیں۔ ہمارے ہاں بیویاں ہوتی ہیں۔ جو زندگی بھر مردوں کی خدمت کرتی رہتی ہیں اور آخر کار تھک ہار کر ایک دن کفن اوڑھ کر قبر میں اتر جاتی ہیں۔ اور اپنے پیچھے اپنی جوان بیٹیوں کو چھوڑ جاتی ہیں۔ جو ان کے مرنے کے بعد اپنی ماں کی جگہ یہ سب مشقت اپنے سر ڈال لیتی ہیں۔ اور زندگی بھر ماں کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن رہتی ہیں۔

اگر تمہیں میں وہاں لے جاؤں تو گاؤں کے سب باسی ہم دونو کو عزت کی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ میں طعن و تشنیع کے تیر نہیں سہہ سکتا۔

لوگ اس پر ہی اکتفا نہ کریں گے۔ بلکہ میری بیوی اور بچیوں کو بھی نشانہ بنائیں گے۔

تو چلو چھوڑو میں نہیں چلتی۔

بیرا کھانا لے آیا اور اس نے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے میز پر رکھ دیا۔ جگ میں پانی بھر دیا اور دو گلاس دھو کر رکھ دیئے اور دو کرسیاں اس میز کے ساتھ لا کر رکھ دیں۔

بیگم صاحبہ۔ میں برتن صبح ناشتہ دینے آؤں گا تو لے جاؤں گا۔

ٹھیک ہے۔

اور وہ بیرا سلام کر کے واپس چلا گیا۔ ہم دونو نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا

کھانے کے بعد وہ برتن وہاں ہی میز پر اکٹھے کر کے ایک کپڑے سے حنا نے ڈھانپ دیئے۔

احمد تھوڑی دیر کے لئے سیر نہ کر آئیں۔

نہیں بیٹھو یہاں ہی باتیں کریں گے۔

سیر کرتے ہوئے راستے میں باتیں بھی کرتے جائیں گے۔

نہیں دلجمعی سے باتیں نہیں ہو سکتیں۔ توجہ بٹ جاتی ہے۔

آپ نے کوئی شعر کہنے ہیں۔

شعر کہنے سے بھی زیادہ لطیف گفتگو کرنا ہے۔

جیسے تمہاری مرضی ہو۔ ہماری یہ باتیں تو اس مختصر سی زندگی میں نہیں ختم ہو سکتیں۔

ارے بیگم صاحبہ۔ اللہ نے جو فراغت دی ہے اس کو تو مزے سے کاٹیں۔

چلیں آپ کی بات مان لی ہے۔

حنا۔ یہ سعید صاحب کی مجھ سے کیا پرخاش تھی۔ میں نے تو تم دونو کی شادی میں صدق دل سے کوشش کی تھی جو آخر کار بار آور ہوئی۔

چھوڑو احمد اس معاملے کو۔

پھر بھی آخر پتہ تو چلے۔

اسے شروع سے لے کر آخری دم تک یہ یقین کامل تھا کہ ہم دونو کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں۔

تم نے اسے یقین نہیں دلایا۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کے دل سے یہ خلش دور ہو جائے۔ لیکن اس کے ذہن میں کوئی شک کی ایسی گرہ پڑ گئی تھی جو سلجھنے میں نہ آتی تھی۔

تم اسے کہہ دیتی کہ اگر تم مجھے پاکباز نہیں سمجھتے تو مجھے فارغ کر دو۔

وہ فارغ کیسے کرتا وہ تو میرے زیورات ' زرو جواہرات اور بینک بیلنس ہتھیانے کی فکر میں تھا۔

وہ اس قدر دولت کو اکٹھا کر کے اسے کیا کرنا چاہتا تھا۔

وہ کہتا تھا کہ میں کراچی سوسائٹی کے علاقے میں ایک شاندار کوٹھی بنانا چاہتا ہوں۔

وہ بیکٹو کی پوٹنٹ تھا۔

بس ٹھیک تھا۔

اس عرصے میں تمہیں (CONCEPTION) نہیں ہوئی۔

اس کے لئے وہ مجھے کوستا تھا۔

اور تم اسے کوستی ہو گی۔

وہ دونو رات بھر ایک ہی بستر میں لیٹے ایک دوسرے کے ساتھ پیاری پیاری باتیں کرتے رہے۔ ان دونو کے درمیان اتنی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ وہ ایک ہی بستر میں رات کی تنہائیوں میں سوتے ہوئے اپنی حد سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ اور دونو ایک دوسرے کے بازوؤں پر سر رکھے رات باتیں کرنے میں گزار دیتے۔ اس بات کو کوئی بھی ذی ہوش انسان ماننے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ ان کی محبت جنسی آلودگی سے پاک تھی۔ اور یہی جذبہ ان دونو کو ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے دیتا تھا۔

کہیں دور موذن نے اذان دینا شروع کی۔ "اللہ اکبر" جونہی اللہ پاک کے مبارک نام کی آواز ان کے کان میں پڑی احمد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم میں جا کر وضو کیا اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد حنا نے بھی اٹھ کر وضو کیا اور اس انتظار میں آ کر بیٹھ گئی کہ احمد مصلیٰ خالی کرے تو میں بھی نماز پڑھتی ہوں۔ احمد نے جب یہ دیکھا تو اس نے جا نماز حنا کے لئے فوراً ہی خالی کر دیا۔ اور خوڈ اٹھ کر اپنے بستر پر اوراد و وظائف میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونو فارغ ہو گئے۔ احمد کے پاس قرآن کریم نہ تھا۔ ورنہ وہ نماز فجر کے بعد تلاوت بھی کرتا تھا۔

احمد کہنے لگا۔ حنا۔ میں ایک گھنٹہ سونا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے چھ بجے جگا دیں۔ تاکہ آپ مجھے ساڑھے چھ بجے میس میں چھوڑ آئیں۔ میں ناشتہ کر کے ساڑھے سات بجے دفتر چلا جاؤں گا۔

ادھر ہی غسل کر لینا۔ ناشتہ سات بجے اکٹھا کریں گے۔ پھر میں آپ کو سیدھا دفتر چھوڑ آؤں گی۔

حضور میں نے شیو بھی کرنا ہے۔ دفتر جانے سے پہلے یونیفارم بھی تو پہنی پڑے گی۔

اچھا ٹھیک ہے۔ تم سو جاؤ۔ میں تمہیں چھ بجے جگا دوں گی۔

احمد اپنے بستر میں سو گیا۔ حنا تھوڑی دیر کے لئے بیٹھی کوئی کتاب دیکھتی رہی۔ چھ بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے کہ احمد کو جگا دیا وہ دونو کمرہ مقفل کر کے نیچے آ گئے۔ اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ دس منٹ کے بعد حنا احمد کو لے کر اس کی میس میں پہنچ گئی۔ سب لوگ اٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے احمد کو گاڑی سے اترتے ہوئے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ فوجی حضرات جب بھی کسی جوان' غیر مرد اور عورت کو اکٹھا دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن فوراً سیکس کی طرف جاتا ہے۔

حنا جلدی سے گاڑی لے کر واپس چلی گئی۔ اور احمد اپنے کمرے کی طرف۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے پچھلی طرف جا کر دیکھا تو اللہ یار خان اپنی چارپائی پر بیٹھا چائے اور پوری کھا رہا تھا۔ احمد کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اللہ یار تم بیٹھو چائے پیو۔ اور چائے پی کر ذرا باربر کو دیکھو۔

سر وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔ آپ کمرہ کھولیں۔ میں اسے پکڑ کر لے آتا ہوں۔

احمد اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور اللہ یار خان جلدی جلدی چائے پی کر نور حسین باربر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ ساتھ کے کمرے میں صوبیدار صادق کی شیو بنا رہا تھا۔ اللہ یار خان نے اس کو کہا۔

بھائی...!! نور حسین۔ احمد صاحب آ گئے ہیں۔ آپ جلدی سے ان کی شیو بنا دیں۔

دو منٹ میں آیا۔

جلدی ہی نور حسین آ گیا۔ اس نے شیو بنائی اور پھر احمد صاحب نے غسل کیا۔ اتنے میں اللہ یار خان ان کے لئے ناشتہ لے آیا ناشتہ کرنے کے بعد وہ وردی پہن کر

سوا سات بجے دفتر چلے گئے۔ وہ دفتر پہنچے تو ابھی تک ایڈجوٹنٹ اور کرنل صاحب نہ آئے تھے۔

ٹھیک ساڑھے سات بجے سب آفیسرز اپنے اپنے کام پر پہنچ گئے۔ اور فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ کوئی ایک بجے کا وقت ہو گا کہ کرنل صاحب کی بیگم حنا کو ساتھ لے کر احمد کے دفتر میں آ گئی۔ اس وقت ان کے پاس صوبیدار میجر اور دو تین اور J.C.OS بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبیدار میجر نے کرنل صاحب کی بیگم کو دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے J.C.OS بھی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وہ سب اکٹھے وہاں سے نکل کر صوبیدار میجر کے دفتر کی طرف چلے گئے۔

احمد صاحب میں آپ کے گیسٹ کو یہاں ہی لے آئی ہوں۔

میڈم.... بہت شکریہ آپ کا۔

آپ ان کو اندر کیوں نہیں آنے دیتے.......؟ بے چاری گیٹ کے باہر کار میں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔

میڈم ------!!! قانوناً لیڈیز کو فوجی بیرکس میں نہیں آنا چاہئے۔ اب صوبیدار میجر نے آپ کو اور انہیں اکٹھا دیکھ لیا ہے تو ممکن ہے کچھ نہ کہیں ورنہ اگر حنا اکیلی ہوتی تو وہ کب کے کرنل صاحب کے پاس میری شکایت لے کر پہنچے ہوئے ہوتے۔

کرنل صاحب کو پتہ ہے کہ ہم دونو آپ کے پاس بیٹھی ہیں۔

تو آپ نے میری پیشی کروا دی۔ احمد نے ندامتاً کہا۔

کرنل صاحب کے کہنے پر تو میں ان کو لے کر یہاں آئی ہوں۔

وہ کیسے.........؟

ہوا یوں۔ کہ میں جب مین گیٹ پر آئی تو میں نے ان کو گیٹ پر کار میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں نے اپنی کار ان کے بالکل قریب لا کر کھڑی کی اور پھر ان سے پوچھا۔ آپ یہاں کیسے کھڑی ہوئی ہیں۔ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں۔ انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ احمد صاحب میرے دوست ہیں۔ دفتری اوقات کے خاتمہ پر مجھے ان کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ تو میں نے ان سے کہا۔

تو آپ باہر کیوں کھڑی ہیں۔ اندر آ جائیے۔

احمد صاحب نے مجھے منع کر رکھا ہے۔ کہ آپ کبھی بھی مجھ سے ملنے یونٹ لائنز میں نہ آیا کریں۔

ایسے لوگوں سے کیا دوستی کرنا۔ جو اتنے مصلحت اندیش ہوں۔ محبت کرنے والے دل تو مصلحت اندیش نہیں ہوتے۔

انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے جا کر کرنل صاحب کو یہ بات بتائی وہ خود میرے ساتھ چل کر گیٹ پر آئے اور حنا کو خود اندر لے کر آئے۔ ہم دونو کر چائے پینے کے لئے کہا لیکن حنا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذوری کا اظہار کیا۔ اس پر کرنل صاحب نے مجھے کہا کہ آپ محترمہ کو احمد صاحب کے دفتر میں چھوڑ کر آئیں۔ اور احمد صاحب کو کہیں کہ حنا صاحبہ کو آپ کہہ دیں کہ یہ جب بھی آپ کے پاس دفتر میں یا میس میں آنا چاہیں ان کو میری طرف سے اندر آنے کی ہر وقت اجازت ہے۔

میڈم۔ آپ کا اور کرنل صاحب کا بے حد شکریہ۔

احمد صاحب اب تو ہم چائے پینے کے حقدار ہیں۔

بالکل سو فیصدی۔ احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

احمد نے دفتر اردلی کو چائے اور ساتھ کچھ کھانے کے لئے لانے کو کہا۔ اور پھر وہ فوراً چائے اور گرم گرم پکوڑے لے کر آ گیا۔ دفتر کے سب کلرک حنا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ احمد صاحب اور ان کے معزز مہمان چائے پینے میں مصروف تھے کہ کرنل صاحب بھی احمد صاحب کے دفتر میں آ گئے۔ احمد صاحب اٹھے تو خواتین بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کرنل صاحب کہنے لگے۔ بھئی ہمارے حصے کی چائے کہاں ہے۔

احمد صاحب چائے ڈالنے لگے تو کرنل صاحب آفس ٹیبل پر ہی بیٹھ کر چائے پکوڑے کھانے لگ گئے۔

ڈیڑھ بجے تک احمد صاحب کے کمرے میں یہ سب بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے۔ جب کرنل صاحب اٹھے تو انہوں نے ایڈجوٹینٹ کو بلایا۔

احمد صاحب کے گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔ یہ فلیٹز میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ ان کو ٹھیک ڈیڑھ بجے فارغ کر دیا کریں۔ اگر کوئی کام رہ جائے تو آپ دیکھ لیا

کریں۔

بہت اچھا سر۔

کرنل صاحب اور ان کی بیگم اٹھ کر چلے گئے۔ ایڈجوٹینٹ نے احمد صاحب کو کہا۔

صاحب آپ بھی جائیں۔ کوئی پینڈنگ کام ہے.......؟

نہیں سر...!!

اچھا آپ دفتر کی چابیاں حوالدار خوشی محمد کو دے دیں۔ اور آپ جائیں۔

شکریہ۔

احمد حنا کے ساتھ اس کی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔

حضور اب کیا حکم ہے.....؟ ہوٹل چلنا ہے یا کہیں اور۔

میس چلتے ہیں۔ میں کپڑے بھی بدلوں گا۔ کھانا یہاں کھا لیتے ہیں۔ پھر چلے جاتے ہیں۔

نہیں کھانا وہاں ہی چل کر کھائیں گے۔

میں نہیں چاہتی کہ اتنی دیر میری کار تمہارے کمرے کے سامنے کھڑی رہے۔ سب لوگ خواہ مخواہ متجسس نظروں سے دیکھنے لگ جائیں گے۔ تمہارے اس دوست صوبیدار میجر کو خواہ مخواہ موقع مل جائے گا۔

نہیں اب تو کرنل صاحب نے مجھے اجازت بھی دے دی ہے۔

ٹھیک ہے لیکن پھر بھی یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن اللہ یار خان سے تو تم مل لو نا۔ وہ بیچارہ روز پوچھتا ہے۔ صاحب جی وہ سوہنی کڑی کہاں ہے........؟

ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے یاد دلا دیا۔ اللہ یار خان سے تو میں ضرور ملوں گی۔

لیکن محترمہ میری موجودگی میں ملنا۔

وہ کیوں........؟

کہیں اٹھا کر تمہیں اپنی کوٹھڑی میں نہ لے جائے۔

نہیں۔ احمد تم ایسی گپیں مت ہانکا کرو۔ میں جہلم اس سے کئی بار ملی ہوں۔ انتہائی شریف آدمی ہے۔

اس لئے تم شریف کہتی ہو کہ اس کے ہتھے کبھی نہیں چڑھی۔ اگر چڑھ جاتی تو پتہ چل جاتا۔

چھوڑو ایسی فضول باتیں نہ کرو۔

وہ دفتر سے (J.C.OS) میس آ گئے۔ حنا نے گاڑی میس کے احاطے سے باہر کھلی جگہ پر روک لی اور پھر احمد کو کہا۔ کہ تم جاؤ دس منٹ میں چینج کر کے آ جاؤ۔ احمد چلا گیا۔ اور حنا نے گاڑی کے شیشے چڑھا لئے۔ اور کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ اللہ یار خان احمد کا کچھ سامان لے کر آیا۔ حنا نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اللہ یار خان نے گاڑی کے شیشے کو ہلکا سا ناک کیا۔ حنا نے کتاب ہٹا کر دیکھا۔ باہر اللہ یار خان کچھ سامان اٹھائے کھڑا تھا۔ حنا نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور اللہ یار خان کو کہا۔

کہو اللہ یار خان کیا حال ہے............؟

ٹھیک ہے بیگم صاحب۔۔

یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں...........؟

صاحب نے یہ سامان دیا ہے۔ کہ گاڑی میں رکھ آؤ۔

اچھا مجھے دے دو۔ اور اللہ یار خان نے وہ سامان حنا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لے کر وہ پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور اللہ یار واپس چلا گیا تقریباً دو منٹ کے بعد احمد آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی جو اس نے آ کر گاڑی کے ڈیش بورڈ پر لا کر رکھ دی۔

احمد یہ کیا ہے...........؟

قرآن کریم ہے۔

اچھا اچھا۔ حنا نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

احمد گاڑی میں بیٹھ گیا اور فلیٹز کی طرف چلے گئے۔ تقریباً دس منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ جاتے ہی انہوں نے واش کیا۔ کپڑے بدلے اور پھر حنا نے منیجر کو ٹیلی فون

کیا کہ وہ دو آدمیوں کا کھانا میرے کمرے میں بھیج دیں۔ جلد ہی کھانا آگیا اور وہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کھانا کھا چکے تو احمد نماز پڑھنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی حنا نے بھی وضو کیا اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ اس سے پہلے احمد کا خیال تھا کہ شاید حنا کو نماز پڑھنا نہ آتی ہو۔ لیکن اس کا یہ شک بھی دور ہو گیا۔ وہ احمد سے کہنے لگی۔

احمد اگر میں کچھ عرصہ تمہارے ساتھ رہتی تو دین کی سمجھ تو مجھے آجاتی۔
میں تو جس ماحول میں پلی بڑھی ہوں۔ وہاں نماز روزے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔
میں چھ ماہ سعید کے ساتھ بھی رہی ہوں۔ میں نے اسے ایک دن بھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ احمد اگر آدمی نماز پڑھ لے تو اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔
ہاں یہ بات تو حنا درست ہے۔ اگر ہم اکٹھے رہتے تو ہماری دنیا ہی بدل جاتی۔
میں سمجھتی ہوں کہ یہ ارتفاع (SUBLIMATION) ہی انسانیت کی معراج ہے۔

ہاں حنا تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے۔

احمد اٹھ کر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ حنا بھی اپنے بستر پر جا لیٹی لیکن زیادہ دیر کے لئے نہیں۔ وہ اٹھ کر احمد کے ساتھ جا کر سو گئی۔ اس عرصے میں احمد سو چکا تھا۔ حنا بھی وہاں ہی سو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد احمد کی آنکھ کھلی تو اس نے حنا کو بھی اپنے ساتھ بستر پر سویا ہوا پایا۔ آہستہ سے اٹھ کر وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ نماز پڑھ چکا تو حنا کے بستر پر بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہو گیا وہ ابھی تلاوت سے فارغ ہوا تھا کہ حنا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسے قرآن پڑھتے ہوئے سنتی رہی۔
اس کی روح میں ایک انجانی راحت سے اسے بڑا ذہنی سکون میسر آیا۔
وہ احمد کے متعلق سوچنے لگی۔ اس شخص پر کتنا اللہ کا فضل ہے۔ ایک قلیل سی تنخواہ پاتا ہے۔ پھر بھی کتنا خوش ہے۔

اپنی ان پڑھ دیہاتی بیوی کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اس کی حق تلفی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کسی قسم کی کوئی ترغیب اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ اور یہ ہر (TEMPTATION) کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ کاش مجھے اس کے ساتھ بقایا زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملتا تو میں اپنے ماضی کی بے اعتدالیوں کا کچھ تو ازالہ کر سکتی۔ ورنہ زندگی کی ان بھول بھلیوں میں یونہی بھٹک کر مر جاؤں گی۔ اور اس شخص کے بغیر اس بھری دنیا میں مجھے کوئی بھی یاد نہ رکھے گا۔ اور میں آہستہ آہستہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاؤں گی۔ حتیٰ کہ میری ماں بھی اپنے (AFFAIRS) میں کھوئی اپنے ذہن کے نہاں خانوں میری یادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دے گی۔ احمد ابھی تلاوت سے فارغ ہی ہوا تھا کہ بیرا چائے لے آیا۔ انہوں نے چائے پی۔ اس دوران میں حنا، احمد سے کہنے لگی۔

احمد اگر تم مجھے اجازت دو تو میں کل صبح تمہیں میس میں چھوڑ کر پنڈی واپس چلی جاؤں۔ تم سے جو جو ضروری باتیں کرنا تھیں وہ کر لی ہیں۔ اگر کوئی بات نہ بھی کرنا ہو تو پھر بھی ہماری یہ تشنگی دور نہیں ہو سکتی۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔

جی ارشاد......!!!

احمد میں انڈیا کسی قیمت پر بھی واپس نہیں جانا چاہتی۔

کیوں.........؟

کس کے پاس جاؤں......؟ آپ ہی بتائیں۔

تمہاری ماں ہے۔ تمہارا باپ ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تمہیں اس مشکل وقت میں سہارا دینے کے لئے آمادہ نہ ہو گا..........؟

احمد خدا کے لئے مجھے ماں کے پاس واپس بھیج کر تم مجھے جنس کے دہکتے ہوئے جہنم میں مت جھونکو۔

تمہاری ماں کے پاس کون سا جنس کا دہکتا ہوا جہنم ہے۔ وہ تو بقول تمہارے اب توبہ تائب ہو کر سوشل ورکر بن گئی ہے۔ اور مچھروں کی بڑی بستی میں اس نے کئی سوشل پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں۔

لیکن ان بستیوں میں موجواور خوشئے بھی تو رہتے ہیں۔ مجھے میری ماں کی

ہاں چلی جائیں۔

پنڈی پہنچ کر رات کو نو بجے میرے دفتر کے ٹیلی فون پر میرے ساتھ بات کر لینا۔ میں وہاں موجود ہوں گا۔

بہت اچھا۔

مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ دونوں نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر حنا' احمد سے کہنے لگی۔ احمد نہ جانے کتنے طویل عرصے کے بعد آج میں نے تمہارے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔ اگر میرا کوئی ساتھی شراب پینے والا ہوتا تو شاید وہ مجھے شراب پینے پر مائل کر چکا ہوتا۔ اور اس طرح شراب کے نشے میں نہ جانے وہ کتنی بار میری عصمت دری کر چکا ہوتا۔ اور مجھے شراب کے اس عارضی سرور میں اس برائی کا احساس تک نہ ہوتا۔

لیکن ایک تم ہو' جواں ہو' خوبصورت ہو' جذبات سے لبریز ہو' لیکن کبھی تم اپنی حد سے نہیں بڑھے۔ میں بعض اوقات سوچتی ہوں کہ کیا یہ شخص تمام مردانہ موجودگی میں نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔

تو اپنے والد محترم نواب سعادت علی خان کے پاس لکھنؤ چلی جاؤ۔ آخر تمہارا باپ ہے۔ تمہیں اپنے سایۂ عاطفت سے کیسے محروم کر سکتا ہے۔

یہ ایک آخری امید کی کرن ہے۔ نہ جانے وہ بھی زندہ ہوں گے یا نہیں۔ اور اگر وہ زندہ ہوئے اور انہیں اس بات کا پتہ ہوا کہ میں نے سب سے پہلے ایک ہندو مہاراجہ سے شادی کی تھی تو کیا پتہ وہ مجھے قتل کر دیں۔

سر دست تو میں پنڈی واپس جانا چاہتی ہوں تاکہ بابا محمد شفیع کی بیٹیوں کا کچھ انتظام کروں۔ اور گل شیر سے مل کر اس کے گھر کا پتہ لے کر اس کی بیوی کو پانچ ہزار روپے بھیجوں

حنا یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن سعید کے ڈیوز - (DUES) مل جائیں تو تب یہ سب کچھ کریں۔ پاس جو چار کوڑیاں ہیں وہی نہ بانٹ کر دوسروں کی دست نگر ہو جاؤ۔

سعید کے ڈیوز بھی جلدی ہی مل جائیں گے۔ تو کیا خیال ہے کہ تمہارا میں کل صبح واپس چلی جاؤں۔

خصوصیات کا حامل ہے۔ میں آج سے چھ ماہ پہلے جب آخری بار تمہارے ساتھ اس کمرے میں قیام پذیر تھی تو اکثر اکٹھے سوتے تھے۔ بسا اوقات تمہارے جذبات بے حد مشتعل ہو جاتے تھے۔ اور پھر میں تخلیق کے آخری لمحے کی متمنی ہو جاتی تھی۔ لیکن تم پر خدا کی خصوصی مہربانی ہے۔ تم نے ایسے تمام موقعوں پر اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اور ذلت و رسوائی کی پستیوں میں گرنے سے بچ گئے۔

حنا اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ سب اللہ پاک کی مہربانی ہے میں اس گناہ سے بھی ہر وقت خائف رہتا ہوں۔ جو میں رات کی تنہائیوں میں ایک خوبصورت اور جوان عورت کے ساتھ ایک بستر میں سوتا ہوں۔ غیر عورت کو ہاتھ لگانا بھی تو ایک گناہ عظیم ہے۔

اللہ پاک ایک لمحے کے لئے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کرے۔

اچھا تو پھر یہی پروگرام ٹھیک ہے۔ میں کل صبح واپس چلی جاؤں۔

جی ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن پھر مجھے آپ اب ہی میرے میس میں چھوڑ آئیں۔

احمد خدا کے لئے مجھ سے آج رات کی قربت تو نہ چھینو۔

ٹھیک ہے۔ مجھے رہنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن صبح تمہاری جدائی مجھے شاق گزرے گی۔

اب نہ گزرے گی۔

اس لئے نہیں کہ مجھے پتا ہو گا کہ آپ فلیٹرز کے تاریخی کمرے میں میری دلجوئی کے لئے موجود ہیں۔ میں جب چاہوں لوٹ کر آ سکتا ہوں۔ اور حنا نے احمد کو گلے لگا کر چوم لیا۔

وہ رات بھر ایک دوسرے کی چھاتی پر سر رکھے میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ دو چاہنے والے بھی کم سن بچوں کی طرح عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ جو عام زندگی میں کوئی بھی نارمل آدمی نہیں کرتا۔ ایسے آدمیوں کی اپنی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔ خاموشی کی زبان ان کا انگ انگ ان کی باطنی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی اپنی ایک الگ سائیکی ہوتی ہے۔

احمد کاش آج کی یہ رات امر ہو جاتی۔ اور ہم اسی طرح ایک دوسرے کی چھاتی پر سر رکھ کر سوئے رہتے۔

حضور اس کا بھی مجھے جواب دینا پڑے گا۔ ایک غیر عورت کے جسم کو مس کرنا تو کیا میں تو پر شباب بدن کے نازک اونچے ٹیلوں پر سر رکھ کر سو رہا ہوں۔

احمد خدا کے لئے مجھے اب سے ہی عذاب دوزخ سے نہ ڈراؤ۔ یہ ٹھیک ہے ہم بہت گناہ گار ہیں لیکن اللہ پاک کی رحمت بھی بے پایاں ہے۔

حنا یہ بحث ہمارے جیسے کمزور لوگوں کی تاویلیں ہیں۔ اللہ کے احکامات نہایت واضح ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی رحمت سے کسی بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی بخش دے۔

احمد خدا کے لئے یہ ٹاپک (TOTIC) نہ چھیڑو۔

اگر یہ رات ہزار سال کی بھی ہوتی تو یوں ہی گزر جاتی۔ سو گزر گئی۔ موذن نے دور کہیں آذان دی۔ ان میں ایمان کی جو تھوڑی سی رمق باقی تھی وہ جاگ اٹھی۔ اور دونو نے وضو کیا اور پھر نماز پڑھی نماز کی ادائیگی کے بعد احمد بہت دیر تک قرآن قریم کی تلاوت کرتا رہا۔ اور حنا پاس بیٹھی بڑی دل جمعی سے یہ تلاوت سنتی رہی۔ اس کے دل پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ زار و قطار رونے لگ گئی۔

کیوں حنا خیریت تو ہے......؟

احمد کاش میں اللہ کے اس کلام کے معنی سمجھ سکتی۔ مجھے آج تک کسی نے اس طرف راغب ہی نہیں کیا۔

حنا بس یہی ہماری بد قسمتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے حقوق سے آگاہ نہیں ہیں۔

احمد میں کسی دین دار جوان آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

تاکہ تمہاری عاقبت سدھر جائے۔

عاقبت کی خبر تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں راہ راست پر چلنے کی کوشش کرنا چاہتی ہوں۔

تو اللہ یار خان سے کر لو۔ کتنا سیدھا اور شریف آدمی ہے............؟

اس کے پاس دین کا علم ہے۔

جی نہیں۔

میرے لئے کوئی دین دار آدمی تلاش کریں۔

حنا۔ کسی مولوی کے ساتھ شادی کر لی تو تم جلد پلٹنے کی ٹھانو گی۔ آہستہ آہستہ دین کا علم حاصل کرو اور پھر ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کرو۔ انشاء اللہ تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گی۔

ہاں تمہارا یہ کہنا تو ٹھیک ہے۔

زندگی کی منزل پر مختلف سمت پر چلنے والے مسافر اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے۔ احمد نے شیو کی غسل کیا۔ اور پھر جانے کیلئے تیار ہو گئے۔

ابھی کیا وقت ہے........؟ حنا نے پوچھا۔

ساڑھے چھ بجے ہیں۔ احمد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تم ناشتہ یہاں ہی کرو۔ حنا نے کہا۔

نہیں حنا مجھے دیر ہو جائے گی۔

اچھا ٹھیک ہے۔

اور پھر حنا نے احمد کا بیگ اٹھا لیا اور وہ دونو سیڑھیوں سے نیچے آ گئے۔ تقریباً دس منٹ میں حنا اس کو میس میں چھوڑ آئی۔ چلتے وقت حنا نے احمد کے ساتھ مصافحہ کیا۔ سامنے برآمدے میں کھڑے دو آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھا۔ اور ہلکا سا مسکرا دیئے۔

فوج میں زیادہ تعداد دیہاتی لوگوں کی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ بات انوکھی ہے۔ کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ یوں کھلے بندوں مصافحہ کرے۔

حنا واپس چلی گئی۔ سامنے سڑک پر رک کر کھڑکی سے باہر سر نکال کر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ احمد ابھی تک وہاں ہی کھڑا تھا اور وہ حنا کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ حنا نے کھڑکی سے باہر ہاتھ ہلا کر "خدا حافظ" کہا۔ احمد نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ اور پھر حنا کی گاڑی آگے بڑھ گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اور احمد تھکے ماندے ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اللہ یار خان اس کے کمرے کے باہر ایک کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ احمد کو دیکھا تو لپک کر آیا۔ احمد نے کہا ہاں اللہ یار خان تم میرے لئے جلدی سے ناشتہ لے آؤ۔ اور اللہ یار خان کچن کی طرف چلا گیا۔

احمد نے سامان میز پر رکھ دیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ جب حنا کے ساتھ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اور کسی قسم کے جنسی تعلقات استوار نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مجھے کس قدر خطیر رقم کی کئی بار آفر بھی دے چکی ہے۔ میں اس سے کوئی رقم یا زیورات بھی نہیں لینا چاہتا تو آخر ان ملاقاتوں کا کیا مقصد ہے..........؟ جن میں رسوائی اور ذلت کے سوا کسی اور چیز کا حصول ناممکن ہے۔ مجھے اس محاذ سے فوراً پسپائی اختیار کرنا چاہئے۔

اگر میری جگہ حنا ہوتی اور اپنی زندگی میں سیٹ (SET) ہوتی۔ اور میں یوں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوتا۔ تو کیا وہ مجھے سینے کے ساتھ لگا کر یوں مشکل وقت میں میری دستگیری کرتی۔ ہرگز نہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے.....؟ کہ میں پرائی آگ میں یوں جل رہا ہوں۔ اور نہ جانے کب تک یونہی جلتا رہوں گا۔ مجھے نہ بیوی بچوں کی فکر ہے.........؟ نہ نوکری کا غم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ رویہ پاگل پن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اللہ یار خان ناشتہ لے آیا اور اس نے تپائی پر لا کر رکھ دیا اور تپائی اٹھا کر احمد کے سامنے رکھ دی۔

اللہ یار خان میری یونیفارم جلد لے آؤ۔

سر.........!!!! وردی تیار پڑی ہوئی ہے۔

آپ ناشتہ کر لیں۔ ابھی سات بھی نہیں بجے۔ آرام سے ناشتہ کریں۔

احمد نے ناشتہ کرنے کے بعد یونیفارم پہن لی اور سوا سات بجے کے قریب دفتر چلا گیا۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

آج احمد بہت اداس تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہ حنا کے ساتھ تھا۔ وہ کتنی وفا شعار خاتون ہے۔ میں اسے کیا دیتا ہوں میرے پاس ہے ہی کیا........؟ ایک ماہ پیشانی رگڑ رگڑ کر اور ہر ایرے غیرے کو بات بات کے ساتھ سر سر کہتے زبان تھک جاتی ہے۔ اور تب کہیں چند ٹکے ملتے ہیں۔ جن کے حصول کے لئے میرے بیوی بچے پہلی تاریخ سے چشم براہ ہوتے ہیں۔ وہ نیک دل خاتون تو مختلف حیلے بہانوں سے میری مدد کرتی رہتی ہے۔ لیکن کب تک....؟ میں نے بڑی کوشش سے سعید کے ساتھ اس کی شادی کرا دی تھی۔ خیال تھا کہ وہ دونو خوش رہیں گے۔ لیکن ہم تینوں کی بدقسمتی کہ سعید کے من میں زہر بھرا ہوا تھا۔

کرنل صاحب نے ایک کیس منگوایا۔ احمد وہ لے کر گیا تو کرنل صاحب نے ان کو بٹھا کر پوچھا۔

صاحب۔ آپ کے یہ گیسٹ (GUEST) اور کتنے دن رہیں گے.....؟

سر وہ آج پنڈی واپس چلی گئی ہو گی۔

صاحب آپ اتنے بڑے لوگوں سے تعلقات نہ استوار کیا کریں۔

اگر برگیڈیئر زمان صاحب کی جگہ کوئی اور ڈائیریکٹر ہوتا تو آپ کو فوراً گھر

بھیج دیتا۔

سر......!!! میں ان دوستانوں کا کوئی شوقین نہیں۔ بس حسن اتفاق سے یہ خاتون مجھے ایک حادثے میں مل گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلقات بڑھتے گئے۔ سر اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

سوچ لو۔ سروس کا معاملہ ہے۔

سر میری پرفارمنس میں اگر کوئی کمی ہو تو آپ فرمائیں۔

نہیں کارکردگی آپ کی ٹھیک ہے۔ یہ آپ کا جنرل صاحبان سے میل ملاپ رکھنا نیچے والے افسروں کو اچھا نہیں لگتا۔

سر میں تو آج تک کسی جرنیل سے نہیں ملا۔ اتفاقاً اس کیس میں چند سینئر افسروں سے واقفیت ہو گئی ہے۔

بہرحال آپ اوائیڈ (AVOID) کریں۔

سر میں ویسے بھی حالات سے بڑا دلبرداشتہ ہو چکا ہوں۔ ادھر سروس نہیں کرنا چاہتا۔ آپ مہربانی سے میرا پوسٹنگ ایسٹ پاکستان کروا دیں۔

میاں مجھے نوکری کرنے دو۔ کرنل سعید کی طرح کہیں مجھے بھی کوئی رگڑا نہ لگ جائے۔

سر کرنل سعید کو میری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اپنے کئے کی ان کو سزا ملی۔

یہ کرنل سعید اور اس کی بیوی کا ذاتی معاملہ تھا۔ آپ کو اس میں دخل اندازی کی کیا ضرورت تھی۔

سر میں اس موضوع پر کچھ بات نہیں کر سکتا۔

نہیں یہ فوجی ڈسپلن کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ آپ کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔

سر......!!! اس سارے معاملے میں آپ کیوں فریق بن رہے ہیں۔ اس کا آپکی پرسٹیج (PRESTIGE) پر کوئی اثر پڑا ہے۔

میری ذات پر تو کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن کور (CORPS) پر بحیثیت مجموعی

اس کا بہت برا اثر پڑا ہے۔

تو سراب آپ مجھے جو حکم دیتے ہیں۔ میں اس کو بجا لاؤں گا۔

آپ اس آوارہ عورت سے فی الفور کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

اس خاتون کے ساتھ میرے تعلقات کا میری سروس پر یا ہماری کور (CORPS) کی ریپوٹیشن (REPUTATION) پر کیا اثر پڑتا ہے..........؟

ابھی تک آپ کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آئی۔ G.H.Q کے سب سینئر آفیسرز کہہ رہے ہیں کہ کرنل سعید کی موت اس J.C.O کی وجہ سے ہوئی ہے۔

سر میں آپ سے ایک آخری بات کرتا ہوں۔ یہ معاملہ پہلے ایک دفعہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل صاحب کے نوٹس میں بھی بالکل اسی پیرائے میں لایا گیا تھا۔ کور ہیڈ کوارٹر کے چند سینئر آفیسر اور میرا یونٹ کمانڈر ایک طرف تھے۔ دوسری طرف یہ ناتواں J.C.O اور بے آسرا خاتون تھی۔ جنرل صاحب نے فریق اول کی بری طرح سرزنش کی اور ہم دونو کو بریت کا ایک لیٹر دیا اور ساتھ ہی جنرل صاحب نے اپنے سٹاف آفیسر کی بے جا دخل اندازی پر معذرت بھی کی۔

کہاں ہے وہ لیٹر

کرنل سعید کا جو یہ کیس ہوا ہے۔ وہ لیٹر میں نے جنرل حمید صاحب کو دے دیا تھا۔ آپ مجھے ایک دن کی چھٹی دیں۔ میں پنڈی جا کر جنرل صاحب سے اس لیٹر کی مصدقہ کاپی (C.T.C) لے آتا ہوں۔ دراصل کرنل صاحب آپ کو کرنل سعید کے کیس کی وجہ سے رنج پہنچا ہے۔

اب اسی وجہ سے آپ کو مجھ میں یہ سب خرابیاں نظر آنے لگ گئی ہیں۔

احمد صاحب۔ مائینڈ یور بزنس۔ (MIND YOUR BUSINESS)

آپ میرے خلاف قانونی کاروائی کریں۔ یہ کرید کرید کر اپنا بن کر پوچھنا دونو کے لئے مضر ہو گا۔

آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔

نہیں صاحب....!! میں گزارش کر رہا ہوں کہ آپ میرے خلاف لیگلی پروسیڈ (LEAGALLY PROCEED) کریں۔

وہ بھی ہو جائے گا اگر آپ کو اس کا شوق ہے تو......؟

مجھے تو شوق نہیں ہے۔ آپ انتقام لینے پر اتر آئے ہیں۔ تو بے شک یہ بھی کرلیں۔

ٹھیک ہے آپ جائیں اپنا چارج ایڈجوٹینٹ کر دے دیں۔

آپ یہ سب کچھ مجھے لکھ کر دیں۔

کیوں آپ میرا زبانی حکم نہیں مانیں گے۔

اس طرح کا کوئی حکم نہیں مانوں گا۔ آپ مجھے لکھ کر دیں۔ میں بھی تحریری جواب دوں گا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ بات یہیں پر ختم نہ ہو گی۔

احمد صاحب آپ خوامخواہ بات کو نہ بڑھائیں۔ آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ ایڈجوٹینٹ کو چارج دے کر اپنے کمرے میں جاکر آرام کریں۔

میں ایسا کوئی حکم نہیں مانوں گا۔ آپ مجھے کلوز اریسٹ (CLOSE ARREST) کریں۔ یا تین چار سپاہیوں کو بلوا کر مجھے زبردستی دھکے دے کر نکال دیں۔ ویسے میں کسی تحریری حکم کے بغیر آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔

صوبیدار میجر کو بلا کر ان کی موجودگی میں آپ کو آرڈر دوں۔

صوبیدار میجر کوئی غیر جانبدار آدمی ہے۔ وہ آپ کے ماتحت نہیں ہے۔ اس نے نوکری نہیں کرنی۔ اس نے تمغہ خدمت درجہ اول نہیں لینا۔ اور اگر لینا ہے تو جب تک آپ کی خوشنودی اسے حاصل نہ ہو گی اسے یہ تمغہ کیسے ملے گا۔

صاحب آپ بہت فضول باتیں کرتے ہیں۔ سینئر آفیسرز سے اس لب و لہجے میں اور ایسی باتیں کی جاتی ہیں۔

سر.......!!!! میں نے آج تک کبھی آپ سے یا کسی اور آفیسر سے اس لب و لہجے میں بات کی ہے.......؟ احمد نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

صاحب میں اسی لئے تو حیران ہو رہا ہوں۔ آپ کوئی نشہ پانی تو نہیں کرتے۔

اگر آپ کرتے ہیں تو میں بھی کرتا ہوں گا۔

اچھا چھوڑیئے صاحب آپ اپنے دفتر میں جاکر کام کیجئے۔

ابھی دو منٹ پہلے تو آپ مجھے سے فرما رہے تھے کہ میں اپنے کام کا چارج ایڈجوٹینٹ کو دے دوں۔

احمد صاحب جایئے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام کیجئے۔

احمد اٹھ کر اپنے آفس میں چلا گیا۔ وہاں دیکھا تو صوبیدار میجر اسے نصیحتیں کرنے کے لئے بیٹھا ہوا تھا۔ احمد نے اس سے کوئی بات کئے بغیر اپنے دفتری کاغذوں کی چھان پھٹک شروع کر دی۔ صوبیدار میجر دو چار منٹ بیٹھا رہا۔ پھر خود ہی شرمندہ ہو کر اٹھ کر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایڈجوٹینٹ آیا۔ وہ احمد سے کہنے لگا۔

صاحب آج (سی۔ او) صاحب سے بڑی لمبی چوڑی گفتگو ہوئی ہے۔

ہاں صاحب۔

کس چیز کے متعلق آج اتنی لمبی ڈسکشن ہوئی ہے......؟

بس سر......!! دفتر کی سیٹ اپ (SET UP) کے متعلق تھی۔ احمد نے عدم توجہی سے کہا۔

صاحب دفتر کی کوئی بات ہوتی تو کرنل صاحب مجھے ضرور بلاتے۔

جناب۔ نہ جانے انہوں نے آپ کو کیوں نہیں بلایا۔ ان کو بلانا چاہئے تھا۔

ایڈجوٹینٹ واپس اپنے دفتر میں چلا گیا۔

احمد نے ڈائریکٹر آف سگنلز کے نام ایک درخواست لکھی کہ جناب میرے حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ میں اپنی ملازمت اس یونٹ میں جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے مہربانی سے مجھے مشرقی پاکستان پوسٹ کر دیا جائے۔

ان دنوں پاکستان آرمی میں تقریباً ننانوے فیصد نفری مغربی پاکستان کے لوگوں کی ہوتی تھی۔ اس لئے مشرقی پاکستان میں دو سال کی مدت کے لئے یہاں کے لوگ جاتے تھے۔ خوشی سے کوئی نہ جاتا تھا۔ جس کا پوسٹنگ ہو جاتا تھا وہ بھی طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے گلو خلاصی کی کوشش کرتا تھا۔ ڈائریکٹوریٹ آف سگنلز سے زیادہ تر ان لوگوں کو بھیجا جاتا جن کا کوئی عزیز یا سرپرست کسی اہم پوسٹ پر نہ ہوتا تھا۔ اور جنہیں نچلے طبقے والے "لاوارث" کہتے تھے۔ لہٰذا کسی آدمی کا خود درخواست دے کر وہاں جانا بڑا معنی خیز

سمجھا جاتا تھا۔

احمد نے اپنی درخواست ایڈجوٹینٹ کو دی۔ اس نے ایک بار درخواست کو پڑھا اور پھر احمد کی طرف دیکھ کر بڑے ہی معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرانے لگ گیا۔

کیوں صاحب.....؟ سی او کے ساتھ یہی ڈسکشن آپ نے کی تھی......؟

جی ہاں......!!

آپ کو اس یونٹ میں کوئی تکلیف ہے.....؟

مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ شاید یونٹ والوں کو ہو۔

اچھا ٹھیک ہے صاحب۔ آپ کام کریں۔

احمد اپنے دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا کام کرنے کو جی نہ کرتا تھا۔ چائے منگوائی اور کام چھوڑ کر بڑی مزے سے چائے پینے میں مصروف تھا۔ کہ آفس اردلی نے آ کر بتایا۔

کہ سر آپ کو کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔

اچھا چائے پی کر آ رہا ہوں۔

ابھی احمد چائے پی ہی رہا تھا کہ کرنل ایڈجوٹینٹ کو لے کر اس کے دفتر میں آ گیا۔ احمد احتراماً کھڑا ہو گیا۔

صاحب میں نے آپ کو بلایا تھا۔ آپ نے اردلی کو کیا کہا کہ میں چائے پی کر آ رہا ہوں۔

جی جناب یہی کہا تھا۔

یہ ٹھیک جواب ہے.......؟

اس میں غلطی کیا ہے.....؟

آپ کو فوراً چائے چھوڑ کر آ جانا چاہیے تھا۔

کیوں لڑائی لگی ہوئی تھی.....؟

لڑائی ہو یا نہ ہو۔ فوج کا ایک ڈسپلن ہے۔ بغیر چوں و چراں کسی تاخیر کے حکم کی تعمیل ہونا چاہیے۔

ٹھیک ہے سر.....!!

آپ نے یہ درخواست ڈائریکٹر صاحب کے نام کیوں دی ہے......؟

کس کے نام دوں.....؟

آفیسر انچارج ریکارڈز کے نام دیں۔

آؤٹ آف ٹرن۔ آفیسر انچارج ریکارڈ پوسٹنگ نہیں کر سکتا۔

آپ دیں تو سہی۔

خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا۔ ڈائریکٹر صاحب میری درخواست پر فورا آرڈر کر دیں گے۔ یا مجھے بلا کر وجوہات پوچھیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ آپ ڈائریکٹر صاحب کو میری شکایت کرنا چاہتے ہیں۔

نہیں سر میں نے کیا شکایت کرنا ہے.....؟

میں ایک معمولی سا J.C.O ہوں۔ آپ کمانڈنگ آفیسر ہیں۔ میرا اور آپ کا کیا مقابلہ ہے۔

لنگوٹ کس کر تو آپ ایسے میدان میں اترے ہیں کہ جیسے مجھے نیچا دکھا کر چھوڑیں گے۔

نہیں سر.....!! میرا آپ سے کیا مقابلہ۔

اچھا میں آپ کی درخواست پر مناسب ایکشن لوں گا۔ اور پھر ایڈجوٹینٹ کو ساتھ لے کر وہ واپس اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔

کرنل اپنے دفتر میں جا کر تھوڑی دیر کے لئے ایڈجوٹینٹ سے مشورہ کرتا رہا۔ پھر اس نے ایڈجوٹینٹ کو کہا کہ بہتر ہے آپ صوبیدار میجر صاحب کو بھی بلوا لیں۔ تا کہ ان سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔

بہت اچھا سر.....!! ایڈجوٹینٹ نے کہا۔ اور پھر وہ واپس اپنے دفتر میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی صوبیدار میجر کو ٹیلی فون کر کے اپنے پاس بلایا۔

صوبیدار میجر آیا تو اس وقت ایڈجوٹیٹ کے پاس کچھ آفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے صوبیدار میجر سے کہا۔

صاحب۔ آپ دو منٹ کے لئے ہیڈ کلرک صاحب کے پاس تشریف

رکھیں۔ میں ان صاحبان کو فارغ کر کے آپ کو بلاتا ہوں۔

بہت بہتر حضور...... اور پھر صوبیدار میجر سیلوٹ کر کے ہیڈ کلرک کے دفتر میں جا کر بیٹھ گیا۔

احمد کام چھوڑ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اور بڑا ہی "RELAXING" موڈ میں تھا۔ اس کے باوجود اس نے صوبیدار میجر کو کوئی لفٹ نہ دی۔ وہ تھوڑی دیر تو خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور پھر احمد سے کہنے لگا۔

بھائی کوئی چائے وغیرہ منگواؤ۔ میں تمہارا مہمان ہوں۔

آپ چائے کرنل صاحب یا ایڈجوٹینٹ صاحب کے پاس جا کر پئیں۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔ وہاں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر پینا۔ آپ ان کے مہمان ہیں۔

آپ کو پتہ ہے مجھے کرنل صاحب نے کیوں بلایا ہے....؟

میں جناب دوسروں کے کام میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔

مجھے کیا خبر کہ کیوں بلایا ہے......؟

آپ کا تو کوئی جھمیلا نہیں۔

جناب آپ جھمیلے نمٹانے کے لئے تو ہیں۔ اور آپ کا کیا کام ہے....؟

اچھا۔ میرا اور کوئی کام ہی نہیں۔

یونٹوں کے لوگوں کی جھوٹی سچی باتیں مرچ مصالحہ لگا کر سی۔ او کو بتانا یا پھر اپنی ویلفیئر کرنا۔

یار احمد تم بڑے ٹیڑھے آدمی ہو۔ ہر کس و ناکس سے مفت کا جھگڑا مول لے لیتے ہو۔

احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔

خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔

ایڈجوٹینٹ کا آفس اردلی صوبیدار میجر کو بلا کر اندر لے گیا۔ ایڈجوٹینٹ نے اس کی بڑے اچھے طریقے سے پذیرائی کی۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر آفس اردلی کو چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ سی۔او درمیانے دروازے سے ایڈجوٹینٹ کے دفتر میں آ گیا۔ وہ دونو احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

بھائی قریشی ہمیں بھی چائے پلاؤ۔

بہت اچھا سر.......!!! اور پھر کیپٹن قریشی نے ایک کپ میں چائے ڈال کر ان کو دے دی۔

آپ لوگ کوئی خاص بات کر رہے تھے۔ کرنل نے تجاہل عارفانہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

نہیں سر کوئی خاص بات نہیں ہے۔

کرنل چائے پی چکا تو ایڈجوٹینٹ اور صوبیدار میجر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھے احمد کے رویوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کرنل اور صوبیدار میجر دونو احمد سے ناخوش تھے۔

البتہ ایڈجوٹینٹ نے ان سے واضح طور پر کہا۔

سر دفتر کے کام میں احمد صاحب بڑے ماہر ہیں۔ نہایت ایمانداری اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ اپنے ماتحتوں پر بھی ان کا صحیح کنٹرول ہے۔ میں ان کے کام سے خوش ہوں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

صوبیدار میجر صاحب آپ فرمائیں۔ کرنل نے انکی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

سر۔ ممکن ہے یہ صاحب اپنا دفتری کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہوں گے۔ لیکن ان ڈسپلنگ ٹھیک نہیں ہے۔

کیوں صاحب یہ کیا کرتے ہیں.......؟

سر یہ صبح پی۔ ٹی پریڈ پر نہیں آتے۔ شام کو گیمز پر نہیں آتے۔ اکثر راتوں کو یونٹ لائنز سے غیر حاضر رہتے ہیں۔

صاحب یہ راتوں کو کہاں جاتے ہیں۔ کرنل نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

سر۔ پچھلی متواتر کئی راتیں انہوں نے کسی آوارہ عورت کے ساتھ فلیٹیز میں گزاری ہیں۔ وہ عورت سنا ہے کسی کرنل صاحب کی بیگم ہے۔ اور پنڈی سے آئی ہوئی تھی۔ وہ ان کو دو بجے بعد دوپہر یہاں سے اپنی کار پر لے جاتی تھی۔ اور دوسرے

دن صبح سات بجے میس میں چھوڑ جاتی تھی۔ صاحب یہ کتنی غلط بات ہے۔ دوسرے نچلے رینکس پر اس کا کتنا برا اثر پڑا ہو گا۔ حضور اگر انگریزوں کا زمانہ ہوتا تو وہ صاحب لوگ تو ایسے غلط ڈسپلنگ والے سردار کو ایک دن بھی فوج میں نہ رکھتے۔ بلکہ ایک دم کورٹ مارشل کر کے بارہ پتھر کر کے گھر بھیج دیتے۔

صوبیدار میجر صاحب آپ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی کہ کوئی عورت ان کو میس سے لے جاتی ہے اور پھر دوسری صبح آ کر چھوڑ جاتی ہے۔ اور یہ رات بھر یونٹ سے غائب رہتے ہیں۔

حضور۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پنڈی سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں دو تین دن ان کے پاس رات کو وہاں رہا کروں گا۔ اور صبح اپنی ڈیوٹی پر آجایا کروں گا۔ اور انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ کرنل صاحب نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں بے شک دو تین دن ان کے پاس رات کو رہا کروں گا۔ اور صبح دفتر اپنی ڈیوٹی پر آجایا کروں گا۔

حضور اسی لئے حیران تھا۔ کہ کرنل صاحب ایسا غلط آرڈر کیسے دے سکتے ہیں۔

نہیں صاحب۔ یہ اس سردار نے غلط بات کی ہے۔ میں نے اسے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔

صوبیدار میجروں کی یہی ڈیوٹی انگریز کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں تو ہندوستانی یونٹوں کا سب کاروبار صوبیدار میجر کے ذمہ ہوتا تھا۔ انگریز چلے گئے لیکن اپنے گماشتے پیچھے چھوڑ گئے۔ فوج کا وہی پیٹرن ہے جو انگریزوں کے عہد میں تھا۔ کمشنڈ آفیسرز ڈیوٹی کے اوقات میں یعنی ساڑھے سات صبح سے ڈیڑھ بجے تک یونٹوں میں آتے ہیں۔ اس کے بعد اٹھارہ گھنٹے نچلے رینکس کے لوگ صوبیدار میجر کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ جو چار بجے شام سے لے کر دس بجے رات تک ڈنڈا اٹھائے لنگروں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ سپاہی لوگ دور ہی سے دیکھ کر چھپ جاتے ہیں۔ کیا مجال کسی کی کہ وہ یونٹ ایریا کے باہر قدم بھی رکھ سکے۔

احمد کو ایک ہفتے کے بعد تب پتہ چلا کہ جب اس کا ارجنٹ پوسٹنگ آرڈر

ایسٹ پاکستان کا آ گیا سروس کسٹم یہ تھا کہ جو لوگ ایسٹ پاکستان پوسٹ ہوتے تھے۔ جانے سے پہلے ان کو دو ماہ کی چھٹی ملتی تھی کہ وہ اپنے گھریلو معاملات کو نمٹا کر جائیں۔ اس ارجنٹ پوسٹنگ کے باعث احمد کو اس رخصت کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ احمد نے یہ اندازہ لگایا کہ میری درخواست پر کرنل نے آفیسر انچارج ریکارڈ سے شاید ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ اور انہی کے کہنے پر یہ ارجنٹ پوسٹنگ آرڈر اشوع ہوا ہے۔

احمد نے وہ پوسٹنگ آرڈر دوسری فریش میل (FRESH MAIL) کے ساتھ ایک فولڈر میں بند کر کے ایڈجوٹینٹ کے پاس بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر میں ایڈجوٹینٹ اندر سے احمد کے دفتر میں آئے۔ اور اس کا پوسٹنگ آرڈر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

صاحب یہ کیسے ہوا..........؟

میں نے آپ کو درخواست دی تھی کہ مجھے مشرقی پاکستان پوسٹ کیا جائے۔

وہ درخواست میں نے کرنل صاحب کو دے دی تھی۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ کوئی لیٹر وغیرہ کہیں لکھا گیا ہے۔ یا نہیں.......؟

سر دفتر سے تو کوئی لیٹر نہیں گیا۔ اگر کوئی ذاتی خط کرنل صاحب نے آفیسر انچارج ریکارڈ کو لکھا ہو تو مجھے پتہ نہیں۔ ویسے کوئی آفیشل لیٹر دفتر سے نہیں گیا۔

آپ نے درخواست کس کو ایڈریس کی تھی۔ آفیسر انچارج ریکارڈ کو.........؟

نہیں سر.....!!میں نے درخواست ڈائریکٹر آف سگنل کے نام دی تھی۔

صاحب ڈائریکٹر آف سگنل کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے.......؟

صاحب تعلق ہے۔ وقت آیا تو اس کا پتہ خود بخود چل جائے گا۔

اچھا صاحب۔ آپ اپنے دفتر میں بیٹھیں۔

ایڈجوٹینٹ نے ڈاک سے وہ پوسٹنگ آرڈر نکال لیا اور لے کر سی۔ او کے پاس چلا گیا۔ جاتے ہی وہ پوسٹنگ آرڈر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ کرنل نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور پھر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

قریشی اس پھنے خان کو بتا دو کہ اب تم پیک اپ کر لو۔ آج ہی اس سے آفس کا چارج لے لو۔ اور اس کا موومنٹ آرڈر بھی آج ہی نکال دو۔ کل یہ یہاں سے موو (MOVE) کر جائے۔ پرسوں پنڈی اوجڑی کیمپ میں جا کر رپورٹ کرے۔ میں وہاں کیمپ کے او۔ سی کو کہتا ہوں کہ اسے جلد از جلد ایسٹ پاکستان ڈسپیچ کرنے کا بندوبست کرے۔

سر......!!! ایسٹ پاکستان جانے والوں کو پہلے دو ماہ کی چھٹی ملتی ہے۔ تا کہ وہ اپنے گھریلو معاملات نمٹا سکیں۔

نو۔ ساری۔ نو لیو۔ ایسے بدتمیز آدمی کے لئے کوئی چھٹی نہیں۔

اچھا سر......!!!! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

ایڈجوٹنٹ نے ڈاک کا فولڈر اندر سی۔ او کے پاس بھیج دیا۔ اور پھر اردلی کو کہا کہ احمد صاحب کو بلا کر لے آؤ۔ احمد آیا تو ایڈجوٹنٹ نے اس کو اس سب بات چیت سے آگاہ کیا۔ جو اس کے درمیان اور کرنل کے درمیان ہوئی تھی۔

سر بہت شکریہ......!! آپ کا۔ کہ آپ نے میرا کیس صحیح قانون کی روشنی میں سی۔ او کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس بات کو ماننا یا نہ ماننا تو اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔ بہر حال اب میں خاموشی سے اس کی یہ زیادتی اور ظلم برداشت نہیں کروں گا۔ آپ مہربانی سے اس میں فریق نہ بنئے۔

احمد صاحب جو کچھ مجھے سی۔ او نے کہا ہے۔ میں اس کے مطابق حکم ماننے کا تو پابند ہوں۔

نہیں سر۔ آپ اپنی کاروائی ضرور کریں۔ لیکن اپنی جان بچا کر سب کچھ کریں۔

وہ کیسے......؟

اس سے آپ تحریری آرڈر اس پوسٹنگ آرڈر پر لیں۔ ورنہ یہ کل مکر جائے گا۔ آپ نے پرسوں خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

میری اس دوست خاتون کو اس کی بیگم ہی گیٹ سے لے کر اندر آئی تھی۔ وہ دونو میرے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ یہ حضرت بھی آئے اور میرے میز پر

بیٹھ کر چائے پی اور مجھے کہا کہ تم نے ان کو گیٹ پر رک کر انتظار کرنے کا کیوں کہہ رکھا ہے.........؟ یہ کتنا برا لگتا ہے۔ انہیں بے شک اپنے دفتر میں یا رہائشی کمرے میں ساتھ لے جایا کرو۔ اسی وقت مجھے اجازت دی تھی کہ آپ بے شک جب تک یہ یہاں لاہور میں ہیں۔ رات کو ان کے پاس فلیٹیز ہوٹل میں قیام کیا کرو۔ اور صبح اپنی ڈیوٹی پر آجایا کرو۔ اب آپ کے سامنے مکر گیا ہے۔ اس نیک بخت آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔

ٹھیک ہے۔ صاحب میں یہ پوسٹنگ آرڈر لے کر تھوڑی دیر میں ان کے پاس پھر جاتا ہوں۔ اور ان کو کہتا ہوں کہ اس پر آپ آرڈر لکھ دیں۔

ہاں سر۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ بات اب یہاں ہی ختم نہ ہو گی۔ میں اپنا کمیشن ریزائن (RESIGN) کر دوں گا۔ لیکن اب پیچھے نہیں ہٹونگا۔

صاحب آپ بھی سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائیں۔

ٹھیک ہے سر.....!!! اور پھر احمد واپس اپنے دفتر میں آگیا۔

ایڈجوٹینٹ اندر سی۔ او سے بات کرنے کے لئے گیا۔ تو وہاں ڈویژن ہیڈکواٹر کے دو سینئر آفیسرز کرنل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایڈجوٹینٹ نے ان کو سلام کیا۔ اور پھر آوٹ ٹرے میں جو میل پڑی ہوئی تھی وہ اٹھا کر وہ اپنے دفتر میں آگیا۔ وہ ڈاک ایڈجوٹینٹ نے دیکھی۔ ہر لیٹر پر فرداً فرداً آرڈر لکھ کر فولڈر اردلی کو دے دیا کہ احمد صاحب کو دے آؤ۔ احمد نے اس ڈاک کو دیکھے بغیر اپنے نائب کو وہ ڈاک دے دی اور خود واپس اپنی سیٹ پر آکر مزے سے سگریٹ پینے میں محو ہو گیا۔

دفتر والوں کو سوائے ایڈجوٹنٹ کے کسی کو بھی آج کے اس مناقشے کا پتہ نہ تھا۔ خوشی محمد وہ فولڈر اٹھائے احمد کے پاس آگیا اور کہنے لگا۔

صاحب اسی ڈاک پر اپنے کچھ ریمارکس وغیرہ دیں۔ جو جو ایکشن لینا ہے انسٹرکشن لکھ دیں۔ ہمیں پتہ نہیں چل رہا۔

یار خوشی محمد، ایڈجوٹینٹ صاحب نے سب پر لکھ دیا ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم خود اس ڈاک کا تیا پانچہ کر لو۔

اگر چٹھیوں کے جواب میں کوئی غلطی ہو گئی تو۔

ارے بھیا افسران بالا خود ٹھیک کر دیں گے۔ اگر دستخط ثبت کر دیا تو پھر

ان کی ذمہ داری۔ تم بری الذمہ ہو جاؤ گے۔۔

اچھا سر.....!! کرتا ہوں ان کا کچھ۔ خوشی محمد بے دلی سے ڈاک کا وہ فولڈر اٹھا کر مین آفس میں چلا گیا۔

خوشی محمد کے جانے کے بعد میں آرام سے سگریٹ پینے میں محو رہا۔ اور آنے والے کٹھن لمحوں کے متعلق سوچنے لگ پڑا۔ "یہ تمام فوجی زندگی تمہاری انہی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں گزرے گی۔ لوگ اپنے افسروں کو خوش رکھتے ہیں۔ اور اس طرح اس ملازمت کے دوران میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ کہ ۱۹۴۲ء میں کمیشن کے لئے سلیکٹ ہو گئے تھے۔ لیکن کیچنر کالج نوگانگ میں انہی حماقتوں کی وجہ سے لڑ بھڑ کر واپس آ گئے تھے۔ آج تمہارے پرانے سب ساتھی کرنل اور برگیڈیئر ہیں۔ اور تم ہو کہ کچھوے کی طرح رینگتے رینگتے بڑی مشکل سے جونیئر کمیشن لے سکے ہو۔ اور تمہارا یہ کمیشن بھی چند روز کا مہمان ہے۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ تم بڑے بڑے افسروں کے ساتھ آئے دن جھگڑا مول لے لیتے ہو۔ تمہارے جیسے تو ان کرنیلوں اور جرنیلوں کا ایک حلقہ سا دھچکا بھی نہیں برداشت کر سکتے۔ اور تم اتنے جاہل ہو کہ یہ سب باتیں سمجھتے ہوئے بھی۔ انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔"

سینما کی متحرک تصویروں کی طرح اپنی سب زندگی احمد کی نظروں میں آ گئی اسے حنا کے بغیر دنیا تاریک دکھائی دیتی تھی۔ وہ حنا کے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی تصور کی آنکھوں سے حنا کے مرمریں جسم کو دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ جسم جو اس کے لئے ایک سربستہ راز تھا۔ اور ہمیشہ کے لئے ایک راز ہی رہے گا وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت دور رہا۔ یہ دوری اس سے کبھی عبور نہ ہو سکے گی۔

اور پھر ایک دن اس نے حنا کو اپنے بستر پر سویا ہوا دیکھا۔ پاؤں کی چاپ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے دونو بازو پرزور التجا کے انداز میں پھیلا دیئے تھے۔ اس خاموش التجا میں کتنی محبتیں پنہاں تھیں۔ اس نے خود سپردگی کے عالم میں اسے اپنے بے قرار سینے سے لگا لیا تھا۔ احمد سمجھتا تھا کہ اس خوش نما سطح کے نیچے لاوے کا ایک پرجوش دریا بہہ رہا ہے۔ جو نہ جانے کس آن ابل پڑے۔ اور ہم دونو کو اس طغیانی میں بہا کر لے جائے۔ نہ جانے کب تک وہ انہی خیالات میں کھویا اپنے اس اذیت ناک ماحول

سے بے خبر اپنے خوش آیند مستقبل کو پا لینے کی آرزو میں مگن رہتا۔ کہ کیپٹن قریشی اس کے پاس آ گیا۔ اور کہنے لگا۔

صاحب میں نے سی ۔ او صاحب سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احمد صاحب کو کہیں کہ ابھی آپ اپنے دفتر میں کام کریں۔ اس کے متعلق میں ان سے خود فرصت میں بات کروں گا۔

ان کو کہاں فرصت ملے گی۔ انہوں نے وقت حاصل کرنے کے لئے ایسا کہہ دیا ہے۔

چلئے چھوڑیئے آپ اسے' آپ اپنا کام شروع کر دیں۔

نہیں سر۔ میں کام نہیں کرتا۔ مجھے آپ دو ماہ کی چھٹی پر بھیج دیجئے۔

چلئے میں یہ بات بھی ان سے کر لوں گا۔

کیپٹن صاحب سی او کی یہ خاموشی مجھے کسی آنے والے طوفان کی خبر دیتی ہے۔

صاحب آپ بھی وہمی ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ روز پہلے تک تو آپ کی کرنل صاحب سے بڑی دوستی تھی۔

سر.... افسر اور ماتحت کی کہاں دوستی ہو سکتی ہے۔

بہرحال ٹرمز تو اچھے تھے۔ کرنل صاحب جب بھی آپ کا نام لیتے تو اس میں وہ بڑی اپنائیت کا اظہار کرتے تھے۔

اس وقت انہوں نے میری زندگی کا ایک ہی رخ دیکھا تھا۔

چھوڑیئے صاحب اب آپ اپنا کام سنبھال لیجئے۔ کیپٹن قریشی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

اچھا سر۔

اور پھر ایڈجوٹینٹ واپس اپنے دفتر میں چلا گیا۔ وہ دن احمد نے اسی ذہنی خلفشار میں گزارا اسی ذہنی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کے مشرقی پاکستان پوسٹنگ کا کچھ فیصلہ نہ ہو رہا تھا۔ یہ تلوار اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ وہ اپنا کوئی کام دلجمعی سے نہ کر سکتا تھا۔ پوسٹنگ آرڈر کی تکمیل کے متعلق وہ جب بھی ایڈجوٹینٹ سے بات کرتا وہ

ایک ہی جواب دیتا۔

صاحب سی او نے کہا ہے کہ پوسٹنگ آرڈر ابھی پینڈنگ پڑا ہے۔ احمد صاحب کو کہیں کہ وہ اپنا کام دلجمعی سے کریں۔

سر ان حالات میں کیسے دلجمعی سے کام ہو سکتا ہے........؟ میرے ذہن میں ہر وقت ایک خلش رہتی ہے۔

تو پھر آپ کے خیال میں کیا کیا جائے۔

سر پوسٹنگ بحال رکھا جائے۔ اور مجھے دو ماہ کی چھٹی دی جائے تاکہ میں چھٹی کے اختتام پر اوجڑی کیمپ میں رپورٹ کروں

نہیں صاحب میرا خیال ہے۔ کرنل صاحب آپ کو ڈھاکہ بھیجنا نہیں چاہتے۔

تو پھر میری درخواست پر یہی جواب لکھ کر مجھے واپس کر دیں۔

صاحب میں نے اگر ان سے یہ بات کہی تو وہ مجھ سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔ میں ان سے بگاڑ نہیں پیدا کرنا چاہتا۔

اگر آپ ان سے بات نہیں کر سکتے تو میں خود کر لوں گا۔

صاحب کچھ بات ٹھنڈی ہوئی ہے یہ آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔

سر.....!! اس نے تو ایک نہ ایک دن بھڑکنا ہی ہے۔

صاحب۔ آگ کا بھڑکنا اچھا نہیں۔

سر......!!! یہ میرے حقوق کی بات ہے۔ آپ ان سے میری دو ماہ کی چھٹی ہی کی بات کیجئے۔

صاحب.....!! پھر وہی عنوان کھل جائے گا۔

اچھا سر.....!! میں باقاعدہ چھٹی کی درخواست آپ کو لکھ دیتا ہوں۔ آپ اپنے ریمارکس کے بعد میری درخواست ان کے پاس بھیج دیجئے گا۔ دیکھئے پھر کیا بنتا ہے........؟

صاحب آپ قضیئے کو نمٹانا نہیں چاہتے۔ اچھا درخواست دے دیجئے۔ اس نے قدرے توقف سے کہا۔

احمد نے دوسرے دن دو ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھ کر ایڈجوٹینٹ کو دے دی۔ ایڈجوٹینٹ نے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر احمد صاحب کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیئے۔

کیوں سر خیریت......؟ آپ میری درخواست پڑھ کر ہنس پڑے ہیں۔ اس میں کوئی غلطی ہے......؟ نہیں صاحب کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں ہنسا اس لئے ہوں کہ آپ نے مضمون خوب باندھا ہے۔

بس سر ایسے ہی ہے۔ آپ مہربانی سے میری یہ درخواست اپنے ریمارکس کے ساتھ سی.او کو دے دیں۔

میں اس پر کیا ریمارکس لکھوں۔ یہ جنگ آپ کے اور سی او کے درمیان ہے۔ آپ ایک دوسرے سے خود ہی نمٹ لیں۔

نہیں جناب....!! قانوناً آپ کو اس پر اپنے کومینٹس (COMMENTS) دینے چاہیئے۔

اچھا ٹھیک ہے۔ میں اس پر اپنے ریمارکس لکھ کر کرنل صاحب کو آپ کی درخواست آج ہی دے دوں گا۔

بہت شکریہ آپ کا۔ یہ کہہ کر احمد واپس اپنے دفتر میں آگیا۔

تھوڑی دیر کے لئے کیپٹن قریشی نے اس قصے کے سارے مضمرات پر غور کیا اور پھر احمد کی درخواست پر مندرجہ ذیل کومینٹس (COMMENTS) لکھ کر ڈاک کے ذریعے اندر بھیج دی۔

جناب عالی..........!!!!

کچھ دن پہلے اس سردار نے ایک درخواست مشرقی پاکستان کے پوسٹنگ کے لئے دی تھی۔ جس پر اس کا پوسٹنگ آرڈر آگیا ہے۔ پوسٹنگ آرڈر نارمل ہے۔ ایسے پوسٹنگ آرڈرز کی تکمیل کے طور پر جن لوگوں کو مشرقی پاکستان پوسٹ کیا جاتا ہے۔ ان کو ریکارڈ آفس کی سٹینڈنگ انٹرکشن کے مطابق دو ماہ کی چھٹی دی جاتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ دو سال کے لئے مشرقی پاکستان جاتے ہیں اس لئے انہیں ایڈوانس دو ماہ کی چھٹی کی رعایت اس لئے دی گئی ہے کہ یہ جانے سے پہلے اپنی گھریلو پرابلمز نمٹا لیں۔

چونکہ J.C.O کا پوسٹنگ بائی نیم آیا ہے۔ اس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ اسے بھی فوراً دو ماہ کی چھٹی دی جائے۔

ایڈجوٹینٹ نے درخواست نارمل ڈاک کے ذریعے اندر بھیج دی۔ باقی سب ڈاک کرنل صاحب نے دیکھنے کے بعد واپس کر دی۔ لیکن احمد کی درخواست واپس نہ آئی۔ ایڈجوٹینٹ اور احمد دونو نے اپنی اپنی جگہ پر یہ سوچا کہ کرنل صاحب درخواست پر شاید ابھی کچھ مزید سوچ بچار کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ دونو چپ رہے۔

دوسرے دن کرنل نے احمد کو اپنے پاس بلایا اس سے کہنے لگے۔

احمد صاحب آپ کو یہ اچانک کیا تکلیف ہو گئی ہے کہ آپ نے درخواستیں دینی شروع کر دی ہیں۔

سر میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے درخواستیں دیتا ہوں۔ جو میرا حق بنتا ہے وہ آپ مجھے دیں۔

کیوں آپ یہاں نوکری نہیں کرنا چاہتے۔

نہیں سر.....!!!

یہاں آپ کو کیا تکلیف ہے......؟ اتنے عرصے سے آپ یہاں ہیں۔ آپ کی یہاں کتنی قدر و منزلت ہے۔

چھوڑیئے صاحب۔ اس جھوٹی انا کو۔ آپ اپنا کام یہاں ہی دلجمعی سے کریں۔ ایسٹ پاکستان میں کیا رکھا ہے......؟

نہیں سر میں اب اس یونٹ میں بلکہ اس سٹیشن پر ہی نہیں رہنا چاہتا۔ آپ مجھے مہربانی سے ایسٹ پاکستان پوسٹ کر دیجئے۔ پوسٹنگ آرڈر آیا ہوا ہے۔ آپ مجھے دو ماہ کی چھٹی دے دیں۔ ساتھ ہی میرا مومنٹ آرڈر نکال دیں۔ تاکہ آپ کو فوراً میری ریلیف مل جائے اور آپ کا کام (SUFFER) نہ ہو۔

صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ میری بیگم صاحبہ حنا صاحبہ کی بڑی دوست بن گئی ہیں۔ وہ اب ان کے ساتھ روز ٹیلی فون پر پنڈی گپ شپ کرتی ہیں۔ حنا صاحبہ کی وجہ سے وہ آپ کو بھی بہت عزیز رکھتی ہیں۔ اگر انہیں اس سارے قصے کا پتہ چل گیا تو وہ میرے ساتھ ناراض ہو جائیں گی۔

سر.........!! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کی بیگم صاحبہ کسی معاملے میں میری طرفداری کریں۔
صاحب آپ کیوں ہمارے گھر میں لڑائی کروانے کے لئے تلے ہوئے ہیں۔
شاہدہ کو جونہی پتہ چلا کہ آپ کا میں نے ایسٹ پاکستان پوسٹنگ کروا دیا ہے۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ لڑے گی۔ پھر فوری طور پر حنا صاحبہ کو پنڈی فون کر کے اس سارے قصے سے آگاہ کرے گی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر کل ہی مجھے اور ڈائریکٹر صاحب کو کسی جنرل کا ٹیلی فون آ جائے گا کہ۔ احمد صاحب کو ایسٹ پاکستان جانے سے روک دیں۔
سر ایسی بات ہے تو پھر آپ مجھے پنڈی پوسٹ کر دیں۔
بھیا۔ پوسٹنگز میرے ہاتھ میں تو نہیں ہیں۔ یہ تو آفیسر انچارج ریکارڈ کرتا ہے۔
تو سر چلنے دیں اس قصے کو۔ اب میں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ میں ایسٹ پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ تو اس پر قائم ہوں۔ اب اپنی درخواست واپس نہیں لے سکتا۔
شام ہی کو حنا صاحبہ یہاں پہنچ جائیں گی۔ اور آپ کو فلیٹیز میں دعوت دیں گی۔ آپ ان کی بات مان جائیں گے۔ میری نہیں مانتے۔
نہیں سر وہ مجھے نہیں کہے گی۔ اسے بڑی اچھی طرح سے پتہ ہے کہ میں اگر ایک دفعہ کوئی بات کہہ دوں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔
اچھا بھیا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ میں آپ کی درخواست کے متعلق ڈائریکٹر صاحب سے آج ہی بات کرتا ہوں۔
شکریہ سر.........!!!
اور احمد سیلوٹ کر کے واپس اپنے دفتر میں آ گیا۔
تھوڑی دیر میں قریشی صاحب احمد کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے۔
کیوں صاحب پھر کوئی نیا محاذ کھل گیا ہے.........؟
جی ہاں۔
وہ کون سا......؟
اب کرنل صاحب چاہتے ہیں کہ میں اپنی درخواست واپس لے لوں۔ وہ

میرا پوسٹنگ آرڈر منسوخ کروا دیتے ہیں۔ اور میں حسب سابق دلجمعی سے اپنے دفتر میں کام کروں۔

آپ نے پھر کیا جواب دیا........؟

میں نے کہہ دیا ہے کہ میں درخواستیں واپس نہیں لوں گا۔ ایسٹ پاکستان پوسٹنگ پر جانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے مجھے مروجہ قانون کے تحت دو ماہ کی چھٹی دی جائے۔ تاکہ میں اپنی گھریلو پرابلمز سالو SOLVE کر سکوں۔

مشکل ہے۔ یہ ایسا نہیں کریں گے۔

ایسا نہیں کریں گے تو اعلان جنگ اپنی جگہ پر قائم۔

چھوڑیئے صاحب جیسا کرنل صاحب کہتے ہیں آپ ان کی بات مان جائیں۔

بالکل نہیں جناب۔

آخر اس قدر ناراض ہونے کا سبب کیا ہے........؟

سبب یہ ہے کہ انہوں نے میری اس دوست خاتون کو "آوارہ عورت" کہا ہے۔ کہ تم اس آوارہ عورت کو یونٹ لائینز میں بھی لائے ہو اور اس کے ساتھ تم نے فلیٹز میں تنہائی میں راتیں بھی بسر کی ہیں۔

بس اتنی سی بات ہوئی ہے..............؟

تو آپ بھی اسے معمولی بات سمجھتے ہیں..........؟

نہیں میں معمولی نہیں سمجھتا۔ ویسے یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ کہ ایک یونٹ کے سی او اور اس کے ماتحت ایک سردار کے درمیان اس بات پر آپس میں ٹھن جائے۔

سر میں تو اسے بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔ میرے کردار پر حرف آتا ہے۔ ساتھ ہی ایک نیک دل خاتون پر مفت کی تہمت لگائی جا رہی ہے۔

صاحب مجھے پتہ ہے کہ سی۔ او صاحب کی بیگم صاحبہ کی اس خاتون سے بڑی دوستی ہے۔ جب کرنل صاحب کی بیگم صاحبہ کو پتہ چلے گا تو وہ فوراً ان کو پنڈی ٹیلی فون کر کے اس بات سے آگاہ کر دیں گی۔ اور پھر وہ فوراً آپ کی سرکوبی کے لئے یہاں

پہنچ جائیں گے۔

نہیں........!!! حنا کو جب صحیح صورت حال کا علم ہو گیا تو وہ مجھے کسی بات کے لئے پریس (PRESS) نہیں کرے گی۔

اچھا صاحب دیکھتے ہیں آپ بھی دو چار دن انتظار کریں۔ میں بھی کرتا ہوں۔ قریشی صاحب اپنے آفس میں واپس چلے گئے۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

حنا احمد کو اس کے بیس میں چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں پہنچی تو وہی کمرہ جو تھوڑی دیر پہلے رنگینیوں اور خوشیوں کی آماجگاہ تھا ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ احمد کے بیڈ کے پاس کھڑی بہت دیر تک اس بے جان بستر کو دیکھتی رہی۔ یہ اس کے محبوب کا بستر ہے۔ ماں کی گود کی طرح یہ ہمیں وہی راحت بخشتے ہیں۔ اب یہ ویران اور اجاڑ کمرہ اسے بہت ہی ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ احمد میرے ساتھ ہو تو میں جہاں بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں خوش رہتی ہوں۔ وہ نہ ہو تو فلیٹز کی رنگینیاں بھی میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔

وہ غیر ارادی طور پر احمد کے بستر پر لیٹ گئی۔ سوچنے لگی۔ وہ دکھا ہوا دل مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔ لیکن یہ دوری مجھے مار دے گی۔ یہ چند قدم یہ کالے کوس مجھ سے طے نہ ہو سکیں گے۔ اور یہ فاصلہ بڑھتا ہی جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگ گئے۔ اور وہ دل میں کہنے لگی۔ احمد نے مجھے پہلی بار خوشی اور غم کی انتہا سے آشنا کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں اب اس سے بچھڑ کر زندہ نہ رہ سکوں گی۔

میں احمد سے ملی تو پہلی مرتبہ میں نے ایک ایسے مرد کو دیکھا جس میں آسمان کی سی وسعت تھی۔ لیکن جب میں اس کے سائے تلے آ کر کھڑی ہوئی تو متحیر ہو گئی۔ مجھے بہت جلد میری نسوانی جبلت نے بتلا دیا کہ یہ مرد عورت کے پیار کا پیاسا ہے۔

اس پیاس نے اسے بہت سے کنویں جھنکوائے ہیں۔ اس پیاس کو بھولنے کے لئے اس نے اپنے اردگرد خیالات اور تصورات کا طلسم کھڑا کر دیا ہوا ہے۔ انسانی ہمدردی کا نقاب پہن کر یہ پیاسی اور دزدیدہ نگاہوں سے اپنے چاروں طرف کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ جو شاید اسے کبھی بھی نہ ملے۔ میں اکثر سوچتی ہوں اس مرد میں جو بگولوں کی سی دیوانگی ہے اسی دیوانگی ہی سے تو مجھے محبت ہے۔ اور میں کسی قیمت پر بھی اس دیوانگی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

معاً حنا کی نظریں سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔

اف آٹھ بج رہے ہیں۔ میں چھ بجے احمد کو اس کے میس میں چھوڑنے گئی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے واش کیا۔ کپڑے بدلے اور پھر مینیجر کو ٹیلی فون کیا۔

نیجر صاحب میں روم نمبر سات سے زاہدہ حنا بول رہی ہوں۔ آپ ایسا کریں میرا ناشتہ یہاں کمرے میں ہی بھجوا دیں۔ ساتھ ہی میرا مکمل بل اور اس کی رسید بھی بھیج دیں۔

بہت اچھا میڈم۔

تھوڑی دیر میں بیرا ناشتہ اور مکمل بل وغیرہ لے کر آ گیا۔ حنا نے بل کی ادائیگی اس بیرے کو کر دی۔ اور پھر ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنا سامان اٹھا کر باہر آ گئی۔ اور دروازے کو مقفل کر دیا۔ اور نیجر کو اس کے دفتر میں جا کر چابی دی۔ اور پھر اپنی گاڑی کی طرف چلی گئی۔

گاڑی کا تیل' پیٹرول اور پانی وغیرہ اس نے چیک کیا۔ اور پھر ایک ڈسٹر سے گاڑی کو اچھی طرح صاف کیا۔ اپنا سامان ڈگی میں رکھا اور پھر وہاں سے آہستہ آہستہ گاڑی کو نکال کر باہر مین روڈ پر لے آئی۔ جب راوی کا پل اس نے عبور کیا تو اس نے ٹائم دیکھا۔ صبح کے نو بجے تھے۔ وہ گاڑی آہستہ چلانے کی عادی تھی۔ اس نے دل ہی میں کہا جہلم جا کر اپنے پرانے گھر اور احمد کے کیمپ کی سب یادگاروں کو بھی دیکھوں گی۔

پھر بھی انشاء اللہ تعالٰی تین بجے دوپہر راولپنڈی پہنچ جاؤں گی۔

اس نے لاہور سے جہلم کا سفر چار گھنٹوں میں طے کیا۔ اپنی پرانی کوٹھی کے باہر مال روڈ پر گاڑی کھڑی کر دی۔ تھوڑی دیر گاڑی میں بیٹھے کوٹھی کے موجودہ

مکینوں کو دیکھتی رہی۔ اب کوٹھی کے موجودہ مالک نے اسے بڑا صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ ہرے بھرے لان' پھولوں کی کیاریاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کوٹھی کے سامنے والے لان میں چند خواتین بیٹھی خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ اور چائے پی رہی تھیں۔

حنا اس سامنے والی پلی پر جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے متعلق اس کو احمد نے بتایا تھا کہ جب تم انڈیا چلی گئی تھیں تو میں تمہاری یاد میں اداسی کے لمحوں میں اس پلی پر آ کر بیٹھتا تھا۔ اور دیوانگی کے عالم میں کوٹھی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا تھا۔ جیسے مجھے یقین ہو کہ اگلے لمحے تم کوٹھی سے برآمد ہو کر میرے پاس آ کر مجھے کوٹھی کے اندر لے جاؤ گی۔ کرنل سعید میری دیوانگی اور وحشت پر ہنسا کرتا تھا۔ اور مجھے کہتا تھا.... "کیوں پاگل ہو گئے ہو۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" لیکن اس کا عشق اتنا صادق تھا کہ اسے یقین تھا کہ میں ضرور لوٹ کر یہاں آؤں گی۔

کاش وہ اس وقت میرے ساتھ ہوتا۔ اپنی آنکھوں سے مجھے اس پلی پر بیٹھا ہوا دیکھتا۔ جس پر بیٹھ کر وہ میرا انتظار کیا کرتا تھا۔ آج میں دکھوں کی ماری اس پلی پر اکیلی بیٹھی اپنے اس وقت کے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ رہی ہوں۔ مجھے سب نظر آ رہے ہیں۔ سعید کہیں نظر نہیں آ رہا۔ نیک بخت آدمی اپنے نفس کی بتائی ہوئی راہوں پر کہیں دور نکل گیا ہے۔ اب وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہے۔ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

سامنے لان میں بیٹھی ہوئی خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ساتھ ہی حنا پلی سے اٹھ کر اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ خواتین اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ کوئی پیش رفت کرتیں حنا اپنی گاڑی چلا کر ہیڈ پوسٹ آفس کے ساتھ واقع کیمپ کی طرف چلی آئی۔

کیمپ دور دور تک ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ البتہ دور گرجے کے پاس چند چرواہے کھڑے اپنے ڈھور۔ ڈنگروں کی نگرانی کر رہے تھے' وہ مورچہ نما گڑھا ابھی تک موجود تھا جس پر احمد کا ٹینٹ لگا ہوا تھا۔ اور ایک دن وہ بھی اس خیمے میں آ کر دن بھر سوئی تھی۔ اسے احمد کا اردلی اللہ یار خان یاد آ گیا۔ میں جب بھی آتی تھی۔ خیمے

کے باہر ایک سٹول پر بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا تھا۔ کتنا وفا شعار آدمی تھا۔ احمد پر جان دیتا تھا۔

اللہ یار خان تو حنا کو نظر آگیا لیکن احمد کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ سوچنے لگی میں جب بھی آتی تھی تو احمد مجھے یہاں کبھی بھی نہیں ملا۔ ہر بار اللہ یار خان سے پوچھنے پر پتہ چلتا کہ عدم صاحب آئے تھے۔ ان کے ساتھ گئے ہیں۔ اب بھی شاید ان کو عدم صاحب آکر اپنے ساتھ اڈے پر لے گئے ہوں۔ حنا تھوڑی دیر پوسٹ آفس کی جنوب مغربی دیوار پر بیٹھی رہی اور کیمپ کی ویرانی کو دیکھتی رہی۔ یکایک اس نے گھڑی دیکھی تو چونک پڑی۔ اسے جہلم میں آئے ہوئے پورا ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔

وہ ان پرانی یادوں کو بادل ناخواستہ خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ اور جہلم شہر کی طرف چلی گئی۔ ایک دکان سے کچھ فروٹ خریدا اور پھر تھوڑی سی مٹھائی لے کر وہ واپس اپنی گاڑی میں آگئی۔ بازار میں لوگ اسے بھوکی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ لوگوں کا قصور نہ تھا۔ حنا کو جو بھی ایک نظر دیکھ لیتا پھر دیکھتا ہی رہ جاتا اس کا دل ہی نہ بھرتا۔

حنا چار بجے پنڈی پہنچ گئی۔ بابا محمد شفیع نے اسے خوش آمدید کہا۔ ڈگی سے سب سامان نکال کر حنا کے کمرے میں رکھا۔ بابا اگر ایک کپ چائے کا مل جائے تو آپ کی مہربانی ہو گی۔

بٹیا۔ ابھی لاتا ہوں۔ اور بابا کچن کی طرف بھاگ کر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے بنا کر تھرمس میں ڈال کر لے آیا۔ بابا کے پیچھے پیچھے دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی آگئیں۔ بابا نے تھرمس حنا کے سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

سرکار یہ ہے چائے اور یہ ہیں میری بیٹیاں۔ کوثر اور فردوس۔ بے چاریاں چھوٹی تھیں کہ ان کی ماں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ انہوں نے اپنی اس تھوڑی سی زندگی میں بڑی تکلیفیں دیکھی ہیں۔

حنا اٹھ کر دونو کو ملی۔ انہیں گلے لگایا اور ان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ جیسے وہ ان کی ماں ہو۔

بابا۔ ان سے آپ نے پہلے تو کبھی نہیں ملایا۔

سرکار۔۔ پہلے کرنل صاحب تھے۔ ان کا جوان اردلی تھا۔ اس لئے ان کو اس طرف کبھی ساتھ نہیں لایا۔

اب بابا ان کو آپ یہاں ہی لے آئیں۔ آپ گل شیر والا کمرہ صاف کر کے اس میں اپنا سامان رکھ لیں۔ یہ میری بہنیں ادھر میرے ساتھ کوٹھی میں رہیں گی۔ یہ میرے ساتھ والا کمرہ ان کو صاف کر کے آپ دے دیں۔

نہیں بیٹا۔ شکریہ۔ یہ ادھر ہی میرے ساتھ گل شیر والے کوارٹر میں رہ لیں گی۔ مالک اور ملازم کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے قائم رہنا چاہئے۔ ورنہ پھر عزت نہیں رہتی۔

نہیں بابا......!! یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ میں بھی اکیلی ہوں۔ میرا بھی دل بہلا رہے گا۔ یہ بچیاں بھی خوش رہیں گی۔

اچھا ٹھیک ہے۔

کوثر اور فردوس دوسرے دن حنا کے ساتھ والے کمرے میں آ گئیں۔ بابا اپنا سب سامان لے کر گل شیر والے کوارٹر میں آ گیا۔ لاہور سے واپس آ کر حنا نے ایک دن گھر پر ہی آرام کیا۔ البتہ اس نے بہت سے کام ٹیلی فون پر کر لئے۔ اگلے دن وہ بیگم رضوی اور جنرل حمید صاحب کی بیگم صاحبہ کو ملنے کے لئے گئی۔ اس نے ان دونو خواتین سے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کرنل سعید کے سب بقایاجات وصول کرے گی۔ سردست پنشن کے متعلق وہ کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکی۔

اگلے دن حنا بابا محمد شفیع کو ساتھ لے کر پہلے بازار گئی۔ وہاں سے کچھ فروٹ خریدا اور اس کے بعد وہ راولپنڈی سنٹرل جیل چلے گئے۔ حنا اور بابا نے ملاقات لکھائی۔ انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ گل شیر حیران تھا' اس نے تو ابھی تک اپنے گھر والوں کو یہ اطلاع ہی نہ دی تھی کہ اسے سول جیل ہو گئی ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ حنا صاحبہ زندگی کے کسی مرحلے پر اس کی طرف اتنی مہربانی سے دست شفقت بڑھائیں گی۔

حنا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں بیٹھی تھی۔ کہ جیل کا ایک وا '
گل شیر کو وہاں لے کر آیا۔ گل شیر کا بہت برا حال تھا۔ وہ جونہی دفتر میں داخل ہوا۔ حنا

اس کی پذیرائی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گل شیر نے شرم کے مارے سر جھکایا ہوا تھا۔ اس طرح جھکی نظروں سے حنا کو سلام کیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے گل شیر کو بیٹھنے کے لئے کرسی منگوا کر دی۔ حنا کے کہنے پر بابا نے فروٹ کے وہ لفافے گل شیر کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے وہ لفافے لیتے وقت ایک دفعہ نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس نے بڑے تاسف بھرے انداز میں حنا صاحبہ کو دیکھا اس کی نظروں میں آنسو تیر رہے تھے۔ گل شیر دل میں سوچنے لگا۔ یہ کتنی عظیم خاتون ہے۔ مجھ جیسے کمینے آدمی سے بھی یہ کتنا اچھا سلوک کر رہی ہیں۔ کرنل سعید تو بدقسمت آدمی تھا جو اس خاتون کی قدر نہیں کر سکا۔

اور اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھاتا رہا۔

حنا جتنی دیر بھی وہاں بیٹھی گل شیر اس سے آنکھیں ملا کر بات نہ کر سکا۔ حنا نے اس سے پوچھا۔

بھائی گل شیر خان۔ مجھے افسوس ہے ہم دونو کے قضیئے میں تم پر بھی آنچ آ گئی ہے۔ آپ کو یہ سزا ملی ہے۔ یہ اس ملٹری پولیس کے سپاہی کو زدوکوب کرنے پر آپ کو ملی ہے۔ ورنہ میں نے تو آپ کو ہر طرح سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

مہربانی ہے آپ کی بیگم صاحبہ۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ کرنل سعید تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ ہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔

اچھا بھائی گل شیر آپ کے کنبے کے کتنے آدمی ہیں۔ جن کا تمام تر انحصار آپ کی کمائی پر تھا۔

بیگم صاحب۔ ویسے تو ہمارے کنبہ بہت بڑا ہے۔ لیکن مجھ پر جن کی ذمہ داری تھی۔ وہ میری ایک بوڑھی ماں۔ ایک بیوہ بہن۔ ایک میری بیوی اور دو بچے ہیں۔

آپ ان کو کتنے پیسے ہر ماہ بھیجا کرتے تھے......؟

پچاس روپے ہر ماہ بھیجا کرتا تھا۔

اس سے ان کا گزارا ہو جاتا تھا۔

ہاں ہو جاتا تھا۔ مکان میرا اپنا ہے کچھ غلہ مجھے اپنے بھائیوں سے اپنے حصے کا مل جاتا تھا جو ہم سب کے لئے کافی ہو جاتا تھا۔

میں کچھ رقم آپ کی بیگم کے نام بھیجنا چاہتی ہوں۔

بڑی مہربانی ہے آپ کی۔

کس کے نام منی آرڈر کروں۔

میری بیوی کے نام پر بھیج دیں۔ میں آپ کو ڈاک کا پتہ لکھے دیتا ہوں۔

قیدیوں سے ملاقات کے اوقات ختم ہو گئے۔ گھنٹی کی آواز سننے پر گل شیر خان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ حنا صاحبہ کو فیس نہ کر سکتا تھا۔ دل میں سوچنے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے یہ نیک دل خاتون میرے ساتھ میرے بیوی بچوں کے ساتھ کیسا فراخدلانہ سلوک کرنے کی متمنی ہے۔ اس نے روتے ہوئے حنا صاحبہ کے پاؤں پکڑ لئے۔ حنا نے اسے دونو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔

حوصلہ کرو۔ میرے بھائی۔ یہ مشکل وقت بھی کٹ جائے گا۔

بیگم صاحبہ یہاں کی مشکلات پر رونا نہیں آ رہا۔ میں اپنے اس کئے پر شرمندہ ہوں۔ جو میں نے سعید کی معیت میں آپ کے ساتھ روا رکھا۔ مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہ تھی کہ میں کرنل سعید کی حکم عدولی کرتا۔ اب اپنے کئے پر رونا آ رہا ہے۔ آپ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ اگر آپ نے مجھے معاف کر دیا تو یہ سزا میں ہنستے کھیلتے گزار لوں گا۔

اس کے ساتھ گل شیر کو وارڈن جیل کی طرف لے گیا اور حنا اور بابا محمد شفیع واپس اپنی کوٹھی پر آ گئے۔ کوثر اور فردوس ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا تیار کر رکھا تھا۔ سب نے مل کر دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا اکٹھا کھایا۔ آج کھانے میں کچھ اور ہی مزہ تھا۔ شروع میں تو بابا محمد شفیع اور اس کی بیٹیوں نے ایک عجیب سی جھجک محسوس کی لیکن حنا کے بار بار کہنے پر وہ تینوں اس کے ساتھ کھانا کھانے میں شامل ہو گئے۔

ماں کے مر جانے کے بعد کوثر اور فردوس نے آج ایک معزز خاتون کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھی کھانا کھا رہی ہیں۔

لاہور سے واپس آنے کے دس دن بعد حنا کو کرنل سعید کے بقایا جات اور بینک میں جمع شدہ رقوم ملا کر پانچ لاکھ ستر ہزار روپے ملے۔ حنا نے فوراً گل شیر خان

کی بیوی کے نام دس ہزار روپے منی آرڈر کر دیئے۔ ساتھ ہی ان کو یہ بھی لکھا کہ جب تک گل شیر خان واپس اپنے گھر نہیں آ جاتے میں آپ کو ماہ بماہ ایک سو روپے ضروری اخراجات کے لئے ارسال کرتی رہوں گی۔ ساٹھ ہزار روپے تیس ہزار کوثر کے جہیز اور تیس ہزار فردوس کے جہیز وغیرہ کے لئے حنا نے بابا محمد شفیع کو دیئے۔ اس نے بابا سے کہا کہ اب آپ ان دونو بیٹیوں کی شادیاں جلد از جلد کر دیں۔ مزید اگر رقم کی ضرورت پڑے گی تو وہ میں دوں گی۔ بابا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے وہ بڑے ہی جذباتی انداز میں حنا سے کہنے لگا۔

بٹیا۔ اتنے پیسے کی کیا ضرورت ہے۔ پانچ چھ ہزار روپے میں کام چل جائے گا۔

نہیں بابا۔ آپ ان کے لئے اچھا جہیز بنائیں تاکہ یہ کل اپنے سسرال میں جائیں تو ان کے سر نیچے نہ رہیں۔

بیٹا مجھے جہیز بنانا کہاں آتا ہے۔ مجھے کیا خبر ہے۔

بابا میں ان دونو کو سمجھا دوں گی وہ دونو بازار جا کر کپڑا لتا اور ضروری سامان لے آئیں گی۔

بیٹا میں ان کے سسرال والوں کو کیا تاریخ دوں؟

بابا پہلے سامان اکٹھا ہو لینے دیں۔

ان دونو بہنوں نے حنا کے مشورے سے اور اپنی پسند سے اپنے جہیز کا سب سامان خرید لیا۔ جب حنا کو پوری تسلی ہو گئی تو اس نے بابا کو کہا کہ بابا اب آپ لڑکے والوں سے بات کر لیں۔ کوئی مناسب تاریخ مقرر کر دیں۔ کم از کم ایک ہفتہ کی تاریخ ضرور ہو۔ تاکہ کھانے وغیرہ کا انتظام کیا جا سکے۔

پروگرام کے مطابق دونو بہنوں کی شادی ایک ہی دن بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔ دونو براتیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کے کھانے کا انتظام حنا نے کیا تھا۔ برات والے کھانا وغیرہ کھا کر اپنی اپنی دلہنوں کو سجی سجائی گاڑیوں میں بٹھا کر لے گئے۔ کھانے کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ سب لوگوں نے کھانے کی بڑی تعریف کی۔ بریگیڈیئر رضوی صاحب ان کی بیگم اور بچوں نے بھی ان شادیوں میں شرکت کی۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

ان سب ضروری کاموں سے فارغ ہو کر حنا نے رات کو نو بجے احمد کے دفتر میں ٹیلی فون کیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ احمد کا تبادلہ ایسٹ پاکستان ہو گیا ہے۔ فی الحال وہ دو ماہ کی چھٹی پر گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ اسے بڑی فکر لاحق ہوئی۔ کہ میری وجہ سے ہر دفعہ اس بے چارے کو نشانہ بننا پڑتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے یہ پانچ لاکھ روپے وہ احمد کے نام پر بینک میں ڈیپازٹ کروا دے۔ وہ احمد کے مزاج سے بھی واقف تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ وہ یہ رقم قبول نہ کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آ رہی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے ناامید ہو گئی۔ آخر کار اس نے تھک ہار کر لاہور ہی میں احمد کے کمانڈنگ آفیسر کی بیگم جو اس کی سہیلی تھی کو ٹیلی فون کیا۔

ہیلو۔ میں ------- نمبر سے بول رہی ہوں۔

آپ کون بول رہی ہیں۔

میں لاہور سے شاہدہ بول رہی ہوں۔

شاہدہ آپا۔ میں پنڈی سے حنا بول رہی ہوں۔ کہئے کیا حال ہے۔ خیریت سے ہیں آپ سب لوگ۔

جی شکر ہے۔ سب ٹھیک ہیں۔

بھائی جان کا کیا حال ہے۔

وہ بھی ٹھیک ہیں۔

ذرا میری ان سے بات کروا دیں۔

وہ تو کلب چلے گئے ہیں۔ کوئی میسج ہو تو مجھے بتا دیں۔

شاہدہ نہیں۔ ایک کام ہے آپ ہی کے ذمہ لگاتی ہوں۔

ضرور ضرور۔ بھئی کیا کام آن پڑا ہے۔

آپا بات یہ ہے کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے احمد صاحب کے دفتر میں ٹیلی فون کیا۔ کہ ان کو اس نمبر پر بلوا کر ان سے بات چیت کر سکوں۔ لیکن ڈیوٹی کلرک نے بتایا ہے کہ ان کا ایسٹ پاکستان پوسٹنگ ہو گیا ہے اور وہ اس وقت دو ماہ کی چھٹی پر گاؤں گئے ہوئے ہیں۔

ہاں حنا۔ یہ سب بات ٹھیک ہے مجھے چودھری نے بتایا ہے۔ احمد صاحب نے خود زبردستی درخواست دے کر یہ پوسٹنگ کروایا ہے۔

اچھا آپا۔ اب آپ ایسا کریں ۔ بھائی جان سے کہہ کر احمد کی WHEREABOUTS کا پتہ لگا کر مجھے مطلع کریں۔ وہ اگر اپنے گاؤں میں ہیں تو ان کا وہاں کا پتہ بھی آپ مجھے بتائیں۔

کیوں میری بنو۔ احمد صاحب ناراض ہو کر روپوش ہو گئے ہیں۔

نہیں آپا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھ سے تو وہ خوشی خوشی الگ ہوئے تھے۔

ارے بنو۔ ان مردوں کی زیادہ ناز برداری کرو تو پھر یہ نخرے دکھانے لگ جاتے ہیں۔

نہیں آپا۔ میرے اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں ہے۔ ہمارے تعلقات ایک عام عورت اور مرد کے تعلقات نہیں ہیں۔

تو تم نے اس میں ایسا کون سا سرخاب کا پر دیکھا ہے۔ کہ دیوانی ہوئی جا رہی ہو۔

آپا مجھے اس کی بگولوں کی سی دیوانگی اچھی لگتی ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ میرے جسم سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ہم دونو اچھے دوست ہیں۔ اگر میں اس کی محبوبہ ہوتی اور اسے میرے جسم سے پیار ہوتا۔ اس صورت میں ہم دونو میں خیال و عمل کی آگ بجھ جاتی۔ اور ہم دونو ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے۔ پھر ہماری محبت حال و مستقبل میں زندہ نہ رہتی۔ بلکہ ماضی کے دھندلکوں میں مدفون ہو گئی ہوتی۔

اچھا حنا۔ میں کل اس وقت تم سے بات کروں گی۔ احمد کے متعلق آپ کو پوری انفارمیشن دوں گی۔

بہت شکریہ۔ آپ کا۔

بڑی شکستہ دلی کے عالم میں حنا نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب اس کے سامنے ایک نیا کرائیسس سر اٹھا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ مجھے زندگی میں چین کبھی نہ ملے گا۔ میں یونہی زندگی کے گرداب میں پھنسی کبھی سطح آب پر آؤں گی اور کبھی ہولناک گہرائیوں میں چلی جاؤں گی۔ مجھے زندگی میں کبھی روشنی کی کرن دیکھنا نصیب نہ ہو گی۔

احمد بیچارہ ایک سیدھا سادھا دیہاتی۔ ایک روائتی فوجی ایک ہی سیدھ میں چلنے والا۔ جسے نہ کسی خوبصورت عورت کے مرمریں جسم سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی زر و سیم سے کوئی پیار ہے۔ میری وجہ سے تاریکیوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ نہ جانے بے چارے کا کیا انجام ہو گا۔

وہ اٹھ کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ سوچنے لگی۔ میں انڈیا جا کر بھی کیا کروں گی۔ ماں کسی موجو کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہو گی۔ باپ کسی ایسی عورت کی تلاش میں سرگرداں ہو گا جو اسے بیٹا دے سکے۔ اس کی اتنی بڑی جاگیر اور مال و دولت کا وارث بن سکے۔

بیٹیاں بے چاری کسی شمار و قطار میں بھی نہیں ہوتیں۔ احمد مجھے زبردستی انڈیا دھکیلنا چاہتا ہے۔ اس کا مجھ سے کسی قسم کا بھی کوئی مفاد وابستہ نہیں اسے میرے جسم کی ضرورت ہے نہ روپے پیسے کی۔ پھر وہ مجھ سے چاہتا کیا ہے۔ میں نے تو اپنی اس زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں دیکھا سب بھنورے کی طرح نئے کھلنے والے پھولوں کی

تلاش میں ہوتے ہیں۔ احمد کا بھی میری طرح نفسیاتی کیس ہے۔ لیکن تحلیل نفسی کوئی ماہر نفسیات ہی کرے تو کرے۔ ویسے حضرت کو جو کمپلیکس ہے مجھے تو اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

چند دن کے لئے کوثر اور فردوس آئیں۔ اس اجڑے ہوئے کاشانے میں ایک بہار سی آ گئی تھی۔ دونو خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ خدا انہیں اپنی آئندہ زندگی میں خوش رکھے۔ اب پیچھے بابا بیچارہ اکیلا رہ گیا ہے۔ بیوی بیچارے کی پہلے مر گئی۔ اب بچیوں کے ساتھ اس کا دل بہلا ہوا تھا وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ ہمارا یہ گھر ہی منحوس ہے اس میں ویرانی برستی رہتی ہے۔ ساتھ کے گھروں میں ہر وقت بچوں کی قلقاریاں اور مکینوں کے قہقہوں کی دلنشین آوازیں آتی رہتی ہیں۔ کتنی اللہ کی رحمت ہے ان لوگوں پر زندگی تو پیار اور محبت سے بسر کی جاتی ہے۔ روپے پیسے سے نہیں۔ سعید نیک بخت کو نہ جانے پیسے کے حصول کا کیا خبط تھا۔

خدا کرے احمد کی کوئی خبر مل جائے۔ اب میں نے یہاں کے تو سب کام نمٹا لئے ہیں وہ آئے تو کوئی مستقل پروگرام بنایا جائے۔ خیالات کے اس بھنور میں وہ ڈوب کر میٹھی نیند کے مزے لینے لگ گئی۔ دوسرے دن صبح سویرے بابا محمد شفیع نے دروازہ ناک کیا اور حنا کو بیڈ ٹی لا کر دی۔ یہ BAD TEA بقول احمد کے' وہ پی کر پھر بستر میں لیٹ گئی۔ آج اس کا اٹھنے کو جی نہ کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی بڑی بے دلی سے کھایا۔ پھر جا کر بستر میں لیٹے لیٹے مدھم سروں میں لتا کے گانے سنتی رہی۔ اسے لتا سے ایک والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اسے لاہور سے شاہدہ کے ٹیلی فون کا انتظار تھا لیکن ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں رات کو نو بجے ٹیلی فون کروں گی۔ سات گھنٹے ابھی باقی ہیں۔ مجھے سات صدیاں ابھی سولی پر لٹک کر گزارنی ہیں۔

ایک ایک پل گن کر وہ سات صدیاں گزریں۔ حنا ٹیلی فون اٹھا کر صوفہ سیٹ پر لے گئی۔ وہ سوچنے لگی اب کسی لمحے بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بج سکتی ہے۔ ساڑھے نو بج گئے۔ ٹیلی فون نہ آیا۔ اس کی بے چینی میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر کار مایوس ہو کر اس نے خود ہی شاہدہ کو ٹیلی فون کیا کسی نے فوراً ٹیلی فون اٹھا لیا۔

ہیلو میں شاہدہ ------- نمبر سے بول رہی ہوں۔

آپا میں حنا پنڈی سے بول رہی ہوں۔ آپ نے بڑا انتظار کروایا۔

حنا میں کافی دیر سے رنگ کر رہی تھی۔ تمہارا نمبر نہیں مل رہا تھا۔

آپا یہ تو بالکل خالی تھا۔

نہ جانے پھر کیا وجہ ہو گی۔

آپا میں ٹھیک نو بجے سے ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھی ہوں۔

حنا میں نے چودھری سے بات کی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ احمد صاحب یونٹ سے تو چلے گئے ہیں اس کے بعد ہمیں ان کی کوئی خبر نہیں۔ البتہ وہ ان کے گاؤں کا پتہ لکھ کر لے آئے ہیں۔ آپ اسی پتہ پر ان کو خط لکھ دیں۔ مل جائے گا۔

اچھا آپا۔ آپ ان کے گھر کا پتہ ہی بتا دیں۔

شاہدہ نے حنا کو احمد کے گاؤں کا مکمل پتہ لکھوا دیا۔ تھوڑی دیر انہوں نے گپ شپ کی اور پھر ٹیلی فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون سے فارغ ہو کر فوراً حنا نے احمد کو اس کے گاؤں کے پتہ پر خط لکھا اور پھر اسے پوسٹ کرنے کے لئے گاری میں بیٹھ کر G.P.O چلی گئی۔ خط پوسٹ کرنے کے بعد اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ وہ بازار سے کچھ فروٹ لے کر واپس اپنی کوٹھی پر آ گئی۔

شام کو کوئی نہ کوئی فیملی والا آفیسر اس سے ملنے کے لئے اس کی کوٹھی پر آ جاتا۔ جنرل حمید اور اس کی بیگم دونو حنا کو بالکل اپنی بچی سمجھتے تھے۔ اور اس کی بیگم اس شام حنا کو ملنے کے لئے آئی۔ بابا جلدی سے چائے لے کر آیا چائے پیتے ہوئے جنرل صاحب نے حنا سے پوچھا۔

بیٹی آپ کو کرنل سعید کے بقایاجات اور اس کے بینک کی تمام رقوم مل گئی ہیں۔

"سر-----!!! مل گئی ہیں۔"

"کتنے پیسے ملے ہیں بیٹے۔"

سر.....!! پانچ لاکھ ستر ہزار روپے۔

"بیٹے یہ پیسے سنبھال کر بینک میں رکھ دو۔ اور اب بڑی احتیاط سے خرچ

کرنا۔"

"سر۔۔۔!! پانچ لاکھ روپے میں نے بینک میں جمع کروا دیئے ہیں۔ ساٹھ ہزار روپے بابا محمد شفیع کی دو بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں۔"

"اپنی بیٹیوں کی شادیاں وہ خود کیوں نہیں کرتا تھا۔"

"سر....!! اس کے پاس پیسے کہاں تھے۔"

"باقی دس ہزار روپے۔"

"سر وہ جو ہمارا اردلی تھا نا۔ گل شیر خان جسے سزا ہو گئی ہے۔ اس کے بیوی بچوں کو منی آرڈر کئے ہیں۔ بے چارے کی بوڑھی ماں۔ ایک بیوہ بہن۔ ایک بیوی اور دو بچے پیچھے گاؤں میں رہ گئے ہیں۔ خدا کے سوا اور ان کا کوئی نہیں۔"

"بیٹے یہ سب آپ کو کس نے بتایا ہے۔"

"سر میں نے گل شیر خان سے جیل میں جا کر ملاقات کی ہے۔ یہ سب باتیں مجھے اس نے بتائی ہیں۔"

"بیٹے اس ملک میں تو سب گل شیر ہیں۔ آپ کتنوں کی مدد کریں گی۔"

"بس سر جو کچھ مجھ سے ہو سکا کروں گی۔ جب سب کچھ ختم ہو گیا تو خاموش ہو جاؤں گی۔"

"بیٹے تمہیں تو کوئی ایک وقت کی روٹی بھی نہ دے گا۔ یہ بڑے مطلب پرست لوگ ہیں۔ آپ سب لوگوں کو احمد نہ سمجھیں۔"

"اب بیٹے کیا پروگرام ہے آپ کا۔"

سر......!!! آپ دونو میرے ماں باپ کی جگہ پر ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کوئی شریف النفس دیندار سا آدمی کنوارا یا رنڈوا، جس کی عمر پینتیس چالیس سال کے قریب ہو بے شک غریب ہی کیوں نہ ہو میں اس سے شادی کر لوں۔ اور یہاں پاکستان ہی میں رہوں۔ لیکن احمد صاحب مجھے مجبور کرتے ہیں کہ آپ یہاں کسی سے شادی نہ کریں۔ انڈیا واپس اپنے والدین کے پاس لکھنؤ چلی جائیں۔ اب تمہارے والد بھی بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ انہیں تمہاری خدمت کی ضرورت ہو گی۔ وہاں پھر حالات دیکھ کر کوئی مناسب رشتہ اگر مل گیا تو بے شک شادی

کر لینا۔

"بٹی احمد صاحب کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتا۔ پاکستان بننے کے بعد اب ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔"

"سر.....!!! آپ کی یہ بات ٹھیک ہے میں اس سے مکمل طور پر اتفاق کرتی ہوں۔ لیکن مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ احمد کی دلشکنی میں نہیں کر سکتی۔"

"اس کی اس میں کیا مصلحت ہے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ مجھے بوجھ سمجھتا ہو۔"

"بٹی اگر بوجھ سمجھتا ہوتا تو چپکے سے الگ ہو جاتا۔ وہ آپ سے کیا فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" بس دوست ہے۔ مجھے دیکھ کر جیتا ہے۔

"تو وہی آپ کے ساتھ شادی کر لے تو سب سے اچھا ہے۔"

"سر اگر ایسا ہو جاتا تو یہ سب سے اچھی بات ہوتی لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔"

"اچھا بٹی دیکھیں گے۔"

جنرل صاحب اور ان کی بیگم اجازت لے کر چلے گئے۔

حنا نے احمد کو اس کے گاؤں کے پتہ پر خط لکھا۔ کہ میں نے یہاں کے سب کام نمٹا لئے ہیں۔ سعید کے سروس بقایا جات اور بینکوں میں جمع شدہ رقم مجھے مل گئی ہے۔ اب میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ اب صرف آپ کا انتظار ہے۔ آپ آ جائیں تو آخری بار چند ضروری باتوں کا تصفیہ کر لیا جائے۔ پھر اس کے بعد باہمی صلاح و مشورے سے جو بھی پروگرام بنا میں اس پر فوراً عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں گی۔ اب آپ سے عرض ہے کہ آپ کسی مزید تاخیر کے بغیر فوراً آ جائیں۔ آپ گھر والوں کو بھی اگر ساتھ لے آئیں تو جانے سے پہلے میری بھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ اگر کسی وجہ سے وہ لوگ نہ آ سکیں تو آپ ان کو بتا کر آئیں کہ میں کم از کم ایک ہفتہ یا دس دن پنڈی رہوں گا۔

حنا کا خیال تھا کہ دیہاتوں میں ڈاک تاخیر سے جاتی ہے اس لئے تین چار

دن میں یہ خط احمد کو جا کر ملے گا۔ پھر دو دن اس کو آنے میں جائیں گے۔ لیکن احمد اس کے اندازے سے پہلے ہی آ گیا۔

حنا ابھی بستر میں لیٹی ہوئی تھی کہ ایک تانگہ اس کی کوٹھی کے سامنے آ کر رکا۔ اس نے بستر سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ احمد تانگے سے اتر کر اسے کرایہ دے رہا تھا۔ حنا اسی حالت میں دیوانہ وار باہر دوڑی ہوئی آئی۔ احمد نے مین گیٹ سے بیل دیا۔ حنا نے دوڑ کر گیٹ کھولا اور بغیر کسی جھجک کے اسے اپنے چھاتی کے ساتھ لگا لیا۔ اور دیوانوں کی طرح اسے بوسے دینے لگ گئی۔ جب ذرا جوش کم ہوا اور جذبات کچھ ٹھنڈے پڑے تو اس نے احمد کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوٹھی کے اندر لے آئی۔

اندر آ کر بڑی دیر تک احمد کو گلے لگائے کھڑی روتی رہی۔ اس سے احمد چونکا۔ اس نے حنا سے کہا۔

"کیوں حنا خیریت تو ہے۔ پھر کوئی نیا قصہ ہو گیا ہے تم بہت گھبرائی ہوئی ہو۔"

"نہیں جان من...!! بالکل خیریت ہے کوئی قصہ نہیں ہوا۔ تم جب مجھے ملتے ہو تو میں یہی سمجھتی ہوں کہ تم کئی صدیوں کے بعد مجھ سے مل رہے ہو اور اس تمام عرصے میں میں سولی پر لٹکی رہی ہوں۔"

حنا اب میں آ گیا ہوں۔ جب تک تم نے کہا میں تمہارے پاس رہوں گا۔

"سچی۔"

"ہاں بالکل"

"میری توقع سے کم از کم تم تین دن پہلے آ گئے ہو۔ میرا خیال تھا کہ گاؤں میں ڈاک اتنی جلدی نہیں ملتی۔"

نہیں پرسوں شام کو تمہارا خط ملا۔ کل دوپہر کو میں گاؤں سے روانہ ہوا۔ رات ریل کے اذیت ناک سفر میں گزری صبح سویرے منہ اندھیرے پنڈی پہنچا۔ ویٹنگ روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ چائے پی۔ وہاں ہی بیٹھ کر تھوڑی دیر اخبار پڑھتا رہا۔ کچھ روشنی ہوئی تو سٹیشن سے باہر آیا۔ تانگہ لیا اور در دولت پر سلام کے

لئے حاضر ہو گیا ہوں۔

"احمد اب تم بڑے ڈپلومیٹ بنتے جا رہے ہو۔"

"وہ کیوں کر محترمہ۔"

اب بڑے ہیر پھیر والی زبان استعمال کرنے لگے ہو۔

اچھا حنا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں گاؤں چھٹی پر ہوں۔

میں نے لاہور تمہارے دفتر ٹیلی فون کیا تھا۔ ڈیوٹی کلرک نے بتایا کہ آپ کا پوسٹنگ ایسٹ پاکستان ہو گیا ہے اور آپ اب دو ماہ کی چھٹی پر گاؤں چلے گئے ہیں۔ پھر میں نے کرنل چودھری کی بیگم کو ٹیلی فون کیا۔ شاہدہ کو تمہارے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ مجھے سے کہنے لگی چودھری اس وقت کلب گیا ہوا ہے۔ وہ واپس آئے گا تو میں اس سے سب بات پوچھوں گی۔ احمد جہاں کہیں بھی ہوا اس کا مکمل پتہ لے کر بتاؤں گی۔

اچھا۔ تو یہ میرے گھر کا پتہ آپ کو کرنل چودھری کی بیگم نے دیا ہے۔

جی ہاں۔ دوسرے دن کرنل چودھری دفتر سے غالباً نوٹ کر کے لے آیا تھا۔ میں نے پھر رات نو بجے ٹیلی فون کیا تو یہ سب انفارمیشن شاہدہ نے مجھے دی۔

تو اب حضور اپنے اس غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے.....؟

بتا دوں گی۔ ابھی تو آئے ہو۔ نہاؤ دھوؤ' کپڑے بدلو۔ کچھ دیر آرام کرو۔ اب اس کے بعد کا پروگرام آپ کے ساتھ بیٹھ کا بنانا ہے۔

بھئی حنا اب جو بھی پروگرام بنانا ہے۔ مجھے نفی کر کے بنانا۔

وہ کیوں۔ اب مجھ سے تنگ آ گئے ہو۔

نہیں حنا یہ بات نہیں ہے۔ شائد تمہیں شاہدہ نے نہ بتایا ہو گا میرا پوسٹنگ ایسٹ پاکستان ہو گیا ہے اب میں یہ رخصت گزار کر ڈھاکہ چلا جاؤں گا۔

تم نے خود پوسٹنگ کروائی ہے۔ یا انہوں نے اپنے طور پر کی ہے۔

نہیں میں نے خود کروائی ہے۔

تم نے خود کیوں کروائی ہے۔ تمہیں اچھی طرح سے پتہ ہے پاکستان بھر میں تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں۔ تم مشرقی پاکستان چلے جاؤ گے تو میرا کیا بنے گا۔

میرے ڈھاکہ جانے سے پہلے آپ انڈیا چلی جائیں۔

احمد سچ کہوں۔ میرا انڈیا جانے کو دل نہیں کرتا۔

بھئی وہاں تمہاری ماں ہے۔ تمہارا باپ ہے ان کی ایک وسیع و عریض جاگیر ہے۔ وہاں تم لوگوں کی لمبی چوڑی برادری ہو گی۔ دیکھ بھال کر اپنے کسی برابر کے آدمی سے شادی کر لینا اور بقایا زندگی آرام سے گزار لینا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔

نہیں حنا۔ یہ بات نہیں ہے اس بھری دنیا میں تمہیں میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔

لیکن احمد یہ پیار کس کام کا۔ جب تک ہم ایک ابدی رشتے میں نہ منسلک ہو جائیں یہ پیار بے معنی ہے۔

حنا آج پھر نئے سرے سے تم نے الف بے پڑھنی شروع کر دی ہے۔ میں نے پہلے دن جہلم میں آپ کو بتا دیا تھا کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں میرے دو بچے ہیں میں اپنی خوشی کے لئے ان کو ایک دہکتے جہنم میں نہیں جھونک سکتا۔ دوسری بات رہ گئی۔ شادی کے بغیر جنسی تعلقات کی وہ اگر سورج مشرق کی بجائے مغرب سے بھی طلوع ہونے لگے تو میں اس غلط راہ پر آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک تمہارے دل کے کسی نہاں خانے میں یہ آرزوئیں دفن ہیں تو ان کو نکال کر پرے پھینک دو میں ان اذیتوں میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کو شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ میں بحیثیت ایک دوست کے ہر وقت ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ آپ جنسی آسودگی حاصل کریں۔ یہ ناممکن ہے میں اگر ہزار سال بھی زندہ رہوں پھر بھی یہی میری آخری بات ہو گی۔

احمد تم سے ڈیل کرنا مشکل ہے تم بڑے زود رنج ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا منا لیتے ہو۔ ہم آج بھی اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں آج سے دو سال پہلے تھے تمہاری یہ بے لوث چاہت یہ دیوانگی مجھے اپنی کشش کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتی۔ میں سعید سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن تمہارے کہنے پر کی۔ اب میں کسی بڑے آدمی سے شادی کرنے کی ہرگز متمنی نہیں۔ کوئی شریف النفس بے شک غریب آدمی ہو۔ جس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو۔ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے تو میں

اس سے شادی کرنے کو ترجیح دوں گی بجائے اس کے کہ میں پھر بمبئی کی کسی تنگ تاریک چالی میں اپنی ماں کے کسی مہمان کے ہاتھوں بے عزت ہو کر اور عصمت گنوا کر سیڑھیوں سے دھکے دے کر نیچے گرا دی جاؤں اور پھر معصیت کی اس دلدل سے کبھی باہر نہ آ سکوں تم میری اس ضمن میں تو کوئی مدد کرو۔

نہ بھئی۔ پہلے سعید کے ساتھ تمہاری شادی کروا کر اس غلطی پر میری ضمیر مجھے اب تک کوستی ہے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا۔

تو یہ ذمہ داری کون قبول کرے گا........؟

میں نہ آپ کا باپ ہوں نہ آپ کا بھائی۔

دوست تو ہیں نا---!!!

دوست ہوں۔ اس کا مجھے دل و جان سے اقرار ہے۔

احمد صاحب دل کے رشتے تو خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

اچھا حنا مجھے اس معاملے پر کچھ دن غور کر لینے دو۔

کچھ دنوں کے بعد تو تم بھاگ کر ڈھاکہ چلے جاؤ گے۔ اور پھر سحر بنگال میں گرفتار ہو کر ان دراز گیسوؤں کی گرفت سے باہر کیسے آ سکو گے۔

ان گیسوؤں سے بنگالی حسیناؤں کے گیسو زیادہ حسین اور زیادہ پر کشش ہوں گے۔ احمد نے حنا کے بالوں کی ایک لٹ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اچھا دو چار دن مزید غور کر لو۔ لیکن چاہتی ہوں کی تم بنگال جانے سے پہلے میرا کوئی معقول انتظام کر جاؤ۔

حنا کسی افسر سے تو میں تمہاری شادی نہیں کروا سکتا۔ اپنے حلقہ یاراں میں دیکھوں گا لیکن اس میں ایک پرابلم تمہیں پیش آئے گی۔ اگر کسی نچلے درجے کے فوجی سے میں تمہاری شادی کروا بھی دوں تو تم اس طرح کی زندگی نہیں بسر کر سکو گی۔ جس طرح کی زندگی ہم لوگ یہاں یا اپنے گھروں میں گزارتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں کوئی نوکر، نوکرانیاں نہیں ہوتیں۔ ہماری خواتین کو سب کام اپنے ہاتھ سے خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ بچے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان سب

خدمات کے باوجود میاں کا بات بات پر زدو کوب کرنا الگ۔

احمد تم مجھے لیکچر دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش مت کرو۔ میں یہ سب باتیں جانتی ہوں۔ تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ زندگی کا تجربہ بھی تم سے میرا زیادہ ہے۔

اچھا گورو بابا مان لیا۔ سوچ کر بتاؤں گا۔

ابھی تو تمہارے خاوند کو مرے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ عدت کے اختتام پر ہی شادی کرو گی یا پہلے کرنا چاہتی ہو۔

نہیں بھئی عدت ختم ہو گی تو تب کروں گی۔

تو تب تک آپ کا یہ خادم ڈھاکہ جا چکا ہو گا۔

ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ نکاح کے وقت میرا ولی کون ہو گا؟

کوئی ضرورت نہیں۔ اگر بہت ہی ضروری سمجھو تو بابا محمد شفیع کو اپنا ولی بنا لینا۔

ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔

اچھا چھوڑو اس قصے کو یہ تو اپنے وقت پر طے ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ میں نے سارے معاملات طے کر لئے ہیں سعید کے سروس کے بقایاجات اور بینکوں میں جمع شدہ سب رقوم مجھے مل گئی ہیں یہ تھے پانچ لاکھ ستر ہزار روپے۔ اس میں سے دس ہزار روپے میں اپنے اپنے سابقہ اردلی گل شیر خان کے بیوی بچوں کو بھیج دیئے ہیں پیچھے گھر میں بیچارے کی ایک بوڑھی ماں ایک بیوہ جوان بہن۔ ایک بیوی اور دو بچے رہ گئے ہیں۔ ان سب کا گزارہ اس کی تنخواہ پر تھا میں نے اس کی بیوی کو لکھا ہے کہ میں آپ کو ہر ماہ ایک سو روپے باقاعدگی سے بذریعہ منی آرڈر بھیجتی رہوں گی۔ بقایا رقم میں بابا محمد شفیع کی بیٹیوں کے جہیز کے لئے میں نے ان کو تیس تیس ہزار روپے دیئے ہیں اور چند ہی روز پہلے ان دونو کی شادی کروا کر ان کو اپنے اپنے گھروں کو بھیج دیا ہے۔ اب باقی پانچ لاکھ روپے تمہارے حصے کے پڑے ہوئے ہیں تم چاہو تو دستی لے جاؤ لیکن بہتر یہ ہو گا کہ یہاں بینک میں اکاؤنٹ کھول لو جو بعد میں تم جہاں چاہو وہاں تبدیل کروا لینا۔

حنا میں نے اتنی بڑی رقم کو کیا کرنا ہے؟ ہماری ضرورتیں بڑی محدود ہوتی ہیں۔ میری اپنی تنخواہ میں ہی میری اچھی خاصی گزر بسر ہو رہی ہے۔ میں نے یہ رقم لے کر کیا کرنا ہے اس ملک میں بلکہ ہمارے اپنے ارد گرد مجھ سے زیادہ مستحق لوگ آپ کو ملیں گے۔ اس رقم کی میری نسبت ان کو زیادہ ضرورت ہو گی۔ یہ رقم آپ ان مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ اور میری اس دائمی عذاب سے خدارا گلو خلاصی کرائیں۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

احمد نے ایک ہفتہ حنا کے پاس قیام کیا۔ اس عرصے میں وہ گھر سے باہر بہت ہی کم نکلے۔ صرف حنا کے اصرار پر جنرل حمید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے کے لئے گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر واپسی پر اپنے گھر آ گئے۔

حنا میری کون سی بات تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ احمد نے بڑے پیار سے پوچھا۔

احمد تمہاری یہ دیوانگی مجھے اچھی لگتی ہے اس وارفتگی پر میں فدا ہوں۔

حنا میں ہر وقت یہ سوچا کرتا ہوں کہ میرا جنس سے یہ فرار نہ جانے درست ہے یا غلط اس سے ہم دونوں کی زندگی میں ایک مسلسل تشنگی باقی رہے گی اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ چونکہ مجھ میں اتنی جرات نہیں کہ میں مروجہ اخلاقی حدود کو پھلانگ کر اپنے اس جنسی خلفشار کو سکون کی گود میں سلا سکوں۔ میں سوچتا ہوں نہ جانے ہم دونو ناکامی کا یہ غم آگیں بار اٹھائے زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔ اگر میں شروع میں ہی تمہاری بات مان جاتا تو دوسرے مردوں کی طرح میں بھی جلد اس سے اکتا جاتا۔ یا پھر لوہے کی طرح تمہارے مرمریں جسم کے مقناطیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ جاتا۔ دونو صورتوں میں ہمارے خیال و عمل کی آگ بجھ جاتی اور ہم دونو ایک دوسرے کو اس کا ذمہ

دار قرار دیتے۔ پھر ہماری محبت حال و مستقبل میں زندہ نہ رہتی۔ بلکہ ماضی میں مدفون ہو جاتی۔

آخر کئی دنوں کی مسلسل سوچ بچار اور بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ حنا انڈیا جا کر حالات کا جائزہ لے۔ وہ کوشش کرے کہ لکھنؤ جا کر اپنے والد سے ملے اور اگر حالات سازگار ہوں تو وہ وہاں مستقل طور پر رہ جائے اور اگر والد نے اچھی طرح سے پذیرائی نہ کی تو واپس بمبئی ماں کے پاس آ جائے۔ حنا کہنے لگی۔ بہت ممکن ہے اب ممی کی روش کچھ بدل گئی ہو اور وہ سیدھی راہ پر گامزن ہو چکی ہو اگر تو اس نے مچھیروں کی بستی میں جو کمیونٹی سینٹر اور بچوں کے لئے سکول شروع کرنا تھا' وہ کر چکی ہوئی اور اس کی اپنی بے راہروی ختم ہو گئی ہوئی تو پھر میں اس کے پاس ٹھہر جاؤں گی۔ اس کے کاموں میں اس کی دامے درمے 'قدمے' سخنے مدد کروں گی۔ اور اگر حالات ساز گار نہ ہوئے تو پھر پاکستان واپس آ جاؤں گی۔

حنا........!!! چلو باپ کو تو تم اور تمہاری ماں چھوڑ کر آ گئی تھیں۔ بہت ممکن ہے اب وہ تم لوگوں کو منہ نہ لگائے۔ لیکن ماں کے پاس رہنے میں کیا قباحت ہے۔

قباحت حضور یوں ہے کہ اگر میں مکھسائی بن کر رہوں تو تب تو رہ سکتی ہوں ورنہ نہیں۔

کیوں تمہاری ماں تم سے وہاں زبردستی پیشہ کرواتی ہے۔

اس سینس (SENSE) میں نہیں جس میں تم سمجھ رہے ہو۔ وہ خود حالات و واقعات کا مردانہ وار مقابلہ نہ کر سکی۔ شروع شروع میں وہ چھوٹے پیمانے پر نشہ پانی کرنے لگی۔ ہوتے ہوتے نوبت .L.S.D اور میتھوڈین تک جا پہنچی' اور پھر جنسی بے راہ روی یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ہر روز اپنے لئے کہیں سے ایک نیا آدمی تلاش کر کے لاتی۔ رات اپنے اس مہمان کے ساتھ گذارتی اور صبح اسے کچھ پیسے دے کر فارغ کر دیتی۔ اگر کبھی اس کے جاننے والے دو آدمی اکٹھے اس کے پاس آ جاتے تو وہ ایک کو زبردستی میرے کمرے میں بھیج دیتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میرے انکار پر ان دادا لوگوں نے چھرا نکال لیا۔ اور مجھ کو قتل کرنا چاہا۔ حتی کہ میں نے ان کے سامنے سرینڈر (SURRENDER) کر دیا۔ ایسے کئی بدمعاشوں کو تو یہ چسکا ہی پڑ گیا کہ وہ میری ماں کی عدم موجودگی میں

ہمارے فلیٹ پر آ جاتے۔ میرے ساتھ زبردستی بھی کرتے اور جاتے وقت مجھ سے دارو کے لئے دس بیس روپے بھی لے جاتے۔ احمد صاحب یہ میری ماں کے حالات ہیں میں ایسے حالات میں اپنی ماں کے پاس کسی قیمت پر بھی نہیں رہنا چاہتی۔

اچھا تم جا کر والد سے ملنے کی کوشش کرو۔ اب وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اس وقت اسے اپنی اولاد بہت یاد آتی ہے۔ مجھے یقین ہے اگر وہ زندہ ہوئے تو تمہیں اپنی چھاتی سے لگا لیں گے۔

احمد یہ ایک رسک (RISK) ہے۔

حنا رسک کے بغیر تو کچھ نہیں ملتا۔

مجھے ابا جان کا صحیح پتہ بھی نہیں معلوم۔

اس کے لئے ایک دفعہ تو تمہیں اپنی امی کے پاس جانا ہو گا۔ وہاں جا کر زیادہ قیام نہ کرنا تاکہ وہ تمہیں اپنی بداخلاقیوں میں ملوث نہ کر سکے۔

ہاں ایسا ہی کروں گی۔ ہاں تم یہ بتاؤ کہ کب تک تم ڈھاکا پہنچ جاؤ گے۔

کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو میں دو ماہ کی چھٹی پر ہوں۔ ابھی چھٹی کے صرف بیس ہی دن گذرے ہیں۔ چھٹی کے خاتمے پر لاہور اپنی یونٹ میں رپورٹ کروں گا۔ وہ دو تین دن میں مجھے اوجڑی کیمپ راولپنڈی بھیج دیں گے۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوئی تو یہاں سے جانے میں تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔ یہ ایک ماہ مزید چھٹی سمجھئے۔ آپ سے خوب گپ شپ رہے گی۔ دن آپ کے ساتھ گزاروں گا۔ شام کو واپس اوجڑی کیمپ چلا جایا کروں گا۔

میرا خیال ہے کراچی میں بھی اسی گاڑی سے کیوں نہ جاؤں۔ جس سے آپ لوگ جائیں گے۔

کیوں اس قدر زحمت اٹھاتی ہو۔ تم ہوائی جہاز سے چلی جانا۔ میں وہاں پہنچ کر تاج محل میں تم سے ملنے آ جایا کروں گا۔

کراچی کتنے دن آپ کو رہنا ہو گا۔

بحری جہاز سے جانا ہے۔ خیال ہے مہینہ ' دس دن تو رہیں گے۔

نہیں میں تمہارے ساتھ اسی گاڑی میں کراچی آؤں گی۔ دو دن کا سفر بڑا مزے سے کٹے گا۔

جیسے تمہاری مرضی۔

اچھا تم ایسا کرو۔ مجھے دو ڈاک کے پتے ایک گھر کا اور ایک ڈھاکے اپنی یونٹ کا لکھا دو۔ تاکہ کسی وقت اگر تمہارا پتہ کرنا پڑ جائے تو کوئی دقت نہ ہو۔

ٹھیک ہے۔ لکھا دوں گا۔

احمد تم میرا ایک اور کام کرو۔ میرے ساتھ بینک چلو۔ میں اپنے موجودہ اکاؤنٹ کو جائینٹ (JOINT) کروانا چاہتی ہوں۔ کہ اگر کبھی مجھے انڈیا جاکر رقم کی ضرورت پڑ جائے۔ تو تم بینک سے نکلوا کر مجھے بھیج سکو۔

میں بھی تو تمہارے جانے پر یہاں سے ڈھاکا چلا جاؤں گا۔

ارے بدھو میں ان کو ہدایات دے دوں گی کہ یہ اکاؤنٹ ہم دونو میں سے اگر کوئی ایک کسی دوسرے سٹیشن پر تبدیل کروانا چاہے تو اس کی تعمیل کی جائے۔

لاکرز کا کیا بنے گا۔

وہ جیولری یہاں ہی پڑی رہے۔ البتہ اسے ہم دونو میں سے جو بھی چاہے گا یہاں سے نکال سکتا ہے۔

ٹھیک ہے۔

وہ دونو تیار ہو کر بینک چلے گئے اس پانچ لاکھ روپے کا حنا نے احمد کے اور اپنے نام کا ایک الگ اکاؤنٹ کھولا۔ اس کی چیک بک احمد کو لے کر دے دی۔ دوسرا بڑا اکاؤنٹ بھی اسی بینک میں تھا وہ درخواست لکھ کر حنا نے اسے جائنٹ کروا دیا۔ اور احمد کو بھی اسے اپریٹ کرنے کے لئے ایک الگ چیک بک لے دی۔ یہاں سے فارغ ہو کر حنا احمد کو راولپنڈی صدر بازار میں لے گئی۔ وہاں سے اس نے احمد کے منع کرنے کے باوجود احمد کی بیوی۔ اس کی بچیوں اور خود اس کے لئے نہایت قیمتی کپڑوں کے تین تین جوڑے خریدے اور مزید احمد کو کچھ سامان لے کر دیا۔ اور پھر وہ واپس اپنی کوٹھی پر آ گئے۔ بابا محمد شفیع ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ حنا نے کار پورچ میں کھڑی کی احمد نے بیک سیٹ سے سامان اٹھا لیا اور پھر حنا نے گاڑی کو لاک کر دیا۔ وہ دونو اندر اپنے کمرے میں آ

گئے۔ کپڑے بدلے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اور پھر بابا محمد شفیع سے کہا۔

بابا کھانا لگا دو۔

بہت اچھا سرکار۔

تھوڑی دیر میں بابا محمد شفیع نے کھانا لا کر میز پر لگا دیا۔ اور ان دونو نے بڑی دلجمعی اور رغبت سے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ظہر کی اذان ہوئی اور ان دونوں نے حسب سابق اٹھ کر نماز کی تیاری کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب حنا' احمد کے ساتھ کہیں بھی رہتی تو وہ باقاعدگی سے پانچوں نمازیں ادا کرتی۔ وہ چلا جاتا تو حنا کی نمازوں کا تسلسل بھی منقطع ہو جاتا۔

اسی رات حنا احمد کو ملتان جانے والی گاڑی پر بٹھا کر آئی۔ احمد کے پاس ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جس میں اس کا اپنا استعمال کا سامان بھی مشکل سے آتا تھا۔ حنا نے اس کے بیوی بچوں کے لئے جو کپڑے خریدے تھے ان کے لئے حنا نے اپنا نیا سوٹ کیس احمد کو دیا احمد کی گاڑی رات کے دس بجے چلتی تھی۔ حنا آخری منٹ تک احمد کے ساتھ اس کے ڈبے کے باہر کھڑی باتیں کرتی رہی۔ وہ سوچنے لگی۔ احمد ٹھیک ہی تو کہتا ہے اگر ہماری زندگی ایک ہزار سال بھی ہو تو محبت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں احمد کی پیاری' پیاری' میٹھی میٹھی باتیں ہی ختم نہ ہوں گی۔

گاڑی نے وسل دی۔ ریلوے سٹیشن پر موجود آدمیوں میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ آج حنا سے اس کا احمد ہی جدا نہ ہو رہا تھا بلکہ کتنے احمد اور حنا جیسی کتنی محبوبائیں اپنے پیاروں سے بچھڑ رہی تھیں۔ گاڑی نے آخری وسل دی اور ایک ہچکولے کے ساتھ آگے کو رینگنے لگ گئی۔ احمد نے دیکھا حنا اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ حنا اپنی جگہ پر کھڑی اسے دیو کرتی رہی۔ اور آخر کار گاڑی سیاہ رات کے دھندلکوں میں کھو گئی۔ اور اس کے ساتھ احمد اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بیٹھتے ہی اس نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ سیکنڈ کلاس کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ جس میں ایک ہی خاندان کے چار افراد تھے۔ جن میں تین خواتین تھیں اور چوتھا ایک ادھیڑ عمر کا بڑی بڑی مونچھوں والا مرد تھا۔ جو کوئی ریٹائرڈ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ سب

کے سب اپنی ایک بیمار بیٹی کو سالمی سینی ٹوریم سے اپنے گھر لے کر جا رہے تھے۔ وہ بیمار خاتون پچیس تیس سال کی جواں سال خاتون تھی جو ٹی بی کی آخری سٹیج کی مریضہ تھی۔ غالباً سینی ٹوریم والوں نے اسے لاعلاج کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ اسے اپنے گھر لے کر جا رہے تھے۔ وہ خاتون مستقل طور پر بے ہوش تھی۔ ایک بوڑھی سی خاتون جو غالباً اس مریضہ کی والدہ تھی اس کا سر اپنے گود میں رکھ کر روئے جا رہی تھی۔ میری سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر ایک سترہ اٹھارہ سال کی بہت ہی خوبصورت لڑکی پرانی وضع کا سفید برقعہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ اوپر والی سیٹ پر وہ بزرگ اپنا کلاہ اور پستول اتار کر آرام سے سو گئے۔ وہ جلد ہی بڑے خوفناک خراٹے لینے لگ گئے۔ خراٹوں کی آواز سن کر اس مہ جبیں نے اپنے منہ سے برقعہ اٹھا دیا ور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر میری طرف بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے دیکھنے لگ گئی۔

میرا خیال ہے وہ نا تجربہ کار لڑکی تھی۔ ورنہ کوئی چالاک لڑکی ہوتی تو پہلے ہلکا سا برقعہ اٹھاتی۔ چوری نظر سے دیکھتی۔ ہلکا سا مسکراتی پھر میری آتش شوق کو بھڑکانے کے لئے گھونگھٹ نکال کر میری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتی۔ لیکن اسے شاید ان باتوں کا پتہ بھی نہ تھا۔ چونکہ اس نے مجھے زیادہ تختہ مشق نہیں بنایا اور کمال مہربانی سے مجھے اپنے حسن کی ضیاپاشیوں سے متمتع ہونے کا موقعہ فراہم کیا۔ وہ چونکہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ اس لئے میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے دیکھ کر مسکرا اٹھتی۔ شاید اسے میری بیوقوفی پر ہنسی آ رہی تھی۔

گاڑی پنڈی سے ٹھیک دس بجے چلی تھی۔ بارہ بجے کے لگ بھگ اس لڑکی کے بغیر باقی سب سو گئے تھے البتہ مجھے آتش شوق نے سونے نہ دیا۔ میں بھی جاگتا رہا۔ میرے پاؤں کے ساتھ جو عمودی سیٹ تھی اس پر وہ محترمہ لیٹی ہوئی تھیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے گھر والے سب گہری نیند سو گئے ہیں تو اس نے مجھے چٹکیاں بھر کر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے لائٹ آف کر دی۔ اور اپنی سیٹ سے واپس آتے ہوئے میرے بازو پر بڑے زور کی چٹکی بھری۔ وہ میری سیٹ پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے اسے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ مجھے ہلکا سا دوہتڑ مار کر اور روٹھ کر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی بوڑھی ماں نے اٹھ

کر پھر بتی جلا دی۔ اور اس کو سرزنش کے انداز میں کہا۔

ارے کڑیئے یہ بتی تم نے بجھائی تھی۔

ہاں ماں تمہیں تو پتہ ہے مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی۔

دیکھتی نہیں تیری بہن کی کیا حالت ہے۔ تمہیں اپنے سکھ چین کی پڑی ہوئی ہے۔

اماں۔ مرنے والوں کے ساتھ تو کبھی کوئی نہیں مرا۔

مرنے جو گئے۔۔۔!! شالا مریں توں۔ میری بچی انشاء اللہ گھر جا کر ٹھیک ہو جائیگی۔ اس خاتون کا اپنی بیمار بیٹی کی طرف اشارہ تھا۔

میں دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹا ہوا تھا۔ بڑھیا نے سمجھا میں سو رہا ہوں وہ اس سے کہنے لگی۔

ارے کم بخت تو نے بتی بجھا دی ہے۔ یہ آدمی اگر تجھے پکڑ کر اپنے ساتھ سلا لیتا تو پھر تو کیا کرتی۔

سو جاتی۔ اس نے نہایت بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

تو جا اس پردیسی کے ساتھ چلی جا۔ ہمیں ایسی چھنال لڑکی کی ضرورت نہیں۔

اماں تو تو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ پردیسی میرا کیا لگتا ہے کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔

پہلے سب اسی طرح کہتی ہیں۔ بڑھیا نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔

اماں۔ خدا کے لئے ذرا آہستہ بات کر اگر بابا جاگ گیا تو جان سے مار دے گا۔

تمہارا بابا کچھ ہوتا تو رونا کس بات کا تھا کم بخت افیوں کا گھولوا پی کر مزے سے خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے کسمساتے ہوئے پہلو بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ اور گھڑی پر وقت دیکھا رات کا ایک بج رہا تھا۔ ایک نہایت ہی ویران سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ شاید سامنے سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سنسان اور ویران سے جنکشن پر

ان دونو گاڑیوں کا کراس ہوا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑی ایک لمبی وسل دے کر ایک دھچکے کے ساتھ چل دی۔ بڑھیا پھر اپنی بیمار بیٹی کے پاؤں کی طرف لیٹ گئی تھی۔ شاید اسے بھی روشنی اچھی نہ لگتی تھی چونکہ اس نے بھی اپنے دوپٹے کے ایک پلو سے اپنے منہ کو ڈھانپ لیا۔ اس نوخیز مہ جبین کو نہ جانے کیوں نیند نہ آ رہی تھی۔ اس میں بلا کا کرب تھا۔ یہی دیوانگی یہی کرب چناب کی خوفناک لہروں کو خاطر میں نہ لا کر اس میں کود پڑا تھا۔

لیکن یہ آج کی سوہنی سے تو دو منٹ کا فاصلہ بھی طے نہ کیا جا سکتا تھا۔ آج کی سوہنی مصلحت اندیش ہے۔ اس لئے اس کے چاروں طرف مہنیوال پھرتے ہیں اور یہ ان کو انگلیوں پر نچاتی رہتی ہے۔ جب سوہنی کو یقین ہو گیا کہ بڑھیا سو گئی ہے تو وہ اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ڈر کے مارے مجھے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ چپکے سے میرے قریب آ کر مجھ سے کہنے لگی۔

تم کیسے مرد ہو جسے مجھ جیسی جوان اور خوبصورت عورت بھی اچھی نہیں لگتی۔

اچھی لگتی ہے۔ لیکن اپنی عزت اس سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔

مجھے تو دیکھنے کے لئے لوگ ترستے ہیں۔

میں بھی ترستا رہوں گا اور زندگی بھر تمہیں بھول نہ سکوں گا۔ لیکن موقع کی نزاکت کو بھی تو سمجھو۔

اگر یہ بات ہے تو چلو ٹرین سے اتر جاتے ہیں۔

پکڑے جائیں گے، بہت بے عزتی ہو گی۔

پکڑے جانے سے پہلے جو چند لمحے آزادی کے میسر آئیں گے اور جو تمہاری قربت میں کٹیں گے۔ انہی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کے بعد جو ہو گا سو ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ اس مہ جبین نے بڑے تیقن آمیز لہجے میں کہا۔

محترمہ۔ کسی اجاڑ سٹیشن پر اگر اتر بھی گئے تو وہاں ہی کوئی مقامی بدمعاش مجھے دو چانٹے لگا کر تمہیں مجھ سے چھین لے گا۔ اور میں کسی جیل کی کوٹھڑی میں پڑا سڑتا رہوں گا۔

تمہارے اس مرمریں جسم کو چھونے کی میں اتنی زیادہ قیمت تو ادا نہیں کر سکتا۔ کوئی اور سبیل نکالو۔

سبیلوں پر نامرد بھروسہ کرتے ہیں۔ عشق کے چڑھے ہوئے دریا میں کودنے والے مصلحت اندیش نہیں ہوتے۔ شکر ہے میں نے تم جیسے آدمی پر بھروسہ کر کے چناب کی پر خطر لہروں میں چھلانگ نہیں لگا دی۔

محترمہ یہ بڑا گھٹیا طریقہ ہے۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کے ساتھ چناب کی پر خطر لہروں میں چھلانگ نہیں لگا سکتا۔

اچھا تو تم چوری کھانے والے مجنوں ہو۔

بس ایسا ہی سمجھ لیجئے۔ مجھے معاف فرمایئے۔

یکایک بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ سوہنی میری سیٹ پر مجھ سے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے قریب آ کر ایک ہاتھ سے اس لڑکی کو چٹیا سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جوتی پکڑ لی۔ اور اس پر تابڑ توڑ جوتیوں کی بارش کر دی۔ وہ چلائے جا رہی تھی لیکن اس کی ماں اس کی پٹائی میں مصروف تھی۔ بڈھا نشے میں ایسا مدہوش تھا کہ اسے اس واقعہ کی قطعاً کوئی خبر نہ ہوئی۔ اس کی بڑی بہن بدستور بے ہوش پڑی ہوئی تھی وہ لڑکی روتی چلاتی رہی لیکن بڑھیا نے اسے نہ چھوڑا اور اس کی پٹائی جاری رکھی۔ اس کے پھول سے رخساروں پر جوتوں کی متواتر بارش سے نشان پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس سوہنی کی کچھ طبیعت بحال ہوئی تو وہ ماں کی آنکھ بچا کر مجھے دیکھ کر دانت پیستے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کرتی۔ ایک دو دفعہ تو دیہاتی مردوں کی طرح اپنے منہ پر ہاتھ بھی پھیرا۔ جیسے وہ مجھے کہہ رہی ہو۔

"بچو۔ تیری وجہ سے میری یہ پٹائی ہوئی ہے تجھ سے بھی میں نمٹ لوں گی۔"

میں شرما کر آنکھیں جھکا لیتا۔ اس مہ جبین کا غصہ کچھ کم نہ ہو رہا تھا۔ اس کی ماں بھی غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ وہ اب تک اپنی بیٹی کو بہت ہی خوفناک نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس بڑھیا نے اچانک میری طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

بیٹے میری یہ چھوہری بڑی سادہ ہے۔ کہیں تم اسے بہکا کر لے مت جانا۔

اں۔ میں نے اس چھوہری کو کیا کرنا ہے۔ گھر میں میری اپنی بیوی ہے۔۔

بے شک ہو گی تمہاری بیوی لیکن یہ مرد لوگ ہر وقت نئی سے نئی عورت کے طلب گار رہتے ہیں۔

نہیں اماں یہ بات غلط ہے۔

غلط ہے۔ اس بڑھیا نے بڑے ہی پرجوش انداز میں اپنے تمام حواس اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔ بھیا یہ سو فیصد ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہو میرے اس بڈھے خصم کو ساٹھ سال اس کی عمر ہے منہ میں ایک دانت بھی نہیں لیکن اگر اب بھی کوئی بے کانی عورت اس کے ہتھے چڑھ جائے تو یہ موا اپنچی نہیں چھوڑتا۔

میری تو چھوہری کی شکل و صورت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ جوان بھی ہے میرا خیال ہے کہ اسے آج تک کسی نے چھوا بھی نہیں لڑکی اگر مردوں کے ہاتھ مفت میں آ جائے تو کہاں چھوڑتے ہیں۔۔

بی بی آپ اتنی دیر سے دیکھ رہی ہیں میری طرف سے آپ کی بیٹی کی طرف اگر کوئی پیش رفت ہوئی ہو یا میں نے اسے بہکایا ہو تو تب آپ مجھ کو کہیں۔ میں تو چپ چاپ اپنی سیٹ پر لیٹا ہوا ہوں۔

ہاں بھیا تم بھی ایک بگلے بھگت ہو۔ اس چھوری کو نہ جانے ایسی کون سی بات تم میں نظر آئی ہے۔ کہ جب تم پنڈی سے اس گاڑی میں بیٹھے ہو یہ اس وقت سے یہ ایک عجیب انجانی سی آگ میں مسلسل جلتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا یہ کرب یہ اضطراب تو میں بھی اچھی طرح سے محسوس کرتی ہوں۔

بی بی اگر آپ نے پنڈی مجھ سے کہہ دیا ہوتا تو میں کسی دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔

بھیا مجھے کیا خبر تھی۔ یہ مالزادی یہ گل کھلائے گی۔

میں اب کسی دوسرے ڈبے میں چلا جاتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو اس قدر اذیت پہنچی ہے۔

آپ جائیں گے کہاں۔

میں نے بہاولپور جانا ہے۔

ہاں یہ سفر تو بہت لمبا ہے۔ آپ ملتان تک تو اسی گاڑی سے جائیں گے۔

صبح ہو جائے راستے میں کوئی بڑا سٹیشن آیا تو میں گاڑی چھوڑ دوں گا۔ تا کہ آپ لوگ نکل جائیں۔ میں آرام کر کے دوسری گاڑی پکڑ لوں گا۔

میری وجہ سے آپ یہ گاڑی نہ چھوڑیں۔ اس مہ جبین نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

اس لائن پر میاں والی ایک بڑا شہر تھا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں میاں والی جا کر اتر جاؤں گا۔ میں بار بار باہر جھانک کر دیکھنے لگ گیا۔ اب چاروں طرف سے اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ سامنے میاں والی سٹیشن کی لائیٹس نظر آ رہی تھیں۔ اس لڑکی نے بھی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ شاید اسے بھی لائیٹس نظر آئیں۔ کہ وہ ماں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر مجھ سے پوچھنے لگی۔

اجنبی تم یہاں اترو گے۔

جی ہاں۔

تم تو کہہ رہے تھے کہ میں نے بہاولپور جانا ہے۔

جانا ہے۔ لیکن اب کسی دوسری گاڑی سے جاؤں گا۔

کیوں۔

اس سے جانے میں کیا قباحت ہے۔

کیوں اپنے باپ سے مجھے گولی کا نشانہ بنواتی ہو۔

میرا باپ بھی تو میری اس ماں کو ایک سفر کے دوران اسی طرح بھگا کر لایا تھا۔ وہ لڑکی گویا میرے ساتھ بھاگ جانے کے لئے اب ذہنی طور پر تیار بیٹھی تھی۔

بڑھیا نے یہ سنا تو سیخ پا ہو گئی اور پھر جوتی اتار کر اس مہ جبیں کی پٹائی کرنے لگ گئی۔ گاڑی بیرونی سگنل کے قریب جا کر رک گئی۔ ماں بیٹی کی چیخ و پکار سے بڈھا بھی اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے پوچھنے لگا۔

کون سا سٹیشن ہے۔

پتہ نہیں۔ گاڑی سٹیشن سے دور کھڑی ہو گئی ہے۔ بڑھیا نے کہا۔

تم لوگوں نے کیوں شور و غوغا مچا رکھا ہے۔ بڈھے نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

بس تم مونچھوں کو تاؤ دے کر پستول گلے میں لٹکا کر پھرتے رہو۔ دنیا جہاں کی کوئی خبر نہ رکھنا۔

کیوں کیا ہو گیا ہے

تمہاری یہ لاڈلی ابھی پردیسی سے یہ کہہ رہی تھی کہ میرا باپ میری اس ماں کو ایک سفر کے دوران اغوا کر کے لے آیا تھا۔

پردیسی سے یہ بات کرنے کی کیا تک ہے۔

یہ تو مرنے جوگی سارے رستے اس کی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی ہے۔ نگوڑی نے تو ایک دفعہ بتی بھی گل کر دی تھی۔

آخر تو کس مرض کی دوا ہے۔ چھوری کو روکا ہوتا۔

لاکھ روکا لیکن یہ کہنے لگی اگر تم لوگ مجھے پر ناجائز پابندی لگاؤ گے تو میں پردیسی کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔

اگر اس کا دل ہے تو جانے دو اسے۔ لڑکا اچھی شکل و صورت والا ہے۔ کوئی افسر معلوم ہوتا ہے۔ تیری چھوری مزے کرے گی۔

غضب خدا کا پردیسی کے ساتھ چلی جائے۔ اور ہم آنکھیں بند کے بیٹھے رہیں۔

بی بی رانی تو بھی تو میرے ساتھ ایسے ہی آئی تھی۔ میں کوئی تیرے باپ کے گھر بارات لے کر گیا تھا۔

بڑھیا نے شور مچانا شروع کر دیا باپ بیٹی دونو کنجر ہیں۔ کنجروں کی اولاد ہیں۔ دیکھو لوگو۔ باپ بیٹی کو اپنے یار کے ساتھ بھاگنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ بڈھے نے ایک دو دفعہ جھڑک کر چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ عجیب و غریب باتیں جو عام آدمی کی فہم سے بالا تر تھیں کیئے جا رہی تھی۔ جب وہ بڈھے کے کہنے پر بھی چپ نہ ہوئی تو بڈھا آرام سے اپنی سیٹ سے نیچے اتر آیا۔ اور اس نے بڑھیا کو چٹیا سے پکڑ کر سیٹ سے نیچے پٹخ دیا اور پھر اوپر سے اسے لاتوں اور مکوں سے مارنے لگ گیا۔ بڑھیا مار کھاتی رہی

لیکن اس کی زبان کو چپ نہ آئی۔ وہ باپ اور بیٹی دونو کو بدستور گالیاں دے رہی تھی۔
احمد نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر بڈھے کی منت سماجت کی تو تب بڑھیا کی جاں بخشی ہوئی۔ بڈھا جس کا نام شریف خان تھا احمد کے ساتھ اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اپنے سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹھیک کیا۔ جیب سے رومال نکال کر اپنا منہ پونچھا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں رکھا۔ پھر ڈبی احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

لو بیٹا سگریٹ پیو۔

شکریہ۔ جناب میں تو سگریٹ نہیں پیتا۔

آپ پنڈی میں کیا کام کرتے ہیں۔؟

میں وہاں اپنے ایک دوست کو ملنے گیا تھا۔

وہی جو آپ کو ریل پر سوار کرنے آیا تھا۔

جی ہاں۔

آپ کیا کام کرتے ہیں۔

فوج میں ملازمت کرتا ہوں۔

آفیسر ہیں۔

چھوٹا سا۔

آپ مجھے بتایئے میری بیوی اور میری بیٹی آپس میں کیوں لڑی ہیں.....؟

آپ کی بیگم صاحبہ بڑی شکی مزاج ہیں۔ آپ کی بیٹی نے میرے ساتھ رسمی سی چند باتیں کیں تو یہ اس بے چاری کو جوتوں سے مارنے لگ گئی۔

کوئی باتیں عشق و محبت کی تھیں۔

بزرگوارم میں فوجی افسر ہوں۔ ذمہ دار آدمی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ یوں راہ چلتے لوگوں کی لڑکیوں سے عشق لڑاتا پھرتا ہوں۔

اس چھوری نے آپ سے کیا باتیں کیں۔

بے چاری سادہ لڑکی ہے۔ چالاک نہیں ہے غیروں کے ساتھ بھاگنے والی لڑکیاں اس طرح نہیں کرتیں۔ ان کی نقل و حرکت اور کارکردگی سے تو یوں آسانی سے

ان کے سرپرست آگاہی نہیں حاصل کر سکتے۔ ان کو تو تب پتہ چلتا ہے۔ جب لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ گھربار، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ یہ لڑکی تو بے حد سادہ ہے۔ اسے تو دنیا کی ہوا ہی نہیں لگی۔

ارے بھئی۔ اس کی ماں بھی جب میرے ساتھ اسی طرح کے ایک سفر کے دوران اپنی مرضی سے چلی آئی تھی تو اسی طرح سادہ لوح تھی۔ لیکن اب دیکھا تم نے۔ چھوکری بے چاری کو تم سے بات بھی نہیں کرنے دیتی۔ وہ تم سے بات چیت کرے گی تو تم اس سے کیا چھین لو گے۔ بے چاری ناتجربہ کار لڑکی ہے ابھی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔ تم جوان آدمی ہو۔ وجیہہ ہو۔ اسے اچھے لگے ہو۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لئے تم سے دو باتیں کر لیں تو اس بھیھے کٹن کو آگ لگ گئی۔ بھیا ہم لوگوں کو ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہئے۔ میں بڈھے کی ان باتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ سوچنے لگا۔ بڑے میاں کتنا سٹریٹ فارورڈ ہے۔ اسے یہ باتیں کہتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ یکایک وہ بڈھا بڑا سنجیدہ ہو گیا مجھ سے کہنے لگا۔

صاحب بہادر۔ اگر آپ کو یہ لڑکی اچھی لگتی ہے تو آپ اس کے ساتھ شادی کر لیں۔

نہیں خان صاحب بہت شکریہ آپ کا۔ لڑکی ویسے خوبصورت ہے۔ بلکہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ جوان ہے۔ اور ہر مرد کی طرح مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ لیکن ہم لوگوں پر مذہب کی سوسائٹی کی اور دیہاتی رسم و رواج کی کچھ پابندیاں ہیں۔ ان پابندیوں کی اپنی جگہ پر افادیت بھی ہے۔ میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میں اپنی عیاشی کے لئے ڈھیر سارے آدمیوں کی دل آزاری نہیں کر سکتا۔ بہت شکریہ آپ کا۔

گاڑی نہ جانے اتنی دیر بیرونی سگنل پر کوئی کھڑی رہی۔ اب گاڑی نے دو لمبی لمبی وسلیں بجائیں اور آہستہ آہستہ آگے کو رینگنے لگ گئی۔ میانوالی کا سٹیشن بالکل سامنے تھا۔ میں اپنا سامان سمیٹنے لگا تو وہ لڑکی مجھ سے کہنے لگی۔

آپ ملتان تک تو ہمارے ساتھ سفر کریں۔

پھر ملتان کے بعد کیا ہو گا۔ آپ دوسری گاڑی سے اپنے گھر چلی جائیں گی۔ میں کہاں جاؤں گا۔

آپ پھر سیدھا بہاولپور چلے جائیں۔

میرا گھر تو میانوالی میں ہے۔ میں بہاولپور جا کر کیا کروں گا۔

آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر آئیں۔ اور چند روز ہمارے ساتھ رہیں۔

تمہاری ماں تمہیں بھی اور مجھے بھی جوتیوں سے پیٹے گی۔

تو پھر میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر آ جاتی ہوں۔ کچھ دن رہ کر واپس آ جاؤں گی۔ کیوں بابا ٹھیک ہے نا۔ اس نے باپ کی منظوری حاصل کرنی چاہی۔

بیٹی بالکل ٹھیک ہے جس طرح تم چاہو کرو۔

میرے اچھا بابا اور اس مہ جبین نے اپنے دونو بازو اپنے باپ کی گردن مین ڈال دیئے۔

بڑھیا اپنی سیٹ پُر بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ یہ بڈھا تو کنجر ہے کنجر۔ اس کا اگر یہی سلوک اور رویہ رہا تو ایک دن یہ چھنال لونڈیا چکلے جا بیٹھے گی۔ پھر اس کی اکڑ خانی کہاں جائے گی۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تو اسے ہی جواز بنا کر ایسی بد اخلاقیوں کا اعادہ تو نہ کیا جائے۔

گاڑی میانوالی کے پلیٹ فارم پر رکی۔ تو مجھے دیکھ کر میرے جاننے والے دو قلی لپک کر ڈبے کے اندر آ گئے۔ انہوں نے میرا سامان اٹھا لیا۔ وہ منچلی لڑکی ان کے آگے ہو گئی ان کو سامان نہ اتارنے دیتی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے اس بڑھیا کا وہ میری مدد کو آئی۔ اس نے اٹھ کر اس لڑکی کو بازو سے پکڑا اور پھر گھسیٹ کر اپنی سیٹ پر لا بٹھایا۔ میں نے بڈھے سے مصافحہ کیا۔ بڑھیا نے مجھے خدا حافظ کہا۔ اور لڑکی کہنے لگی۔

تم جھوٹے آدمی ہو۔ اب میں کبھی بھی تم سے بات نہ کروں گی۔ تم جب بھی کبھی بہاول پور آؤ گے اور راستے میں میرے ماں باپ کو ملنے کے لئے رکو گے تو میں تم سے ہرگز نہ ملوں گی۔ مجھے جھوٹ بولنے والے آدمی اچھے نہیں لگتے۔ گاڑی نے وسل دے دی اور میں ڈبے سے نیچے اتر آیا وہ لڑکی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی اور جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی وہ وہاں ہی کھڑی مجھے ویو (WAVE) کرتی رہی۔ ٹرین ایک سیاہ نقطہ بن کر دور افق میں غائب ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ میں شکستہ دلی کے عالم

میں ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اسٹیشن سے باہر ہوٹل میں آ گیاجہاں وہ قلی میرا سامان لے کر بیٹھے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ہوٹل میں منہ ہاتھ دھویا' ناشتہ کیا' ان قلیوں کو اپنے ساتھ چائے پلائی۔ اور پھر وہ مجھے میرے گاؤں جانے والی لاری پر بٹھا کر اپنی مزدوری اور انعام لے کر سٹیشن کی طرف واپس چلے گئے۔

میں اپنے گاؤں جانے والی لاری میں بیٹھا تھا۔ ملتان جانے والی گاڑی بہت دور جا چکی تھی رہ رہ کر وہ مہ جبین مجھے یاد آ رہی تھی۔

جس میں بلا کی دیوانگی اور کرب تھا۔ نہ جانے بے چاری کو راستے میں پھر وہ بڑھیا زدو کوب کرے۔ باپ کی موجودگی میں ماں اُسے نہیں مارے گی۔ میں اپنی زندگی کے متعلق سوچنے لگ گیا۔ عجیب آدمی ہوں جہاں بھی جاتا ہوں اس طرح کے واقعات ایک مجھ ہی کو کیوں پیش آتے ہیں۔ حنا کو پنڈی سٹیشن پر چھوڑا ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اور ایک بلا اپنے سر ڈال لی۔ حنا سے اگر میں ہمدردی نہ جتاتا تو وہ بھی کچھ عرصے کے بعد اس غیر متوقع اور حادثاتی ملاقات کو بھول جاتی۔ اب یہ لڑکی بھی مجھے مدتوں یاد رکھے گی۔ ہر وقت میانوالی کا ریلوے سٹیشن اس کی نظروں کے سامنے رہا کرے گا۔ اگر میں چاہتا تو اس کے باپ نے تو کہہ دیا تھا کہ اگر یہ چھوہری تمہیں پسند کرتی ہے اور تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو بیشک لے جاؤ۔ کیسی فیئر گیم (FAIR GAME) تھی۔ شاید بڈھے کو اپنا وقت یاد آ جاتا ہو گا کہ اس نے اس چھوہری کی ماں کو کیسے ایک سفر کے دوران میں چکمہ دے کر اڑایا تھا۔ اس وقت بڈھے کی باز پرس کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ میری سرکوبی کرنے کے لئے تو گھر میں سب موجود تھے۔ میں اس سلسلے میں بڑا ہی بزدل آدمی ہوں۔ اس طرح کے معاملوں میں گھر والوں کو فیس کرنے کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں۔

اور اگر کوئی کچھ بھی نہ کہے تو پھر بھی میری بچیوں پر ان کا کس قدر منفی اثر مرتب ہو گا۔ جیسے اس مہ جبیں پر ہوا۔ اسے پتہ تھا کہ میری ماں میرے باپ کے ساتھ اپنی جوانی کے دنوں میں بھاگ کر آ گئی تھی۔ اور وہ لڑکی شاید اسے کوئی اتنی زیادہ معیوب بات نہ سمجھتی ہو۔ جب ہی تو ماں باپ کی موجودگی میں وہ مجھ سے بڑی صاف صاف باتیں کرتی تھی۔ یہ جذبہ اسے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ ہم جو کچھ صحیح یا غلط

اپنی جوانی کے دنوں میں بوتے ہیں۔ اپنے گناہوں کی بوئی ہوئی وہی فصلیں ہم اپنے بڑھاپے میں کاٹتے ہیں۔ لڑکی کا کیا قصور تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے اردگرد اس طرح کے کردار والے لوگوں کو دیکھا۔ بڑی ہوئی تو بڑی بوڑھیوں سے اپنی ماں کے کچے چھٹے سنے۔ وہی ابدی نقوش اس کے ذہن پر مرتسم ہو کر رہ گئے۔ وہ کچھ بڑی ہوئی تو تب سے انہی جذبوں کے متعلق سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ اپنی ماں اور باپ کا آخری اور حتمی ملاپ ایک ریل کے سفر میں ہوا تھا۔ ریل کا سفر ایک آخری سنگ میل بن کر اس کے تحت الشعور میں جاگزیں تھا۔ ریل کے ہر سفر میں اس کا یہ کپلیکس عود کر آتا تھا۔ لیکن اسے اپنے اظہار کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ آج اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی تعبیر دیکھی۔ وہ اس حسین جذبے کو گرفت میں لانے کے لئے اندھیروں میں بھی چھلانگ لگا سکتی تھی۔ لیکن اسے اپنے جذبات جب کوئی واضح شکل اختیار کرتے ہوئے نظر نہ آئے تو وہ مایوس ہو گئی۔ وہ مایوسی کی حالت میں ان تاریکیوں میں نہ کود سکتی تھی۔

ڈرائیور گاڑی میں بیٹھ گیا اور جو لوگ باہر کھڑے تھے۔ وہ جلدی جلدی اپنی سیٹوں پر قبضہ جمانے کے لئے لاری کے اندر چلے گئے۔ میں پہلے سے ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اپنے خیالات کے گرداب میں ڈوبا قسمت کے ہاتھوں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ کوئی میرے اندر اٹھنے والے طوفانوں سے آگاہ نہ تھا۔

میں دس بجے کے قریب گاؤں پہنچ گیا۔ میرے بچوں نے میرے بکس کھول کر اچھی طرح تلاشی لی۔ اور خوبصورت کپڑے دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ تھوڑی دیر تک ان کی تقسیم پر ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے۔ میری بیوی نے بچوں کی بندر بانٹ کا جھگڑا سنا تو وہ بھی ادھر متوجہ ہو گئی۔ اور ان کے پاس آگئی۔ اس نے اس نئے اٹیچی کیس میں جتنے کپڑے بھی تھے۔ سب باہر نکال کر دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔

یہ کس کے کپڑے ہیں۔ میری بیوی نے حیرت اور استعجاب کے عالم میں پوچھا۔

اپنے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے لئے لے کر آیا ہوں۔

اتنے قیمتی کپڑے آپ پہلے کبھی نہیں لائے۔

اس دفعہ پیسے اکٹھے مل گئے ہیں۔ آپ لوگوں کے لئے کپڑے خرید لئے ہیں۔

اتنے پیسے آپ نے ان کپڑوں پر کیوں لگائے ہیں....؟ ہم غریب لوگ ہیں ایسے کپڑے ہم کہاں خرید اور پہن سکتے ہیں۔

مجھے یونٹ والوں نے بلایا تھا۔ میرا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا ہے دو ماہ کی چھٹی ملی ہے۔ اس کی ایڈوانس تنخواہ ملی ہے۔ پیسے پاس تھے۔

میں نے کہا کبھی زندگی میں اتنے اچھے کپڑے آپ لوگوں کے لئے نہیں لئے۔ اس دفعہ لے لوں۔ چنانچہ سب کے لئے تین تین جوڑے لے لئے ہیں۔

چلو یہ کپڑے میں بچیوں کے لئے رکھ لوں گی۔ ہماری مائیں اس طرح ایک ایک کپڑا خرید کر تمام عمر اپنے بچیوں کے لئے جہیز کے کپڑے بناتی رہتی ہیں۔ ہم روز مرہ زندگی میں اس طرح کے کپڑے پہن سکتی ہیں۔ یہ کپڑے تو بادشاہوں کے پہننے والے ہیں۔ میری بچیوں نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

اپنی بیوی کے ان حوصلہ افزا ریمارکس پر میں بہت خوش ہوا۔ ہمارے گھر کے ساتھ رہنے والے سب رشتہ داروں کی خواتین وہ کپڑے جو میں لایا تھا۔ خصوصی طور پر دیکھنے کے لئے آئیں۔ سب نے انہیں اچھی طرح سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ان کی بڑی تعریف کی۔ میری بیوی نے وہ کپڑے میری بچیوں کو بہلا پھسلا کر ان کے قبضے سے لے کر اپنے قبضے میں کر لئے۔ اور اس دفعہ اپنی ماں اور بہنوں سے میرے نکھٹو ہونے کی شکایت نہ کی۔

میں نے دوسرے دن حنا کو خط لکھا کہ میں خیریت سے گھر پہنچ گیا ہوں۔ تمہارا کپڑوں کا دیا ہوا تحفہ میری بیوی اور بچیوں نے بے حد پسند کیا۔ میں نے اسے پنڈی سے میانوالی تک کے سفر کی مکمل درد بھری داستان لکھی۔ جلد ہی اس کے خط کا جواب آیا۔ کہ تمہاری قسمت میں اس طرح کی ناکامیاں اور نامرادیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ساری زندگی اس طرح کڑھ کڑھ کر مرتے رہو گے ساتھ دوسروں کو بھی اس اذیت ناک جہنم میں سلگنے کے لئے چھوڑ دو گے۔ مجھے تم جو سزا دے رہے ہو خدا کے واسطے اور کسی کو اس طرح کی کڑی سزا نہ دو۔ اور نہ ہی اس طرح کے عبرت ناک اور حسرت ناک انجام

سے دوچار کرو۔ تم یقیناً نارمل آدمی نہیں ہو۔ لیکن تمہاری اس نفسیاتی الجھن کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

بہتر ہو گا کہ لاہور جاتے ہوئے تم اس راستے سے آؤ۔ دو تین دن میرے پاس ٹھہرو۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ میں سارے بندھن توڑ کر جب چاہتی تمہارے گاؤں جا کر تمہارے بیوی بچوں کے پاس رہتی۔ لیکن سب کچھ نہ تمہارے بس میں ہے اور نہ ہی میرے بس میں۔

جب میری چھٹی کے چار دن رہ گئے تو میں گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ میں اپنی بیوی بچوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر گھر سے نکلا۔ ان کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں سات سمندر پار کسی عالمگیر جنگ میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔ میں نے انہیں لاکھ سمجھایا لیکن یہ باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میانوالی سے شام کو سات بجے گاڑی ملی اور صبح سات بجے میں پنڈی پہنچ گیا۔ میں جب حنا کی کوٹھی پر پہنچا تو کوٹھی میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ مجھے شک گزرا کہ شاید حنا سے کوٹھی خالی کروا لی گئی ہے۔ میں احتیاطاً پچھلی طرف بابا محمد شفیع کو دیکھنے چلا گیا۔ وہ کچن کے باہر برآمدے میں ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو میری جان میں جان آئی۔ بابا بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

صاحب آپ کی چھٹی ختم ہو گئی ہے۔

جی بابا۔ ہو گئی ہے۔ دو دن رہتے ہیں جو آپ لوگوں کے پاس گزاروں گا۔

صاحب! بیگم صاحبہ تو کل سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

حنا اب کہاں ہے۔

صاحب جی وہ سوئی ہوئی ہیں۔

کیوں وہ نماز نہیں پڑھتی۔

بس صاحب جی آپ آتے ہیں اور آپ پڑھتے ہیں تو آپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی پڑھ لیتی ہیں۔

بابا بڑی افسوس کی بات ہے۔ اچھا آپ ان کو جگا کر میرا بتائیں۔ کہ وہ آ

گئے ہیں۔

اچھا صاحب جی۔ پھر بابا بیڑی کے ہلکے ہلکے کش لگاتا ہوا کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں حنا گاون پہنے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کچن کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ بابا محمد شفیع اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

حنا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جاتے ہی احمد سے گلے ملی اور اس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔ اس کا اٹیچی کیس اٹھا کر دوسرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کر کوٹھی کی طرف لے کر چل پڑی۔ چلتے چلتے بابا محمد شفیع کو جلدی ہیوی ناشتہ لانے کے لئے کہا۔

بہت اچھا سرکار.......!!

احمد نے جا کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور اتنی دیر میں بابا نے ناشتہ لگا دیا۔ وہ کھانے کی میز پر کافی دیر تک بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس مہ جبیں کو موضوع گفتگو بنائے رکھا۔

احمد تم نے غلطی کی ہے۔ اگر اس کا باپ اتنی خوبصورت لڑکی تمہیں گفٹ کر رہا تھا۔ تو تم نے مان جانا تھا۔

بابا وہ پاگل لڑکی میری ہڈیاں بھی چبا جاتی۔

واقعی پاگل تھی۔

پاگل نہیں تھی۔ لیکن جب سیکس کا موضوع زیر گفتگو ہوتا اور میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوتی تو اس وقت اس کا ذہنی توازن ڈسٹرب ہو جاتا اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی۔

بے چاری جنسی ناآسودگی کی وجہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتی ہو گی۔ اگر کچھ عرصہ وہ اسی حالت میں رہی اور اسی طرح ناآسودہ رہی تو مستقل طور پر ذہنی توازن کھو بیٹھے گی۔ تم نے غلطی کی ہے اسے لے آتے میرے پاس چھوڑ دیتے۔

تم سے اسے کیا آسودگی ملتی۔

جنسی آسودگی تو نہ ملتی لیکن میری کمپنی سے وہ خوش رہتی اور اس کا ذہنی توازن مزید نہ بگڑتا۔ جہاں تک میں اس کی نفسیات کو سمجھ سکی ہوں۔ وہ ماں کے معاندانہ

روئے سے زیادہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا سویا ہوا کمپلیکس جاگ اٹھتا ہے۔ احمد ایسے لوگوں کو دھتکارنا نہیں چاہئے۔ الٹا یہ لوگ ہماری ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔

حنا کتنے لوگوں کو آپ سنبھالیں گی۔ ایسی لڑکیاں اور خواتین سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔

اچھا تم یہ بتاؤ۔ تمہارے گھر میں خیریت تھی۔ تمہاری بیوی بچے ٹھیک تھے۔

سب ٹھیک تھے۔ میرے بیوی بچوں نے تمہارے بھیجے ہوئے کپڑے بے حد پسند کئے۔ میری بچیاں کہتی تھیں۔ ابو ہم نے تو اتنے اچھے کپڑے آج تک نہیں دیکھے۔

شکر ہے انہیں پسند آئے ہیں۔ تم لے جاتے ہوئے گھبراتے ہو ورنہ میں تو ہر دفعہ اس سے بھی اچھے اور زیادہ تعداد میں ان کے لئے بھیجنا چاہتی ہوں۔ تمہارے بچوں کو دے کر مجھے حقیقی خوشی نصیب ہو گی۔ نہ جانے میری یہ تمام دولت کام بھی آئے گی یا نہیں۔ کیا پتہ بدمعاش ہی چھین لیں۔

بھئی حنا۔ مجھے یہ عادت نہ ڈالو۔ میں دوسروں کے سہارے زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے وسائل سے جو بھی روکھا سوکھا ان کو دوں وہ اسے خوشی سے کھالیں جو موٹا جھوٹا کپڑا میں حسب توفیق لا کر انہیں دوں وہ خدا کا شکر کر کے اسے پہن لیں۔ ہمارا گاؤں کا رہن سہن بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اور اسی ماحول میں ہم نے رہنا ہے۔ مرنا جینا ہے۔

اچھا بابا۔ اب تم نصیحتیں مت کرو۔ کہو اب کتنے دن رہو گے۔

آج اور کل ۔ پرسوں روانگی ہو گی۔

وہاں کتنے دن آپ رہیں گے۔

میرا خیال ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن لگیں گے۔

تو ایسا کرتے ہیں پرسوں اپنی گاڑی سے چلے جاتے ہیں۔ جتنے دن بھی تمہیں رہنا پڑا۔ میرے ساتھ فلیٹیز میں قیام کرنا۔

کیا ضرورت ہے۔ دو تین دن کے بعد واپس پنڈی آ جانا ہے۔ میں پنڈی

پہنچتے ہی تمہیں ٹیلی فون کر دوں گا۔

چلو ٹھیک ہے۔

حنا اور احمد دونو اپنی کار میں لاہور آ گئے۔ احمد نے حنا سے کہا۔ میں آج کی رات واپس نہ آ سکوں گا۔ کل سے میں آ جایا کروں گا۔ حنا نے احمد کے کہنے پر اسے اپنی یونٹ کے قریب مین روڈ پر ڈراپ (DROP) کر دیا۔ اور خود واپس فلیٹیز آ گئی۔ احمد نے اسی شام اپنی واپسی کی رپورٹ صوبیدار میجر کو دی۔ اور پھر اللہ یار خان کو دوسرے دن کے لئے یونیفارم وغیرہ تیار کرنے کی ہدایت دی۔ یونیفارم پہلے سے اللہ یار خان نے تیار کر رکھی تھی۔ وہ شام احمد نے اپنے ساتھی سردار صاحبان کے ساتھ میس میں ہی گزاری۔ سویرے وردی پہن کر دفتر جا کر سب ساتھیوں کو ملے۔ ان کے ساتھ گپ شپ کی۔ پھر کیپٹن قریشی صاحب کے پاس تھوڑی دیر کے لئے چلے گئے۔ وہاں ان کے پاس ایک کپ چائے پی۔ قریشی صاحب نے انٹر کام سیٹ پر کمانڈنگ آفیسر صاحب کو بتایا۔

سر......!!! احمد صاحب دو ماہ کی چھٹی گزار کر واپس آ گئے ہیں۔

کب واپس آئے ہیں۔

سر! کل رات آئے ہیں ۔

مجھے تو صوبیدار میجر صاحب نے نہیں بتایا۔

سر وہ آپ کو سٹاف پریڈ پر رپورٹ دیں گے۔

ہاں ٹھیک ہے۔ آپ، احمد صاحب کو تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس بھیجیں۔

بہتر سر.....!!

قریشی صاحب نے احمد صاحب کو بتایا کہ آپ کو کرنل صاحب یاد کر رہے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔

اچھا سر۔ اور پھر احمد قریشی صاحب کو سیلوٹ کر کے اندرونی دروازے سے کرنل صاحب کا دروازہ کھول کر ان سے اجازت لے کر اندر چلا گیا۔ ان کے سامنے جا کر بڑے ہی سمارٹلی ان کو جا کر سیلوٹ کیا۔ وہ اٹھ کر ملے اور احمد کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

صاحب کب آئے ہیں۔ کرنل چودھری نے پوچھا۔

سر رات کو آیا ہوں۔

کل تک آپ کی چھٹی تھی۔

جی سر۔

اب آپ کے کیا ارادے ہیں۔ ڈھاکا جانا چاہتے ہیں یا اب موڈ کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔

سر...! موڈ تو پہلے بھی ٹھیک تھا۔ اب جب پوسٹنگ آگیا ہے تو مہربانی سے مجھے بھیج ہی دیں۔

اگر آپ رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کا پوسٹنگ آرڈر آفیسر انچارج ریکارڈ سے کہہ کر منسوخ کروا دیتا ہوں۔

نہیں سر.....!! آپ کی مہربانی مجھے جانے دیں۔ مشرقی پاکستان بھی ہمارے ہی ملک کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں لوگوں نے ہی وہاں جا کر سروس کرنا ہے۔

اچھا صاحب اپ کی مرضی۔ کب جانا چاہتے ہیں۔

سر آپ اپنی سہولت دیکھ لیں۔

کل ٹھیک ہے۔

ٹھیک ہے۔ سر۔

اچھا آپ کل شام کی گاڑی سے پنڈی جانے کی تیاری کر لیں۔ میں ایڈ جوٹینٹ کو کہہ دیتا ہوں آپ کا موومنٹ آرڈر وہ نکال دیں۔ اور صوبیدار میجر صاحب کو کہہ دیتا ہو۔ وہ آج رات آپ کو ڈائین آوٹ (DINE - OUT) کر دیں۔ تاکہ آپ کل رات آسانی سے جا سکیں۔

شکریہ سر۔ احمد کرنل کو سیلوٹ کر کے واپس آگیا۔

اسی رات سردار صاحبان نے احمد کو الوداعی کھانا دینا تھا۔ ان کی روانگی کے لئے موومنٹ آرڈر بھی اسی دن اشوع ہو گیا۔ دوسرے دن کمانڈنگ آفیسر کی انٹرویو اور پھر فارغ۔ دفتر سے فارغ ہو کر احمد نے فلیٹیز میں ٹیلی فون کیا۔

کون منیجر صاحب بول رہے ہیں۔ احمد نے پوچھا۔

جی ہاں۔

مینجر صاحب۔ میں احمد بول رہا ہوں۔ آپ ذرا محترمہ حنا صاحبہ کو جو راولپنڈی سے کل آئی ہیں اور آپ کے ہاں مقیم ہیں۔ از راہ کرم ان کو انٹر کام پر میرا پیغام دیں کہ احمد صاحب اپنے آفس کے ٹیلی فون پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کریں۔

بہتر جناب۔

اور پھر دونو طرف سے ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔

فوراً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جناب احمد صاحب اگر وہاں موجود ہیں تو میں ان کے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ دوسری طرف سے کوئی خاتون بول رہی تھی۔

محترمہ لیجئے۔ آپ احمد صاحب سے بات کیجئے۔ وہ اسی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

شکریہ۔ (تھوڑے سے توقف کے بعد) ہیلو احمد۔ میں حنا بول رہی ہوں۔ خیریت تو ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کوارٹر گارڈ کی سزا تو نہیں ہو گئی۔

نہیں جناب ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ لیکن میرا اردلی اللہ یار خان کہتا ہے۔ "صاحب آپ کی چال ڈھال مجھے ٹھیک نظر نہیں آتی۔ یہ سوہنی کڑی تو آپ کو جہنم پہنچا کر دم لے گی۔"

اللہ یار خان کہتا تو ٹھیک ہے۔ میں ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں۔ میری سیاہ بختی کہیں تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

اچھا حنا۔ یہ باتیں تو پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ سردست میں نے آپ کو یہ بتانا تھا کہ میں آج رات بھی نہ آسکوں گا۔

وہ کیوں۔

وہ حضور اس لئے کہ میرے میس والے آج رات مجھے ڈائن آؤٹ (DINE - OUT) کر رہے ہیں۔ نہ جانے رات کو کب فارغ ہوں گا۔ صبح میری کمانڈنگ آفیسر صاحب کے ساتھ انٹرویو ہے۔ پھر اس کے بعد میں فارغ ہوں۔ کل ایک بجے دن کو میں فارغ ہو جاؤں گا۔ پھر آپ کی ڈسپوزل پر ہوں۔ لیکن ایک بات ہے۔

وہ کیا۔

جناب اللہ یار خان کا بھی میں نے پوسٹنگ اپنے ساتھ ڈھاکا کروا دیا ہے۔

تمہاری کار میں ہم دونو کا سامان نہ آسکے گا۔ بہتر ہے میں اور اللہ یار خان ٹرین سے پنڈی چلے جائیں اور آپ کار سے آجائیں۔

نہیں ایسا کرتے ہیں۔ اللہ یار خان کو سامان کے ساتھ ریل میں بیٹھا دیتے ہیں۔ ہم دونو کار سے چلے جائیں گے۔ گاڑی کے پہنچنے سے پہلے پنڈی پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے تم اپنا سامان اپنی نئی یونٹ میں لے جا کر چھوڑ آنا۔ کوئی رہنے کی جگہ بھی لے لینا۔ ساتھ ہی اپنی ارائیول (ARRIVAL REPORT) بھی ان کو دینا پھر جب فرصت ملی تو تم میرے گھر آجانا۔

جی بہتر۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

اوجڑی کیمپ میں میں نے اپنی رپورٹ دی۔ مشرقی پاکستان جانے کے لئے پوری سگنل یونٹوں سے وہاں آدمیوں نے اکٹھا ہونا تھا۔ اس لئے مجھے پنڈی ایک مہینہ رکنا پڑا۔ میں صبح ناشتہ کر کے حنا کے پاس چلا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو صبح واپس آتا رہا لیکن بعد کے دنوں میں کئی کئی دن ناغہ کرتا رہا۔ وہاں اکثر میرے دوست اہم پوسٹوں پر تھے۔ اس لئے مجھے کبھی کسی نے نہ پوچھا۔

آخر ہمارے مشرقی پاکستان جانے کی تاریخ کا فیصلہ ہو گیا آج سے چار دن بعد ہم نے بذریعہ تیز گام کراچی جانا تھا۔ حنا نے بھی اس گاڑی سے میرے ساتھ جانے کا پروگرام بنایا۔ میری بحری جہاز سے روانگی کے بعد حنا نے بمبئی چلا جانا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں چیک اشوع کروں۔ اور اسی چیک پر بینک سے تین ہزار روپے نکلوا کر لے آؤں۔ وہ میرے ساتھ کار چلا کر لے گئی لیکن میرے ساتھ اندر بینک میں نہیں آئی۔ باہر گاڑی میں بیٹھی رہی۔ میں نے چیک کاؤنٹر پر دیا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد مجھے بلا کر رقم میرے حوالے کر دی گئی۔ میں نے حنا سے پوچھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا ہے کہنے لگی اس لئے کہ تم اپنے طور پر ڈیل کرو۔ تاکہ تمہارا اعتماد بڑھے اور تم میری عدم موجودگی میں جب بھی چاہو تو بینک سے رقم نکلوا سکو۔ حنا نے بابا محمد شفیع کو ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ

دے دی اور اسے ہدایت کر دی کہ تم سب سامان اور گاڑی کی چوکیداری کرنا۔ جانے سے پہلے حنا نے گاڑی کو گیرج میں مستقل طور پر بند کر دیا۔ جنرل صاحب سے کہہ کر اجازت لے لی کہ بنگلہ فی الحال اس کی تحویل میں رہے۔ وہ اس کا باقاعدہ ماہانہ کرایہ بابا محمد شفیع کے ذریعے ادا کرتی رہے گی۔ بنگلے کے کرائے کا حساب کر کے حنا نے وہ رقم بھی بابا محمد شفیع کو دے دی۔ حنا نے بابا کو سمجھا دیا کہ اپنے ماں باپ کو ملنے ہندوستان جا رہی ہوں۔ میری عدم موجودگی میں تم سب سامان اور گاڑی کی اچھی طرح سے حفاظت کرنا۔ جنرل صاحب نے برگیڈیئر رضوی کو بھی کہا کہ آپ بابا محمد شفیع کی کارکردگی پر نظر رکھیں۔

یہ سب معاملات طے کرنے کے بعد مقررہ تاریخ کے لئے حنا نے دو فرسٹ کلاس کی سیٹیں پنڈی سے کراچی تک کی ریزرو کروا دیں۔ احمد نے اللہ یار خان کو اپنے سامان کے پاس سیکنڈ کلاس کی سیٹ پر اپنے ڈبے میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ اور خود حنا کے ساتھ فرسٹ کلاس میں منتقل ہو گیا۔ دو دن کے سفر کے بعد وہ کراچی چھاؤنی کے سٹیشن پر جا اترے۔ احمد دوستوں کے ساتھ مل کر ٹرانزٹ کیمپ میں چلا گیا۔ اور حنا کینٹ ریلوے سٹیشن کے ساتھ ایک ہوٹل میں رہائش پذیر ہو گئی۔ ویسے وہ کراچی آتی تو ہمیشہ تاج محل میں ہی ٹھہرا کرتی تھی لیکن اس دفعہ وہ احمد کی وجہ سے کینٹ ریلوے سٹیشن کے ساتھ ایک ہوٹل میں محض اس لئے ٹھہری تھی کہ وہ جگہ آرمی ٹرانزٹ کیمپ کے بالکل قریب تھی اور اس طرح اسے ہر وقت احمد کی قربت بھی میسر تھی۔

احمد ٹرانزٹ کیمپ میں رپورٹ کرنے کے بعد اپنا زیادہ وقت حنا کے ساتھ اسی ہوٹل میں گزارتا۔ وہ دونو وقت کھانا بھی حنا کے ساتھ اسی ہوٹل میں کھاتا۔ کسی دن رات کو کیمپ میں ساتھیوں کے ساتھ سو جاتا ورنہ اکثر راتیں ہوٹل میں بسر کرتا اس کی زندگی کا ایک رخ یہ تھا کہ وہ رات کی تنہائیوں میں حنا کے ساتھ اس کے بستر میں ہوتا اور دوسرا رخ یہ کہ وقت پر خود بھی دھڑا دھڑ نمازیں پڑھتا اور حنا سے بھی پڑھواتا۔ اس ذہنی الجھاؤ کا کوئی بھی حل نہ بتا سکا۔

آخر احمد اور اس کے ساتھیوں کی روانگی کا دن آ گیا۔ انہیں ٹرانزٹ کیمپ سے ہی ریل پر سوار کر کے ویسٹ وارف لے جایا گیا۔ ادھر تک اس نرم و نازک خاتون نے احمد کا ساتھ دیا۔ احمد بحری جہاز پر سوار ہو گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد حنا آنسو

بہاتی ہوئی اپنے ہوٹل واپس آ گئی۔ احمد نے حنا کو اپنے ڈھاکا کا پتہ لکھ کر دیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ جب پاکستان سے انڈیا کے لئے روانہ ہونے لگو گی تو مجھے ڈھاکا کے پتہ پر خط لکھنا۔ اس کے بعد بمبئی پہنچ کر مجھے روزانہ خط لکھا کرنا۔ احمد سے الگ ہوتے وقت اس نے بڑی مشکل سے اسے ایک ہزار روپے دیئے۔ پہلے تو وہ اپنی عادت کے مطابق پہلوتہی کرتا رہا لیکن حنا کے مسلسل اصرار پر وہ انکار نہ کر سکا اور اس نے وہ رقم قبول کر لی۔

دس دن کے تھکا دینے والے بحری سفر کے بعد ان کا جہاز چٹاگانگ کی بندرگاہ پر جا لنگرانداز ہوا۔ دو دن وہاں چٹاگانگ میں ٹرانزٹ کیمپ مین رہے۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ پورا مشرقی پاکستان پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈھاکا کا رابطہ ریل اور سڑک کے ذریعے چٹاگانگ سے منقطع تھا۔ اس لئے چٹاگانگ سے ایک بڑے سے بجرے کے ذریعے ڈھاکا گئے۔ یہ سفر کافی دلچسپ اور خوش کن رہا۔ ڈھاکا پہنچ کر دو دن ریسٹ کی اور پھر اپنے روزمرہ کے فوجی کاموں میں لگ گئے۔ ڈھاکا سے تقریباً پندرہ میل دور کرمی ٹولہ کے مقام پر فوجی چھاؤنی تھی۔ کرمی ٹولہ اچھی جگہ تھی یہ ریل اور سڑک دونو ذریعوں سے ڈھاکا سے منسلک تھی۔ چھاؤنی کافی صاف ستھری جگہ تھی پر خصوصیت سے جہاں ہماری یونٹ تھی وہ بہت خوصورت جگہ تھی۔ جس دفتر کا میں انچارج بن کر گیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی خوبصورت پھلوں کے باغ کے اندر تھا۔ اس باغ میں لیچی اور عمدہ قسم کے آموں کے درخت بہتات میں تھے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے جب جی چاہتا تازے پکے ہوئے پھل منگا کر لطف اندوز ہوتے۔

یونٹ کا ماحول بہت اچھا تھا۔ میرے اور ایڈجوٹینٹ کے سوا دوسرے سب لوگ اس یونٹ میں مزے کرتے تھے۔ ہم دونو کو یہ تکلیف تھی کہ ہمارا کمانڈنگ آفیسر بڑا تند خو آفیسر تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ ہم دونو سے اکثر الجھ پڑتا۔ ایڈجوٹینٹ کافی چالاک آفیسر تھا۔ وہ اپنی جان تو بچا لیتا۔ سب الا بلا میرے سر ڈال دیتا۔ کرنل اور میں ہم دونو ایک ہی طرح کے آدمی تھے۔ بہت جلد ہی اس کے اور میرے درمیان ناچاقی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ایڈجوٹینٹ دوغلی پالیسی پر عمل پیرا تھے ۔ وہ کرنل کے پاس جا کر اس کی طرف داری کی باتیں کرتا اور جب میرے پاس آتا تو میرا حوصلہ بڑھاتا کہ آپ حق پر ہیں

- ڈٹے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ مہینے ہی میں میری اے سی آر کرنل نے خراب کر دی۔ کرنل میرے ہی علاقے کا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا کہ آپ میرے گرائیں ہیں۔ اتنی زیادتی نہ کریں۔ مجھ سے اے سی آر پر دستخط کروا لینے کے بعد اس نے میری رپورٹ کو بہت دنوں تک اپنے پاس پینڈنگ رکھا۔ وہ مجھے سے کئی روز تک مطالبہ کرتا رہا کہ میں اس سے معافی مانگ لوں اور آئندہ کے لئے ٹھیک کام کرنے کا وعدہ کروں۔

میں اس سے ہر بار کہتا۔ جناب میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ معافی کس بات کی مانگوں۔ دراصل اس کرنل کی یہ پالیسی تھی چونکہ وہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ اپنا کام خوش اسلوبی سے نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ماتحتوں کو خوب دبا کر رکھتا۔ اس کے جھوٹے رعب داب کی وجہ سے نیچے والے بے چارے ضرورت سے زیادہ محنت اور احتیاط سے کام کرتے تھے۔ میرے جیسا آدمی جو صرف دفتری اوقات میں کام کرتا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ کرنل بیٹھا ہوا ہے دوسرے آفیسر اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے ہوئے ہیں جب کہ میں اپنے ماتحتوں کو بتا کر چلا جاتا۔

ان دنوں میں نے ریڈیو پاکستان ڈھاکا کے فورسز پروگرام کے لئے لکھنا اور ان پروگراموں میں شرکت شروع کر دی تھی۔ اس لئے مجھے وہاں بھی جانا ہوتا تھا۔ جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ ڈھاکہ شہر ہماری یونٹ سے پندرہ میل دور تھا۔ اس زمانے میں بسوں کا انتظام بڑا ناقص تھا۔ کافی دیر کے بعد بس ملتی تھی اس لئے میں دو بجے جا کر نماز پڑھتا۔ اور پھر کھانا کھا کر ریڈیو سٹیشن چلا جاتا۔ ہمارے کرنل کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ اپنی اس ناپسندیدگی کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس لئے کہ میرے جانے سے پہلے ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے کوئی اردو پروگرام نہ ہوتے تھے۔ بنگال میں رہنے والے فوجیوں نے اپنی اپنی یونٹوں کے توسط سے ڈویژنل کمانڈر تک متعدد عرض داشتیں پہنچائیں کہ یہاں بھی ریڈیو سے فورسز پروگرام کی نشرو اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

میجر جنرل جیلانی صاحب ہمارے ڈویژنل کمانڈر تھے انہوں نے فورسز پروگرام شروع کرنے کے لئے احکامات جاری کئے۔ کیپٹن قاسم ہمارے پی آر او تھے۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان کے افسران بالا سے مل کر شام کو ایک گھنٹے کا فورسز پروگرام اردو میں شروع کرنے کا اہتمام کیا۔ مجھے ان کی مدد کے لئے ان کے ساتھ سرکاری طور پر اٹیچ

کیا گیا۔ میں اپنے دفتری اوقات کے بعد یہ کام کرتا تھا۔ چونکہ یہ جنرل صاحب کے ایماء پر شروع کیا گیا تھا۔ اس لئے اس پروگرام میں رخنہ اندازی کرنے کوئی بھی جرات نہ کر سکتا تھا۔

آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا۔ لاہور کے کمانڈنگ آفیسر سے ناراض ہو کر وہاں سے بھاگا یہاں آتے ہی نئے سی ۔ او نے سینگوں پر اٹھا لیا۔ دراصل فوج کا یہ شروع سے دستور چلا آ رہا ہے کہ کوئی جونیئر اپنے سے سینئر کے سامنے زبان کھولنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کھولے گا تو اس کا مجھ سے بھی بدتر حشر ہو گا۔ وہ تند خو کرنل بلا امتیاز رینکس ہر ایک آدمی کی چاہے وہ چھوٹا ہو تا یا بڑا معمولی معمولی باتوں پر بھی بے عزتی کر دیتا۔ میری اے سی آر خراب ہوئی تو اس کے بعد اس تند خو کرنل کی کوئی خاص پروا نہ کرتا تھا۔ سب لوگ اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ مجھے صوبیدار میجر اکثر نصیحتیں کرتا کہ تم اپنا کیریئر کیوں خراب کر رہے ہو۔

میں اس سے کہتا مشرقی پاکستان آگیا ہوں۔ یہاں سے جاوا سماٹرا یہ کرنل مجھے نہیں بھیج سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے اختیار میں میری اے سی آر تھی۔ وہ اس نے خراب کر دی۔ اور میرا کیریئر کیا خراب ہو گا۔ یہ بات صوبیدار میجر نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کبھی اسے بتا دی۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ سامنے بٹھایا ۔ چائے منگوائی۔ اس دن خلاف معمول میں نے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ مجھ سے اس نے میرا گاؤں ۔ خاندان اور فیملی بیک گراؤنڈ پوچھا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ "بقول غالب" "سو سال سے پیشہ آباء سپہ گری"

وہ مجھے سے کہنے لگا۔ یہ غالب تمہارا کوئی بڑا دادا تھا۔

جناب آپ اور ہم سب کا دادا تھا۔

میں نے تو اپنے اس دادے کا نام کبھی نہیں سنا۔

اس لئے تو آپ اپنے آپ سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔

وہ ہلکا سے مسکرا پڑا۔

نہ جانے اس نے میری بات کا مفہوم بھی سمجھا تھا یا نہیں۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

مجھے ڈھاکا آئے دس دن ہوئے ہوں گے کہ حنا کا ایک خط مجھے ملا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ تمہیں گئے ہوئے آج چوتھا دن ہے۔ اب تم سری لنکا کی حدود میں ہو گے۔ میں نے شروع کے دو دن بڑی اداسی اور پریشانی میں گزارے وہی تاج محل ہے وہی لوگ ہیں وہی میں ہوں کمی ہے تو صرف ایک تمہاری۔ میں سمجھتی ہوں تم خود ایک عجیب سی اداسی ' پریشانی اور اضطراب کے عالم میں عرشے پر بیٹھے غروب آفتاب کا منظر دیکھتے ہو گے۔ غروب آفتاب جو مغرب میں ہوتا ہے تم کو چاہنے والی ذات مغرب کے ایک اداس کمرے میں جس میں تمارے ساتھ ماضی میں خوش کن لمحے گزارے تھے۔ تمہاری یاد میں اداس و پریشان بیٹھی ہوئی ہے۔

میں انڈیا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن تمہارے کہنے پر اس دفعہ جا رہی ہوں۔ اب انڈیا میں صرف ایک میری ماں کی ذات ہے جس میں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ سیدھے راستے پر آ چکی ہو تو تب۔ جس کی مجھے کم ہی امید ہے۔ ایک دفعہ آدمی راہ راست سے بھٹک جائے تو وہ مشکل سے ہی راہ راست پر آتا ہے۔ میری ماں نے اپنی جھوٹی انا کی خاطر اپنی جوانی کا جو خون کیا۔ جنس کو کبھی بھی ابھر کر سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اور آخر شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی۔ موجو نے اس شعلے کو ہوا دی۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دہکتی آگ کا ایک سمندر بن گئی۔

اگر میری ماں اب بھی اسی حالت میں ہوئی تو میری بربادی یقینی ہے۔ میں

اس آگ سے پہلو بچا کر کہیں نہ جا سکوں گی۔ میری ماں اپنی من موج کی خاطر بخوشی مجھے اس دہکتے جہنم میں جھونک دے گی۔ اور اس سے پھر باہر آنے کا میرے لئے کوئی راستہ نہ ہو گا۔ کیا ہی اچھا ہو گا کہ اگر مجھے بمبئی پہنچتے ہی اپنے والد کے متعلق معلومات مل جائیں۔ اور میں بمبئی میں مزید قیام کرنے کی بجائے سیدھی لکھنؤ چلی جاؤں۔ وہاں جا کر ایک نئی اور انوکھی زندگی کا آغاز کروں۔ خدا کرے میرے والد کے خاندان میں کوئی ایسا آدمی ہو جس کے ساتھ وہ میری شادی کروا دیں اور میں زندگی کے بقایا دن آرام سے گزار سکوں۔

میں دو دن کے بعد بمبئی جاؤں گی۔ میں نے اپنے کاغذات تکمیل کے لئے جمع کرا دیئے ہیں جانے سے پہلے تمہیں خط لکھ کر آگاہ کروں گی اور پھر بمبئی پہنچ کر جو بھی صورت حال ہوئی اس سے آپ کو آگاہ کروں گی۔

میرا دعاؤں اور پیار بھرا سلام قبول کیجئے۔

فقط تمہاری۔

حنا۔

آفس اردلی نے احمد کو بتایا کہ آپ خط پڑھ رہے تھے اور آپ کے آنسو بہہ رہے تھے تو کرنل صاحب آپ کے پاس آکر کھڑے رہے۔ بڑی محویت کے عالم میں آپ کو دیکھتے رہے۔ آپ خط پڑھنے میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ آپ کو اپنے اردگرد کا بھی ہوش نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کرنل کا اردلی احمد کے دفتر میں آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ خط پڑھ چکے ہیں تو اس نے احمد سے کہا سر کرنل صاحب کہہ رہے ہیں اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو آپ میرے پاس آ جائیں۔

ٹھیک ہے۔ آ رہا ہوں۔ آپ ان کو بتا دیں۔

احمد نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں کو کنگھی کی اور پھر

کرنل کے دفتر میں چلا گیا۔ جا کر ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

صاحب بیٹھئے۔ کرنل نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شکریہ سر....!!

احمد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کیوں صاحب خیریت تو ہے۔ کرنل نے بڑے ہی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

خیریت ہے سر۔

صاحب خیریت تو نہیں۔ آپ خط پڑھ رہے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

بس سر۔ ایسے ہی کوئی گزری ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔

صاحب آپ کے گھر میں اگر کوئی تکلیف ہے تو میں آپ کو چھٹی بھیج دیتا ہوں۔

نہیں سر۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چھٹی میں ابھی گزار کر آیا ہوں۔

اور چلے جائیں۔

نہیں سر۔ شکریہ آپ کا۔

دو دن کے بعد حنا کا نیا خط آیا۔

میرے کاغذات مکمل ہو کر آ گئے ہیں۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے بمبئی جا رہی ہوں۔ میری چھٹی حس مجھ کو بتا رہی ہے کہ اب میری اصل مشکلات کی ابتدا ہونے والی ہے۔ بعض اوقات میں اس مرحلے پر بھی سوچنے لگتی ہوں کہ میں انڈیا نہ جاؤں بلکہ واپس راولپنڈی چلی جاؤں۔ یا اگر تم کہتے ہو تو میں ڈھاکا آ جاتی ہوں۔ میرے لئے دعا کرنا خدا میرے حالات کو ٹھیک رکھے اور میرا حسب منشاء کام ہو جائے۔

تمہاری حنا۔

دفتر اردلی نے میرے اردلی اللہ یار خان کو بتلا دیا کہ چند دن پہلے احمد صاحب کو گھر سے کوئی خط آیا تھا۔ وہ اسے بار بار پڑھتے رہے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ کرنل صاحب نے ان سے پوچھا لیکن انہوں نے نہیں بتایا۔ کہنے لگے صاحب خیریت ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

احمد اپنے کوارٹر میں گیا تو اللہ یار خان نے پوچھا۔

صاحب جی خیریت تو ہے۔

کیوں اللہ یار خان۔

میں نے سنا ہے آپ کو گھر سے کوئی خط آیا ہے۔ وہ خط آپ پڑھ بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ کرنل صاحب وہ تمام وقت آپ کے پاس کھڑے رہے لیکن آپ اتنے بے خبر تھے کہ آپ کو ان کی آمد کا بھی پتہ نہیں چلا۔

بس اللہ یار خان خیریت ہے۔ خط پڑھتے ہوئے کوئی پرانی بات یاد آ گئی تھی۔

صاحب کہیں اس سوہنی کڑی کا تو خط نہیں تھا۔

نہیں اللہ یار خان۔ گھر سے آیا تھا۔

صاحب گھر کے خطوں پر تو آپ نہیں روتے۔ ہو نہ ہو اسی سوہنی کڑی کا خط ہو گا۔ آپ دونو ایک دوسرے سے نہ جانے چاہتے کیا ہیں۔ سوکھی محبت کس کام کی۔ عورت مرد کی محبت ہوتی ہے۔ اپنا جنسی خلفشار دور کیا اور آسودگی حاصل کی اور معاملہ ختم۔ آپ دونو کا یہ قصہ بھی نہیں ہے۔ وہ بی بی آپ کو ہزار بار روپے بھی دینا چاہتی ہے لیکن آپ روپیہ پیسہ بھی نہیں لیتے۔ پھر آپ نے یہ ٹنٹا کیوں پالا ہوا ہے۔ افسر الگ ناراض ہوتے رہتے ہیں۔ جگ ہنسائی الگ ہوتی ہے۔

نہیں اللہ یار خان وہ سوہنی کڑی تو اب کراچی رہ گئی ہے اب ادھر اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔

نہیں صاحب میں یہ بات نہیں مانتا۔ اس کڑی کو جو آگ لگی ہوئی ہے کیا پتہ کسی دن ادھر بھی آ نکلے۔

کیوں اللہ یار خان۔ وہ سوہنی کڑی تمہیں اچھی نہیں لگتی۔

بالکل ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ کم بخت آپ کو تباہ کر کے چھوڑ یگی۔ آخر آپ اس سے چاہتے کیا ہیں۔

اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو ۔ جاؤ میس سے میرے لئے چائے لے آؤ۔

میں چائے پی کر ریڈیو پاکستان چلا گیا۔ مجھے جتنی فوج سے تنخواہ ملتی تھی اتنی بڑی آسانی سے میں چار پانچ ریڈیو کے پروگرام کر کے کما لیتا تھا۔ ریڈیو پروگراموں کے اس زمانے میں وہاں دو آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ جسے میں مشرقی پاکستان کے قیام کا حاصل سمجھتا ہوں۔ یہ دونو بہت بڑی شخصیتیں تھیں۔ پہلے تھے جناب کوی جسیم الدین صاحب ۔ آپ بنگالی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے جب میں نے انہیں دیکھا میرے اندازے کے مطابق اس وقت ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ جناب عبدالحمید عدم صاحب کی وضع قطع اور اسی ڈیل ڈول کے آدمی تھے ۔ لباس میں بھی اسی طرح کی بے ترتیبی جھلکتی تھی۔ بالکل عدم صاحب کی طرح کا لاابالی پن ان میں بھی تھا۔ مجھ سے اکثر ریڈیو سٹیشن پر ہی ملتے تھے۔

جب بھی ملتے بڑی شفقت اور محبت سے ملتے۔

دوسرے صاحب جن سے میری ریڈیو ہی میں ملاقات ہوئی ۔ جناب سید ظل الرحمن صاحب تھے آپ اس وقت اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ سید صاحب اصل میں کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بننے پر ڈھاکا (تیج گاؤں) میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ سید صاحب بنگالی ہونے کے باوجود بڑی خوبصورت اردو لکھتے اور بولتے تھے۔ سید صاحب بڑے خوبصورت آدمی تھی۔ ان کا لہجہ اتنا پیارہ اور خوبصورت تھا کہ سننے والے یہ چاہتے تھے کہ یہ باتیں کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

ان کے علاوہ ایک اور نوجوان سے بھی میری دوستی ہو گئی۔ ان کا خاندانی نام تو کچھ اور تھا لیکن ان کے سب ملنے والے ان کو سعید صاحب کہتے تھے۔ سعید صاحب نوابان ڈھاکا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ بڑا اچھا گاتے تھے۔ یونیورسٹی میں ایم ۔ اے کے طالب علم تھے میرے پاس اکثر کرمی ٹولہ آیا کرتے تھے۔ وہ بھی ریڈیو پاکستان سے پروگرام کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ گھر بھی لے جاتے تھے ایک دفعہ

انہوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ نواب پور روڈ پر ایک محل نما حویلی میں رہا کرتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن سے سعید مجھے اپنے ساتھ اس شام نواب پور لے گیا۔ جو ڈھاکا میں سب سے خوبصورت علاقہ ہے۔

ان کا بہت بڑا محل نما مکان تھا لیکن اس کی دیکھ بھال وہ لوگ ٹھیک طور پر نہ کرتے تھے۔ لان سوکھے سوکھے برآمدوں کے پلستر اکھڑے ہوئے۔ صحن میں گڑھے پڑے ہوئے۔ حویلی میں کہیں گائے اور اس کا بچھڑا بندھا ہوا ہے۔ ایک طرف دو عجیب و غریب نسل کے کتے سوئے ہوئے تھے۔ برآمدوں میں ٹوٹا ہوا فرنیچر اور کہیں اینٹوں کے ٹکڑوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک بہت ہی لاغر اور مریل گھوڑا کھڑا تھا۔

سعید مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ اس کے ماں باپ بھی آ گئے۔ وہ دونو پینتالیس چھیالیس سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ وہ عجیب سی اردو بولتے تھے۔ جو مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سعید کے دو تین چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بھی آ گئے۔ جنہوں نے آتے ہی کافی بدمزگی پیدا کر دی۔ ان کا نوکر ایک ڈونگے میں رس گلے لے آیا۔ جو ہم لوگوں نے بڑے مزے سے کھائے۔ مجھے سعید کے ساتھ ان کے گھر آ کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ میں اپنے آنے اور یوں وقت کا زیاں پر پچھتا ہی رہا تھا کہ ایک بہت ہی حسین و جمیل لڑکی جس کی عمر کوئی بیس بائیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اندر آ گئی اور بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ آ کر مصافحہ کیا۔ جسے میں نے اپنے لئے ایک بڑا اعزاز سمجھا۔

میں نے سمجھا کہ شاید یہ نواب صاحب کی صاجزادی ہے۔ لیکن جب انہوں نے تعارف کروایا تو پتہ چلا کہ شائستہ ان کی سب سے چھوٹی بہن ہے۔ میں نے اپنے آپ کو کوسنا چھوڑ دیا اور ان مختصر سے لمحوں کو خوشگوار بنانے کے لئے میں نے بڑی سرگرمی سے ان کی ہلکی پھلکی گفتگو میں شمولیت اختیار کر لی۔۔ شائستہ بھی اچھی اردو نہ جانتی تھی لیکن اپنے بھائی اور بھاوج کی نسبت اچھی طرح سے اردو بول اور سمجھ سکتی تھی۔ ان کے پورے کنبے میں سعید ہی ایک ایسا فرد تھا جو بڑی صاف اور صحیح اردو بولتا تھا۔ شائستہ کے آنے سے میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں نے جتنا وقت بھی یہاں رہنا ہے وہ وقت اچھا کٹے گا۔

شائستہ تھوڑی ہی دیر میں مجھ سے گھل مل گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔
شائستہ صاحبہ آپ کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں۔
میں نے بی اے کرنے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا ہے۔
آپ آگے یونیورسٹی میں ماسٹر کے لئے داخلہ لے لیتیں۔
ادھر میں نے بی اے کیا ادھر نواب صاحب نے میری شادی کر دی۔
کب ہوئی ہے آپ کی شادی۔
پچھلے سال۔
کس کے ساتھ۔
آپ کے کرمی ٹولہ سے آگے ایک بڑا جاگیردار ہے اس کے ساتھ۔
آپ کب آئی ہیں۔ وہاں سے۔
میں نے اس آدمی سے طلاق لے لی ہے۔
کیوں۔
بس مجھے وہ شخص اچھا نہیں لگا۔
کیوں جوان نہیں ہے یا پڑھا لکھا نہیں ہے۔
نہ جوان ہے اور نہ ہی معقول حد تک پڑھا لکھا ہے۔
تو پہلے شادی کیوں کی تھی۔
بس نواب صاحب نے کر دی۔ میں چپکے سے چلی گئی۔
کتنا عرصہ وہاں رہیں۔
ڈیڑھ ماہ رہی ہوں گی۔
آپ کی اس شادی کی ناکامی پر بڑا افسوس ہے۔
افسوس کس بات کا۔ اور شادی کر لوں گی۔
اب کے شادی دیکھ بھال کر کرنا۔ لڑکے کو ہر طرح سے دیکھ لینا۔ اگر پسند آئے تو تب کرنا۔
جی ہاں۔ ایسا ہی کروں گی۔ اس دفعہ میرا خیال ہے میں کسی پنجابی یا پٹھان سے شادی کروں گی۔

وہاں کی زندگی بڑی سخت ہے۔ آپ وہاں گزارا نہیں کر سکیں گی۔ یہ شادی میں ناکام ہو جائے گی۔

میرے نام بہت جائیداد ہے۔ میرا کافی سے زیادہ بینک بیلنس ہے۔ میرے پاس جیولری بھی بہت ہے۔ میں کسی ایسے آدمی کے ساتھ شادی کروں گی جو مستقل طور پر ڈھاکا میں سکونت اختیار کر لے۔ میرے اپنے فلیٹ ہیں۔ شادی کر کے میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔

خان صاحب یہ کریک ہے۔ میں نے اس کی شادی پر دس لاکھ ٹکے (روپے) خرچ کئے۔ یہ نواب محسن علی خان کے ساتھ لڑ کر ایک مہینے کے بعد ہی واپس آ گئی۔ اس نے بڑی منت سماجت کی لیکن اس پاگل لڑکی نے آخر کار طلاق لے کر چھوڑی۔ اب اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہ میں اب کسی پنجابی یا پٹھان سے شادی کروں گی۔

شائستہ رونے لگ گئی۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

دیکھا ہے خان صاحب آپ نے۔ میرا بھائی نہیں چاہتا کہ میں اپنی جائیداد اور زرو مال لے کر ان سے الگ ہو جاؤں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں اسی طرح باقی زندگی گزار دوں تاکہ میرے مرنے کے بعد میری جائیداد اور مال و متاع اس کے بچوں کو مل جائے۔ یہ ہر بات پر مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ تم "پاگل ہو۔"

نہیں، مس شائستہ صاحبہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ نواب صاحب آپ سے ہنس رہے ہیں۔

خان صاحب آپ سعید کے ساتھ آیا کریں۔ مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔

مس شائستہ میں فوجی آدمی ہوں۔ میری بڑی مصروفیت ہوتی ہے۔

آپ آفیسر ہیں۔

چھوٹا سا۔

شادی شدہ ہیں۔

جی ہاں۔ دو بچے بھی ہیں۔

اگر آپ نہیں آ سکتے تو مجھے اپنا ریذیڈنس بتا دیں۔ میں کبھی کبھی آپ

سے ملنے آجایا کروں گی۔

نہیں مس شائستہ فوجی کیمپوں میں عورتوں کا آنا منع ہوتا ہے۔

تو میں ریڈیو سٹیشن آجایا کروں گی۔ وہاں تو میرے لئے آنا آسان ہے۔

جی ہاں۔ ادھر سعید کے ساتھ آجایا کریں۔

یہ کسی وقت ہوتا ہے کسی وقت نہیں ہوتا میں اسے اب دیکھتی رہوں گی میں خود آجایا کروں گی۔

چلئے جب چاہیں آپ آجائیں۔ وہاں ریڈیو سٹیشن پر سید ظل الرحمن صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں ان کے دفتر میں آپ آجائیں سید صاحب سے آپ میرا پوچھ لیں۔

تو کیا آپ وہاں نہیں ہوتے۔

ہوتا ہوں۔ لیکن کہیں سٹوڈیو میں ہوں گا۔ آپ مجھے تلاش نہیں کر سکیں گی۔

بہت بہتر۔ میں کسی دن آجاؤں گی۔

تھوڑی دیر اور بیٹھا اور پھر نواب صاحب سے اجازت لیکر میں واپس آگیا۔ تمام راستے میں سوچتا رہا ہر آدمی بڑا دکھی ہے۔ کوئی ایک دوسرے کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہے۔ حنا کے بغیر کسی نے میرے دکھوں کا مداوا کرنے کا کبھی سوچا ہے۔ میرے دوست بھی ہیں۔ رشتہ دار بھی ہیں۔ کسی نے کبھی مجھ سے ہمدردی جتائی ہے۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اکیلا دیوانوں کی طرح پھر رہا ہوں۔

اب اس مس شائستہ ہی کو دیکھ لیں۔ کتنی خوبصورت ' جوان اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اپنے لئے ایک باصلاحیت اور اچھی شکل و صورت والا مرد اسے نہیں ملتا۔ کروڑہا روپے کی مالکہ ہے۔ جائیداد ہے۔ فلیٹ ہے۔ بے انداز روپیہ پیسہ ہے۔ نہیں ہے تو ایک اپنے چائس کا خاوند نہیں ہے۔ کتنے ظلم کی بات ہے جس کے ساتھ خواتین نے عمر بتانی ہوتی ہے۔ شادی کے آخری دن تک وہ مرد انہوں نے دیکھا ہوا نہیں ہوتا۔ اس لڑکی بے چاری کی بھی یہی پرابلم ہے۔ اس کے بھائی نے بھی ممکن ہے اچھی نیت سے اس

کی شادی جاگیردار طبقے کے ایک بڑے آدمی سے کی ہو۔ نواب صاحب نے تو اپنی طرف سے سوچا ہو گا کہ میری بہن اچھی زندگی گزارے گی۔ شائستہ نے اپنے خاوند کو دیکھا تو اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ شائستہ کا بھائی اس کے خاوند کو روپے پیسے کے ترازو میں تولتا رہا۔ جب کہ عورت کی اپنی ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔ دراصل میاں بیوی کی زندگی وافر مقدار میں مال و دولت سے نہیں گزرتی بلکہ پیار اور محبت سے گزرتی ہے۔ جھگیوں میں رہنے والے جوڑے ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ جب کہ محلات میں رہنے والے کئی ایک لوگوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر مستقل طور پر الگ ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے سے سخت نفرت ہوتی ہے۔

شائستہ کا بھائی اب تو اسے دبے دبے لفظوں میں پاگل کہتا ہے۔ اگر اس لڑکی کی یہی حالت رہی تو اسے HYSTEROMANIA کی بیماری لاحق ہو جائے گی۔ اور اگر وہ نہ ہوئی تو جنس کو دبا دبا کر HYSTERO EPILEPSY ہو جائے گی۔

دیکھنے والے اس کی اصل وجہ تو نہ سمجھ سکیں گے۔ نواب صاحب جیسے ان سے کہہ دیں گے وہ مان جائیں گے۔ بھائی نے بغیر دیکھے بھالے اس کی شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ کر دی۔ جس کے پاس سونے چاندی کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ عورت سونے چاندی کے ساتھ تو شادی نہیں کرتی۔ وہ تو ایک محبت کرنے والے مرد سے شادی کرتی ہے۔ چاہے اس کے پاس ایک وقت کی روٹی بھی نہ ہو۔ بھائی کے اس بیجا رویئے سے اسے اب اس طرح کے سب مردوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ اب کسی اس طرح کے مرد کے ساتھ شادی نہیں کرے گی وہ کسی پنجابی یا پٹھان سے کرے گی۔ حالانکہ اسے اس طرح کی زندگی کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں۔ جس طرح کی زندگی پنجاب یا سرحد کے لوگ گزارتے ہیں۔ وہ نادان لڑکی شاید اب تک یہی سمجھے بیٹھی ہے کہ موجودہ پنجاب بھی رانجھوں اور مہینوالوں کی سرزمیں ہے۔ یہ لوگ وفا کے پتلے ہوتے ہیں۔ میں جب بھی کسی رانجھے کو بلاؤں گی وہ کسی بیلے سے وفا کی بنسری بجاتا ہوا آ جائے گا۔ لیکن حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔

میں عام طور پر دس بجے رات کو واپس آتا تھا۔ اس وقت آ کر رات کا کھانا کھاتا تھا۔ تب تک اللہ یار خان بے چارہ میرے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا۔ اب کرنل کا

رویہ بھی میرے ساتھ ٹھیک ہوتا جا رہا تھا۔ میں اب اس کی زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا۔ اے سی آر اس نے میری خراب کر دی تھی۔ مغربی پاکستان میں ہوتے تھے تو یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ اگر افسران بالا ناراض ہو گئے تو مشرقی پاکستان پوسٹنگ ہو جائے گی۔ ڈھاکا پہنچ کر اب یہ ڈر بھی نہ رہا تھا۔ جہاں تک مزید ترقی کی بات تھی۔ آپ کی رپورٹس OUT STANDING بھی ہوں۔ ترقی آپ کو اپنے نمبر پر ہی ملے گی۔

میرا ابھی پروموشن کا بھی کوئی فوری چانس نہ تھا۔ ملازمت کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس سے اچھی ملازمت مجھے سول میں مل سکتی تھی۔ جب ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی تو پھر اس تند خو اور بدمزاج کرنل سے ڈرنا کیا۔ میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ میری وجہ سے ان کا جھوٹا رعب داب کم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس نے پھر بہت جلد مجھ سے صلح کر لی۔ پھر بھی میری روش نہ بدلی۔ باقی آفیسرز اور سردار صاحبان کو جب وہ بلاتا تو ان کا خون خشک ہو جاتا۔ شاید ان کی اپنی کوئی مصلحتیں ہوں گی۔ جس کے باعث وہ کچھ بولتے نہ تھے۔ میں نے اس کا جھوٹا "ہوا" سر سے اتار پھینکا تو وہ بے حقیقت ہو کر رہ گیا۔ میری وجہ سے بہت سے لوگوں کو حوصلہ ملا۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

O

بمبئی سے حنا کا خط آیا۔ میں نے سب کام چھوڑ کر خط پڑھنا شروع کر دیا۔

ڈیئر احمد۔

اسلام علیکم..........!!!

میں آج صبح سویرے کی فلائیٹ سے بمبئی پہنچی ہوں۔ ایئر پورٹ سے سیدھی مچھیروں کی ان بستیوں کا رخ کیا جہاں میں آخری بار اپنی ماں کو چھوڑ کر گئی تھی۔ میرا خیال تھا اب تک میری ماں نے وہ سب پروجیکٹ مکمل کروا لئے ہوں گے۔ اور اب مجھے انڈیا آکر رسوا و ذلیل نہ ہونا پڑے گا۔ چپکے سے بچوں کے کسی سکول میں استانی لگ جاؤں گی اور زندگی کے باقی دن اس نیک کام میں گزار دوں گی۔ لیکن یہاں آکر میں نے حالات ہی دگر گوں دیکھے۔ موجو مر چکا ہے۔ میری ماں وہ بستی چھوڑ کر پھر اس بدنام آبادی میں واپس چلی گئی ہوئی ہے۔ خدا نے مجھے بچا لیا ورنہ مچھیروں کا نیا سردار مجھے اپنی بیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنی ماں کے حالات و واقعات سے اگر آگاہ نہ ہوتی تو اس کی یہ آفر شاید قبول بھی کر لیتی۔ لیکن ماں کی گناہوں بھری زندگی میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ میں نے سردار کو چکمہ دیا کہ میں تم سے شادی کروں گی لیکن پہلے اپنی ماں سے مل آؤں۔ وہ یہ بات مان گیا اور میں اس ترکیب سے وہاں سے جان بچا کر نکل آئی ہوں۔

ان بستیوں سے میری ماں کا فلیٹ تقریباً بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ میں ان بستیوں سے پیدل چل کر سڑک تک آئی وہاں سے مجھے ایک ٹیکسی ملی اور میں اپنی ماں کے فلیٹ پر پہنچی۔ میں نیچے سے بیل دیتی رہی لیکن اوپر سے کوئی آدمی نہ آیا میں تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ پھر مایوس ہو کر ساتھ کے فلیٹ میں بیل دی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت پان چباتی ہوئی دروازے پر آئی۔ مجھ سے پوچھنے لگی۔

کیوں بی بی۔

ماں جی یہ ساتھ کے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔

ارے چھوکری میں تجھے ماں جی لگتی ہوں۔ ذرا ہوش سے بات کر۔

اچھا محترمہ معاف کرنا۔ مجھ سے بھول ہو گئی ہے۔

ہاں اب بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔

محترمہ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ کہ اس ساتھ کے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔

ارے کیا پوچھتی ہو ایک بدقماش سی بڑھیا رہتی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی پر ابھی تک اس کے لچھن وہی ہیں۔ روز ایک نیا آدمی رات کو لاتی ہے۔

اس بڑھیا کا نام آپ کو پتہ ہے۔

نہ بی بی۔ ایسی بے سرم (بے شرم) عورتوں سے تعلقات رکھ کے بے عجتی مول لینی ہے۔

اچھا آپ کی مہربانی۔

ارے جرا ٹھہرو۔ تو۔ تم کاہے کو پوچھے ہو۔

میں اپنے ایک رشتہ دار کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ اور پھر میں اس سے جان چھڑا کر پہلے فلیٹ کے قریب آ گئی۔ میں نے پھر ایک لمبا بیل دیا۔

اندر سے میری ماں نیم عریاں حالت میں دروازے پر آئی اس نے غصے سے دروازہ کھولا اور تقریباً چیختی ہوئی بولی۔

کون ہے بھئی۔ آرام بھی کرنے دو گے یا نہیں۔ اس نے بہت غضبناک ہو کر کہا۔

می میں حنا ہوں۔ دروازہ کھولئے۔

میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ اندر میرے ایک گیسٹ ہیں۔

می میں گیسٹ کو تو کچھ نہیں کہتی۔

اچھا ٹھہرو۔ اور پھر اس نے مجھے کچن کی چابی لا دی اور ساتھ ہی ایک غلیظ سی دری اور سرہانہ بھی لا دیا۔ کہ فی الحال تم کچن میں جا کر سو رہو۔ تھکی ہوئی ہو گی۔ میں نے اسے بھی غنیمت جانا اور کچن میں جا کر اس میلے کچیلے فرش پر دری بچھا کر لیٹ گئی۔ کچن اتنا چھوٹا تھا کہ میں ٹانگیں بھی نہ پھیلا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر لیٹی لیکن سڑاند اور تعفن کے باعث وہاں سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔

کہ انسان کی اس عارضی زندگی کے بھی کتنے رخ ہیں۔ اگر وہ عملی زندگی میں کسی موقع پر بھی کوئی غلط قدم اٹھالیتا ہے تو پھر پلٹ کر اپنے مقام پر نہیں آ سکتا۔ میری ماں ہی کو دیکھو ایک نواب کی بیوی تھی کالج کی پرنسپل تھی اونچی سوسائٹی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی تھی۔ ایک لغزش سے اس کے پائے استقلال میں فرق آ گیا۔ اور اسی خطا اور گمراہی کے باعث اب مسلسل قعر مذلت میں گرتی چلی جاتی ہے۔ ساتھ کے لوگوں کا اس کے متعلق کیا رویہ ہے۔ میں نے بڑے طویل اور اذیت ناک انتظار کے بعد می کے کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ ایک جوان لیکن بدوضع اور غلیظ سا آدمی ان کے کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر کھڑے ہو کر باہر کا ایک جائزہ لیا اور پھر پلٹ کر میری ماں سے کہا۔ جو اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

میم صاحب پھر کب آؤں۔

پرسوں آ جانا۔ لیکن ٹیکہ لگوا کر آنا۔ خاک بھی مزا نہیں آیا۔

آپ پیسے دے دیں۔

اچھا۔ میری ماں اندر گئی۔ کچھ پیسے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور وہ آدمی سگریٹ پیتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر کر چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ اب میری ماں سیدھی میرے پاس آئیگی۔ محبت سے ملیگی۔ حال احوال پوچھے گی۔ اپنی مصنوعی علالت کو بڑھا چڑھا کر بڑے موثر انداز میں مجھ سے بیان کرے گی۔ لیکن وہ پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے سوچا۔ ابھی منہ

ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر ضرور آئے گی۔ ناشتہ تیار کرے گی۔ دونو ماں بیٹی اکٹھی بیٹھ کر ناشتہ کریں گی۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھیں گی۔ لیکن پھر وہ شاید اندر جا کر سو گئی تھی۔

چونکہ باوجود انتظار کے بھی وہ پھر باہر نہ آئی۔ میں لیٹ تو سکتی نہ تھی ایک لکڑی کی چوکی پر دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور ماں کا انتظار کرنے لگی۔

دس بجے کے قریب پھر نیچے سے کسی نے بیل دی۔ میں سوچنے لگی کہ اب تو میری ماں ضرور اٹھے گی۔ لیکن وہ نہ اٹھی ۔ اس کا دروازہ بدستور بند تھا۔ اب اندر اس کے پاس کوئی گیسٹ نہ تھا۔ لیکن شاید وہ مجھے اوائڈ کرنا چاہتی تھی۔

دوسری مرتبہ پھر کسی نے نیچے سے بیل دی۔ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی۔ میں نے جا کر سیڑھیوں کا دروازہ کھول دیا۔ ایک جوان سا آدمی جو پیشے کے لحاظ سے مجھے کوئی دادا لگتا تھا۔ بلا جھجک اوپر آ گیا۔ اوپر آ کر جب اس کا سانس کچھ ٹھیک ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔

سالا تم کون ہے۔ وہ میم صاحب کدھر ہے۔

میں ان کی بیٹی ہوں۔ وہ بیمار ہیں۔ دوائی لے کر اندر سوئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ نے ان سے ملنا ہے تو کل آئیں۔

اس سالا سے کیا ملنا ہے۔ تم سالا ایک دم سے اول نمبر ہے۔ ہم تمہارے پاس ہی ٹھہرے گا۔

دادا میں تو ایسا کام نہیں کرتی۔ گھریلو عورت ہوں۔

گھریلو عورت ہو تو کیا ۔ ہو تو عورت نا۔ ہمارا کام تو تم سے بھی چل سکتا ہے۔

نہ دادا میں یہ کام نہیں کرتی۔

اپنے مرد کے ساتھ بھی نہیں کرتی۔

اس کے ساتھ تو کرتی ہوں۔ لیکن وہ تو میرا اپنا مرد ہے۔

اس نے اپنی ڈب سے ایک چھرا نکال لیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر کہنے لگا۔ سالا چلو ہمارے ساتھ ۔ ورنہ اسی وقت کھڑے کھڑے پیٹ چاک کر دوں

گا۔ میں ڈر کے مارے سہم گئی اور وہ مجھے اندر باورچی خانے کی طرف گھسیٹنے لگ گیا۔ اتنے میں میری ماں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ بڑے غصے سے اس نے کہا۔

جگو چھوڑ دو اس لونڈیا کو۔ اگر منہ ہی کالا کرنا ہے تو میرے پاس آ جاؤ۔

واہ رے میم صاحب۔ جب روج منتیں کر کے مجھے اڈے سے لاتی ہو اس وخت تمہرا منہ کالا ہو تا ہے جو آج میرا ہو رہا ہے۔

نہیں جگو اسے چھوڑ دو۔ چلو تم اندر میرے پاس۔

نہیں میم صاحب۔ یہ چھوکری سالا ایک دم اول نمبر ہے۔ اسے میں چھوڑ کر سینکڑوں اوباشوں کی برتی ہوئی بڑھیا کو کیا کروں گا۔ میں تو تمہارے پاس محض دارو کے لئے جب پیسے چاہئے ہوتے ہیں تو تب آتا ہوں۔ ورنہ کون کافر مجے کے لئے آتا ہے۔

جگو مجھ سے آج زیادہ پیسے لے لینا۔

اچھا میم صاحب مجھے اپنا موج میلہ کر لینے دو۔ اس سے فارغ ہو کر تمہیں بھی بھگتا دوں گا۔

جگو اس طرح مجھے گھسیٹتے ہوئے باورچی خانے میں لے آیا۔ جلدی سے فراغت پا کر میری ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ شام کے چار بج چکے ہیں۔ اور اب تک اس کے پاس ہے۔

اب تم ہی مجھے بتاؤ وہ دیش جس میں میرے ماں باپ رہتے ہیں۔ اس کے باسیوں نے اپنی مہمان بیٹی سے اس سرزمیں پر قدم رکھتے ہی جو سلوک کیا ہے یہ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ابھی آگے نہ جانے اور کیا گل کھلیں گے۔ اور میں نے ابھی کتنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں جگو جیسے داداؤں کی مشق ستم بننا ہے۔ بمبئی جنس اور جرائم کا ایک ایسا بحر ذخار ہے۔ کہ اگر ایک آدمی ایک جگہ سے کوئی واردات کر کے ساتھ والے علاقے میں چلا جائے تو پچھلے جرائم کی گرفت سے وہ دور چلا جاتا ہے۔ پھر اس کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

میں اس لئے انڈیا نہ آنا چاہتی تھی۔ یہاں اگر ایک دفعہ کسی عورت کا پاؤں پھسل جائے تو پھر وہ زندگی بھر نہیں سنبھل سکتی۔ پہلے سے زیادہ پستیوں میں گرتی چلی جاتی ہے۔ کم از کم پاکستان میں ایسے حالات سے تو دوچار ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن

تم مانتے ہی نہ تھے۔

تمہارا کہنا میں ٹال نہ سکتی تھی۔ ورنہ یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے تھا۔ یہ جو یہاں ماحول ہے اور جو واقعات یہاں رونما ہوتے ہیں یا جن سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے آپ لوگ انہیں ناقابل یقین ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن بخدا آپ یقین جانئے یہ بعینہٖ سب کچھ اسی طرح وقوع پذیر ہوا ہے۔ بمبئی جرائم پیشہ افراد کی جنت ہے۔ یہاں آئے دن قتل و غارت اور عورتوں کی عصمت دری کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور لوگ انہیں معمول کی بات سمجھتے ہیں۔

اور کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا۔

ماں کے پاس میں قطعاً رہنے کے لئے نہیں آئی۔ اگر مجھے اپنے باپ کے متعلق پتہ ہوتا کہ وہ زندہ ہیں تو میں یہاں سے سیدھی لکھنؤ چلی جاتی اس کے پاس محض یہ پتہ کرنے کے لئے آئی ہوں کہ باپ زندہ ہے یا مرگیا ہے۔ ماں کو میرا آنا کتنا ناگوار گزرا ہے۔ کوئی ماں اپنے بچوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کر سکتی ہے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایسی ماؤں کی ممتا کیوں مرجاتی ہے۔ اور کیوں وہ پتھر دل ہو جاتی ہیں۔ میری ماں تو جنس کی دیوانی ہے۔ جہاں اس کی اپنی جنس آسودگی کا سوال ہو میں سمجھتی ہوں اپنے بچوں کی لاشوں کو روندتی ہوئی بھی آسودگی کے حصول سے گریز نہیں کرے گی۔

میں اب چٹھی بند کرتی ہوں۔ یہ سامنے سڑک پر لیٹر بکس ہے۔ وہاں جلد ہی سے یہ خط تمہیں پوسٹ کرنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے میری ماں اپنے نئے گیسٹ جگو دادا سے فارغ ہو کر اب باہر آنے ہی والی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ جگو کو فارغ کر کے سیدھی میرے ساتھ تیسری جنگ عظیم لڑنے کے لئے تیار ہو گی۔ اور کوئی بعید نہیں کہ وہ مجھے دھکے دے کر آج ہی اپنے اس اڈے سے نکال دے۔ تاکہ اس کے آنے والے مہمانوں کے لیے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ بنوں۔

اگر میں لکھنؤ گئی تو تمہیں راستے ہی سے خط لکھ دوں گی۔ اگر ماں نے مجھے بتا دیا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے تو پھر میں یہاں ہی سے واپس پاکستان آ جاؤں گی۔ بہت ممکن ہے کہ میں پنڈی واپس جانے سے پہلے تمہارے پاس ڈھاکا ہفتے دو ہفتے کے لئے آ جاؤں۔ تاکہ ذہن پر جو بوجھ ہے وہ دور ہو جائے۔

خدا حافظ۔

تمہاری حنا۔۔۔۔۔۔!!!

حنا کا خط بڑا طویل اور مفصل تھا۔ میں خط پڑھ رہا تھا تو میرے انہماک کو دیکھ کر بہت سے لوگ میرے دفتر کے دروازے سے پلٹ جاتے۔ میں سوچنے لگا۔ حنا بے چاری کو میں نے جیتے جی اس دہکتے ہوئے جہنم میں دھکیلا ہے۔ وہ تو بار بار کہتی تھی۔ احمد میں انڈیا واپس نہیں جانا چاہتی۔ وہاں کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے میری ماں کو میرے ساتھ کوئی محبت نہیں ہے۔ میری قربت اور موجودگی کو وہ اپنے افیئرز میں مداخلت سمجھتی ہے۔ جو دادا لوگ اس کے تعاقب میں وہاں آتے ہیں وہ حنا کو دیکھ کر اس کی ماں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس بے چاری مظلوم اور بے یارو مددگار خاتون کی جی بھر کر عصمت دری کرتے ہیں۔ اور جاتے وقت اس سے باقاعدگی سے دارو کے لئے پیسے بھی بٹور لے جاتے ہیں۔

میں دفتر میں بیٹھا خیالات کے اس بھنور میں ڈوبا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ وقت کب آئے گا۔ جب انسان' انسان کی عزت کرے گا۔ ابھی تک تو یہ کچلا ہوا انسان اپنی عزت بچانے کا بھی اہل نہیں۔ ہمارے پاکستان میں حالات ایسے نہیں ہیں۔ ہم غریب ہیں لیکن ہمارے جسم معاشرتی برائیوں کے کوڑھ سے بھرے ہوئے نہیں ہیں۔ ہماری روح ان جنسی بے راہرویوں سے آلودہ نہیں ہے۔ میں انہی خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے ریڈیو سٹیشن سے ظل الرحمن کا ٹیلی فون آگیا۔

جناب میں احمد بول رہا ہوں۔

احمد میں ظل الرحمن ہوں۔ تمہارا آج شام ریڈیو پر پروگرام ہے یا نہیں۔

یہ تمہیں پتہ ہونا چاہیئے۔ تم اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو۔ مجھ سے پوچھتے ہو۔

وہ تو میں پتہ کرلیتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے تمہیں ٹیلی فون کرنا ہی تھا۔

کیوں خیریت۔

خیریت ہی ہے بھائی۔ تمہارا ایک حسین مہمان، تمہاری تلاش میں یہاں آ پہنچا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ تمہیں اطلاع بھی کر دوں اور پوچھ بھی لوں کہ تم شام کو آ رہے ہو یا نہیں۔

کیا نام ہے ان کا۔

پوچھ کر بتاتا ہوں۔

عجیب بدھو ہو۔ ابھی تک نام ہی نہیں پوچھا۔

بھئی نام ۔ ہے ۔ ان کا۔۔۔۔۔ مس شائستہ۔۔۔۔!!!

ارے مارا گیا۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

کیوں بیٹے ابھی سے کیوں گھبرا گئے ہو۔ تم شام کو آ رہے ہو نا۔ ٹھیک ہے میں ان کو بتا دیتا ہوں سات بجے آپ کو یہاں ہی ملیں گی۔ اور تمہارے اچھی طرح کان کھینچیں گی۔

یار ظلو ۔ اسے چلتا کرو۔

کیوں ابھی سے جان چھڑانے کی ٹھان لی ہے۔

اچھا ظلو میں تھوڑا سویرے آ جاؤں گا اور تم سے کھل کر بات کروں گا۔ آج تم کسی طریقے سے اسے ٹال دو۔

بیٹے میں نے اسے یہاں سے ٹالا تو یہ محترمہ کرمی ٹولہ آ جائیں گی۔ اور تمہاری وہاں زیادہ سبکی ہو گی۔

ہاں یہ بات تو ہے۔۔ وہ تمہارے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔

وہ میرے دفتر میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں کلیم صاحب کے دفتر سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔

یار ظلو ۔ یہ لڑکی مجھے کچھ پاگل لگتی ہے۔ اگر ایک دفعہ یہ میرے قریب ہو گئی تو پھر مجھے یہ نہ چھوڑے گی۔ اور پھر بڑی رسوائی ہو گی۔

میں نے سنا ہے تم لاہور سے بھی کسی ایسے ہی چکر میں پوسٹ ہوئے ہو۔

صحیح ہے۔

یار احمد لڑکیوں کے متعلق تمہارے رویوں کا رد عمل تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے اور وہ رد عمل پڑھ صرف لڑکیاں سکتی ہیں۔ بیٹے راجہ اندر بنے ہوئے ہو۔ اور کیا چاہئے میں تمہارے کمانڈنگ آفیسر سے کہہ کر تمہارا ریڈیو سٹیشن آنا جانا بند کرواتا ہوں۔

وہ کیوں۔

وہ اس لئے جناب کہ کل اگر آپ ریڈیو سٹیشن سے کسی لڑکی کو بھگا کر لے جائیں تو ہم مفت میں لٹکے نہ پھریں

اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو پھانسی تمہارے ہی گلے میں پڑے گی۔

لو وہ ادھر ہی آ رہی ہے۔ اور پھر ظلو نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

اس شام فورسز پروگرام میں میں نے اردو میں خبریں پڑھنی تھیں۔ اس لئے وقت سے ذرا پہلے ریڈیو سٹیشن آ گیا۔ گیٹ سے داخل ہو ہی رہا تھا کہ پاس ہی کھڑی ہوئی کار سے کسی نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مس شائستہ تھی۔ اس نے گاڑی کو ریڈیو سٹیشن سے باہر سڑک کے کنارے کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر نکل کر اسے لاک کر دیا۔ اور میرے ساتھ ریڈیو سٹیشن میں آ گئی۔ میں اسے سیدھا ظل الرحمن کے کمرے میں لے گیا۔ ظلو نے اٹھ کر ہم دونو کی بڑے اچھے طریقے سے پذیرائی کی۔ دو چار منٹ کے بعد میں نے شائستہ سے کہا۔

تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں نے جو خبریں پڑھنی ہیں ان کا سکرپٹ میں دیکھ لوں۔

تم کتنے بجے یہاں سے فارغ ہو گے۔ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

میرا ایک پروگرام سات بجے ہے۔ دوسرا نو بجے۔ سوا نو بجے فارغ ہو جاؤں گا۔ پھر آخری بس سے چلا جاؤں گا۔ اگر اس بس سے رہ گیا تو رات کہیں فٹ پاتھ پر گزارنا پڑے گی۔

ہمارے گھر چلے آنا۔

نہیں مس شائستہ۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے گھر والے برا مانیں گے۔

کیوں انہیں کیا تکلیف ہو گی۔ میں ریڈیو سٹیشن رک جاتی ہوں۔ جب تم ادھر سے فارغ ہو گے تو میں تمہیں گاڑی میں اپنے گھر لے جاؤں گی۔

نہیں شائستہ مجھے صبح سویرے دفتر جانا ہوتا ہے۔ میرا ار دلی بیچارہ رات بھر میرا انتظار کرتے کرتے تھک جائے گا اور مفت میں پریشان ہو گا۔

چلو میں چار بجے صبح تمہیں گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ آؤں گی۔

تو صبح کے چار بجے تک میں کہاں رہوں گا۔

میرے کمرے میں رہیں گے۔ اور کہاں رہیں گے۔ آپ یقین کیجئے آپ کو کسی قسم کی کوئی کوفت نہیں ہو گی۔

اگر نواب صاحب یا سعید تمہارے کمرے کی طرف آ گئے اور مجھے تمہارے ہاں رات کی تنہائی میں وہاں دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔

وہ کیا کہیں گے۔ وہ کون ہوتے ہیں مجھ پر چیک لگانے والے۔

پھر بھی آپ کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ آپ پر ہر طرح کی نظر رکھیں۔

نہیں میں کسی کی چیکنگ برداشت نہیں کر سکتی۔ اور دوسرا ہمارے ہاں یہ رواج بھی نہیں۔ کوئی کسی کے افیئرز میں مداخلت نہیں کرتا۔ بھائی جان کی دو گرل فرینڈز ہیں۔ وہ مہینے میں ایک دو دفعہ باری باری سے ہمارے گیسٹ ہاؤس میں راتیں گزارتی ہیں۔ بھائی کا ایک دور کا رشتہ دار ہے۔ وہ تو رات کو رہتا ہی بھابھی کے کمرے میں ہے۔ اور تو اور سعید بھی کبھی کبھار کسی ہم جماعت لڑکی کو ساتھ لے آتا ہے۔ ہم لوگوں کی یہ عادت نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ٹوہ نہیں لگاتے۔

لیکن شائستہ میں تو ایسا نہیں کر سکوں گا۔ میں آوارہ آدمی تو نہیں ہوں کہ لوگوں کی بہو بیٹیوں کی تاک میں رہوں اور جب بھی موقعہ ملے ان کی عصمت دری کروں۔ محترمہ میں مسلمان ہوں ۔ نماز ' روزے کا پابند ہوں۔ سب ممنوعات سے سختی سے پرہیز کرتا ہوں۔ میں نے آج تک کسی غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلقات استوار نہیں کیے۔ اللہ پاک مجھے آئندہ کے لئے بھی اس سے بچائے۔ میں بہت کمزور آدمی ہوں۔ وہی میری مدد فرمائے۔

چلئے چھوڑیئے۔۔ اس لمبی چوڑی تقریر کو۔ پروگرام کے بعد گلستان میں کھانا کھائیں گے۔ پھر میں آپ کو کرمی ٹولہ چھوڑ آؤں گی۔

نہیں شائستہ اتنی تکلیف آپ نہ کریں کھانا میں ہمیشہ واپس جاکر کھاتا ہوں۔ آج بھی کھانا میرے لئے رکھا ہوگا۔

کسی دن آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں آپ سے تفصیل سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

نہیں شائستہ ایسی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اور پھر غیر عورتوں سے ملنا ویسے بھی شریعت میں منع ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

وہ کیوں۔

اس سے بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

تم یقین جانو۔ ہم برائی کے راستے پر نہیں چلیں گے۔

نہیں شائستہ میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔

آپ کو اس میں کوئی تکلیف ہے۔

شائستہ خدا کے لئے اس ٹاپک کو بند کیجئے۔ میں غیر عورتوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

شائستہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر کھڑی ہوگئی۔ اور مجھے بڑی غضب ناک نظروں سے گھورتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں اپنا سکرپٹ لے کر حیرت صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ریہرسل کیا کرنا تھی۔ محترمہ سے گلو خلاصی کروانا مقصود تھا۔ میں وہاں بیٹھا حیرت صاحب سے شعر سنتا رہا۔ پروگرام سے دو منٹ پہلے اٹھ کر اپنے سٹوڈیو میں چلا گیا۔ خبریں پڑھ کر باہر آیا تو ظل الرحمن مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر میں لے گیا۔ چائے پلائی پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔

یار اس پاگل لڑکی کو تم نے کیا کہا ہے۔

کون سی پاگل لڑکی۔

وہی شائستہ۔

کیوں اس نے تم سے میری شکایت کی ہے۔

جی ہاں۔

کیا شکایت کی ہے۔

کہنے لگی۔ دیکھئے ناظل الرحمن صاحب احمد نے میرے ساتھ مس بی ہیو (MIS-BEHAVE) کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا مس بی ہیو کیا ہے۔ کوئی دست درازی کی ہے۔

نہیں۔ میرے ساتھ بڑی سرد مہری سے پیش آیا ہے۔ میں نے گھر چلنے کی دعوت دی تو وہ اس نے نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دی ہے۔

یار ظلو میں فوجی آدمی ہوں۔ بارہا اس طرح کے زخم کھا چکا ہوں۔ بڑا نقصان اٹھایا ہے اب ادھر میرا جو پوسٹنگ ہوا ہے یہ بھی اس طرح کی ایک محبت کا شاخسانہ ہے۔ بھیا میں نے ان لڑکیوں سے نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا۔ مفت کی بلا اپنے سر کیوں ڈالوں۔ پھر ساتھیوں اور دوستوں میں ذلت اور رسوائی الگ۔ گھر میں عزیز و اقارب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اسے ملنے کا موقع مت فراہم کرو۔ ویسے بھی یہ کچھ کچھ پاگل ہے صحت مند لڑکی نہیں ہے۔

سچ پاگل ہے۔

میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ اس کے بھائی نے ابھی چھ ماہ ہوئے ہیں ایک بہت بڑے جاگیردار کے ساتھ لاکھوں روپے لگا کر اس کی شادی کی ہے۔ یہ محترمہ وہاں ایک ماہ یا ڈیڑھ ماہ رہی ہیں۔ طلاق لے کر آگئی ہیں۔ سعید نے مجھے بتایا ہے کہ فی الواقعہ شائستہ کو پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اس کے عجیب کمپلیکس ہیں۔ تم اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرنا۔ تمہارے کمانڈنگ آفیسر کو میں جانتا ہوں وہ بڑا سخت آدمی ہے اس کے رگڑے سے بچنا۔

یار ظلو میں ڈر رہا ہوں۔ یہ کمبخت کہیں میرے تعاقب میں کرمی ٹولہ نہ آجائے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔

بیٹے مجھے یقین ہے وہ آج کل میں ضرور وہاں پہنچے گی۔

میں گیٹ پر متعین سنتریوں کو کہہ دوں گا کہ اگر مجھ سے ملنے کے لئے کوئی خاتون آئے تو یونٹ لائنز میں اسے داخل نہ ہونے دینا۔ ویسے بھی یہ قانوناً منع ہے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے تم اللہ یار خان سے بھی کہنا کہ وہ کسی عورت کو کوارٹر

میں نہ گھسنے دے۔

اللہ یار خان کو پتہ چلے گا تو مجھ سے بھی لڑائی کرے گا۔ وہ لاہور والی سوہنی کڑی سے بھی الرجک تھا۔

میں ریڈیو پروگرام کر کے ظل الرحمن کے ساتھ اس کے گھر تیج گاؤں آ گیا۔ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھایا۔ کافی دیر تک شائستہ ہی کی باتیں کرتے رہے۔ ظلو کی بیگم بھی اس سے واقف تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

احمد بھائی آپ یہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ لڑکی نارمل نہیں ہے۔ پروورٹ لڑکی ہے۔ کیوں مفت میں بدنام ہوتے ہو۔

آپا۔۔۔ وہ تو زبردستی میرے گلے پڑ گئی ہے میں تو اس سے جان چھڑاتا ہوں۔

یہ ہر نووارد پر اسی طرح اٹیمپٹ کرتی ہے۔ ظلو کے پیچھے بھی کچھ عرصہ پڑی رہی۔ آخر ایک دن اس کے پیچھے یہاں آ گئی۔ میں نے اس دن اس کی خوب خبر لی اس کے بھائی نواب صاحب کو بھی ٹیلی فون کیا۔ وہ کہنے لگا بیگم صاحبہ اس لڑکی نے مجھے پورے ڈھاکہ میں بے عزت کر دیا ہے۔ میں کیا کروں۔

میں نے کہا نواب صاحب کوئی موزوں سا رشتہ دیکھ کر اس کی دوبارہ شادی کر دیجئے۔

بیگم صاحبہ میں تو دعائیں مانگتا ہوں کہ یہ اپنا کوئی گھر گھاٹ بنا لے لیکن مجھے یقین ہے کہ جس اچھے سے اچھے آدمی کے ساتھ بھی یہ شادی کرے گی۔ اس کمبخت کا چند ہی دن میں اس سے بھی جی بھر جائے گا۔ اور پھر اس سے بھی طلاق لے کر آ جائے گی۔

یار احمد یہ تمہاری کیسے واقف ہوئی۔

ظلو بھائی۔ وہ سعید لڑکا نہیں ہے جو میوزک کے پروگرام کرتا ہے۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ ایک دن مجھے اپنے گھر کھانے پر لے گیا۔ محترمہ سے وہاں ہی ملاقات ہوئی۔ اس مختصر سی ملاقات میں سب فیملی ممبران کے سامنے وہ سب باتیں مجھ سے طے کرنے لگی۔ جو شادی کے موقعہ پر فریقین طے کرتے ہیں۔

بیٹے اچھا ہے شادی کر لو۔ لاکھوں روپے کا سامان فلیٹ ' زمیں اور کروڑ ہا روپے محترمہ کے نام بینک میں جمع ہیں۔

میرے کس کام کے ۔ میری قسمت میں تو وہی خاکی وردی اور فوجی لنگر کی دال ہے۔

ارے تم اس کو کہو کہ آدھی رقم اور پراپرٹی میرے نام ٹرانسفر کردو۔ تو میں تمہارے ساتھ شادی کر لیتا ہوں۔

گولی مارو ان سب چیزوں کو۔ بھائی کیوں زندگی اجیرن کرتے ہو۔ بیگم ظل الرحمن نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

نہیں آپا۔ میں کوئی پاگل ہوں۔ ظلو کا تو الٹا دماغ ہے۔ اسے ہی وہ لڑکی پسند ہے۔ آپ سے ڈر کے مارے نام نہیں لیتے۔

میں نے وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے ظلو کو کہا۔

ظلو بھائی بہت دیر ہو گئی ہے۔ صبح سویرے مجھے دفتر بھی جانا ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو تند خو کرنل سے پھر جھڑپ ہو جائے گی۔

اچھا بابا۔۔۔ اٹھتا ہوں۔ تم دونو نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔

ظل الرحمن مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر کرمی ٹولہ چھوڑ گیا۔ ابھی سردست لڑائی کا ایک اور مرحلہ باقی تھا۔

یہ مرحلہ تھا اللہ یار خان کے پاس پہنچنے کا۔ ظل الرحمن نے میرے کوارٹر کے سامنے جا کر گاڑی کھڑی کی اور ہارن دیا۔ اللہ یار خان فوراً دروازے پر آیا۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ سید صاحب کو جانتا تھا۔ ان سے مصافحہ کیا اور ان سے کہنے لگا۔

شاہ جی ۔۔۔ بادشاہو ہمارے صاحب کو کہاں لے گئے تھے۔ یہاں قیامت آئی ہوئی ہے۔

کیوں اللہ یار خان خیریت تو ہے۔

صاحب جی خیریت کہاں ہے۔ شام سات بجے سے کرنل صاحب دفتر میں آئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دفتر اردلی ہمارے صاحب کا پتہ کرنے کے لئے آتا ہے۔

وہ کیوں ظل الرحمن نے پوچھا۔

شاہ جی۔۔ کرنل صاحب کو ایک سیکرٹ فائل کی ضرورت ہے۔ وہ اس وقت سے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو دفعہ تو صوبیدار میجر صاحب آ چکے ہیں۔ دفتر کی چابیاں لینے۔ لیکن میں نے ان کو کہا کہ سر۔ چابیاں میرے پاس نہیں ہیں۔

ارے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ یار خان۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں نے اللہ یار خان کی دھیر بندھاتے ہوئے کہا۔

میں ابھی تک گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ظل الرحمن سے کہا۔

ظلو گاڑی موڑو اور تم مجھے میرے دفتر کے سامنے والی سڑک پر ڈراپ کر کے واپس چلے جاؤ۔

بیٹے تمہاری گت بنتے نہ دیکھوں۔

ارے یار مذاق مت کرو۔

گاڑی ظل الرحمن نے دفتر کے سامنے والی سڑک پر روکی۔ میں جب نیچے اترا تو میں نے دیکھا کہ دفتر کے باہر لان میں کرنل اور صوبیدار میجر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کرنل نے دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

لاٹ صاحب تم اس وقت تک کہاں تھے۔

سر میں ریڈیو پروگرام کرنے گیا تھا۔

کتنے بجے ہوتا ہے تمہارا پروگرام۔

سات بجے۔

اب کیا ٹائم ہے۔

ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔

بہتر ہے تم فوج کی ملازمت چھوڑ کر ریڈیو پاکستان جائن کر لو۔

کیوں سر۔۔!!

بھئی۔ جنرل صاحب نے ٹیلی فون کیا تھا۔ وہ وائرلیس سٹیشن کا کیس انہوں نے شام کو منگوایا تھا جی ایچ کیو کی کسی میٹنگ میں شامل ہونے کے لئے صبح سویرے پہلی فلائٹ سے پنڈی جانا ہے۔ یہ کیس ان کو چاہئے تھا۔ وہ دو تین دفعہ مجھے پھر ٹیلی فون کر

چکے ہیں۔ تم ہو کہ گانے بجانے والوں کے پیچھے پھر رہے ہو۔

سر مجھے کیا خبر کہ آپ کو وہ فائل چاہئے تھی۔

میاں میں نے دو تین دفعہ تمہارے لئے ریڈیو سٹیشن پر بھی ٹیلی فون کئے۔ لیکن ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ تم وہاں سے ساڑھے سات بجے سید ظل الرحمن کے ساتھ چلے گئے ہو۔ اچھا چھوڑو اس قصے کو وہ فائل جلدی نکال کے لاؤ۔

میں اپنے دفتر میں گیا۔ بے چارے سب کلرک مصیبت میں گرفتار سہمے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سیکرٹ فائلوں کی الماری کھولی اور وہ فائل نکال کر کرنل کو دے دی۔ جو اس وقت تک میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے فائل کھول کر دیکھی۔ پھر وہاں سے ہی جنرل صاحب کی رہائش گاہ پر ٹیلی فون کیا۔ اور ان کے اے ڈی سی کو بتا دیا کہ فائل مل گئی ہے۔ میں ابھی لا رہا ہوں۔

اے ڈی سی ہمارے کرنل سے کہنے لگا۔ سر۔۔ جنرل صاحب سے آپ بات کریں۔

ہیلو۔۔ نیاز۔ فائل مل گئی ہے۔

سر۔۔ مل گئی ہے۔

کہاں سے ملی ہے۔

سر۔ ہیڈ کلرک کی کسٹڈی میں تھی۔

پہلے کیوں نہیں ملتی تھی۔

سر۔ وہ ہیڈ کلرک یہاں تھا نہیں۔

کہاں تھا۔۔

سر۔ وہ ریڈیو پاکستان سے فورسز پروگرام کرتا ہے۔ ادھر گیا ہوا تھا۔

اچھا۔۔ وہ احمد صاحب۔

تو بھئی تم مجھے پہلے بتا دیتے اور ان کے پیچھے صوبیدار میجر کو گاڑی دے کر بھیج دیتے کہ وہ ان کو لے آتے۔

سر میں نے خود ریڈیو سٹیشن ٹیلی فون کیا تھا۔ ڈیوٹی آفیسر نے بتایا کہ احمد صاحب ساڑھے سات بجے پروگرام کر کے واپس چلے گئے ہیں۔ سر۔۔ ساڑھے سات اور

اب ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ یہ اب واپس آیا ہے۔

نیاز تمہیں پتہ ہے۔ شہر یہاں سے کم از کم بیس میل دور ہے۔ اس وقت ٹرانسپورٹ نہیں ملتی۔ آپ لوگوں جہاں جاتے ہیں۔ سرکاری گاڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بیچارے JCOS اور ORS میلوں پیدل چلتے رہتے ہیں۔ آپ دوسروں کی تکلیف کا بھی تو خیال کیا کریں۔ میں احمد صاحب کو جانتا ہوں۔ یہ بہت ہی بھلے مانس اور لائق جے سی او ہے۔ ہم لوگوں کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ یہ فورسز پروگرام اتنی عمدگی سے کر رہے ہیں۔ ورنہ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ والے پہلے تو مانتے ہی نہ تھے کہ ہمارے پاس کوئی اردو کا سکرپٹ رائٹر اور اناؤنسر نہیں ہے۔ یہ کام احمد صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ ہم ان کو کوئی فالتو تنخواہ دیتے ہیں۔ ریڈیو والوں سے جو تھوڑے بہت پیسے ان کو ملتے یہ اسی پر ہی راضی ہیں۔

اب آپ ایسا کریں۔ فوراً فائل لے کر آجائیں۔ اور ہاں۔ احمد صاحب کو مزید کچھ نہ کہیں۔

بہت اچھا سر۔

کرنل نیاز فائل لے کر چلا گیا۔ اور میں نے اپنے سب کلرکوں سے معذرت چاہی۔ کہ بھئی میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔ میری اس تھوڑی سی بات سے وہ سب خوش ہو گئے۔ اور سب ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ میں اپنے کوارٹر میں واپس آیا تو لوہے کا بنا ہوا وہ انسان۔ اللہ یار خان بدستو۔ میرے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

میں ڈرتا ڈرتا کوارٹر میں داخل ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کرنل نیاز سے تو جنرل صاحب نے میری جان بخشی کروا دی ہے۔ اب اللہ یار خان سے مجھے کون چھڑائے گا۔ میں قریب گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے لباس تبدیل کیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا۔ کہ وہ کھانا گرم کر کے لے آیا۔

نہیں اللہ یار خان میں کھانا تو کھا آیا ہوں۔ بہت شکریہ آپ کا۔

کہاں گلستان سے کھایا ہے۔

نہیں۔ ظل الرحمن صاحب کے گھر کھایا ہے۔

اللہ یار خان کوئی سرزنش کئے بغیر برتن اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
بڑی دیر تک مجھے نیند نہ آئی رہ رہ کر کرنل کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں سوچتا خدا بھلا کرے جنرل صاحب کا کہ انہوں نے اس نیک بخت کرنل کو کچھ ٹھنڈا کیا ہے۔ ورنہ کل صبح سویرے تھرڈ ورلڈ وار پھر شروع ہو جاتی۔ اس میں کرنل کا کیا نقصان ہوتا۔ سراسر میرا ہی نقصان تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں محو میں حسین خوابوں کے بھنور میں ڈوب گیا۔ صبح سویرے اللہ یار خان نے آکر جگایا۔ نماز پڑھی۔ چائے پی۔ کچھ طبیعت بحال ہوئی۔

ناشتہ کر کے یونیفارم پہنی اور دفتر چلا گیا۔ میں دفتر پہنچا تو سب کلرک اور ایڈجوٹینٹ پہلے سے دفتر میں موجود تھے۔ حالانکہ ابھی دفتری اوقات شروع ہونے میں تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ ایڈجوٹینٹ اور دفتر کا پورا عملہ آج کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ دفتر میں نہ جانے آج کیوں مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے جب کبھی میں وقت سے پہلے دفتر پہنچ جاتا تو وہاں اچھا خاصا ہڑبونگ دیکھتا۔ اونچے اونچے قہقہے لگ رہے ہوتے۔ آج میں دفتر میں داخل ہوا تو سب پر مایوسی اور دل شکستگی کے آثار چھائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایڈجوٹینٹ فوراً میرے دفتر میں آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

سر خیریت تو ہے۔ تیسری جنگ عظیم تو نہیں لگ گئی۔

نہیں صاحب لگی نہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد لگ جائے گی۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

ابھی کرنل صاحب آئیں گے تو سب کو مطلب سمجھ آ جائے گا۔

بات کیا ہے آخر مجھے کچھ تو بتائیں۔

وہی گزشتہ رات والی بات ہے کرنل صاحب رات کو جاتے وقت مجھ سے کہہ کر گئے ہیں میں کل تم لوگوں کو فکس اپ کروں گا۔ ہم سب کرنل صاحب کے اسی وارننگ سے گھبرائے ہوئے ہیں۔

سر اس میں آپ لوگوں کو گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔

صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کرنل صاحب رات کو بڑے غصے میں تھے۔ خدا خیر کرے۔ اور کسی کو اگر کچھ بھی نہ کہا تو مجھے اور آپ کو تو نہیں بخشیں گے۔

سر اس قصور سے آپ سب لوگ تو مبرا ہیں۔ یہ فائل میری کسٹڈی

ہیں تھی۔ آپ لوگوں کا اس میں کیا قصور ہے۔

صاحب یہ بات تو ہم کرنل صاحب سے نہیں کہہ سکتے۔

کیوں آپ سچی بات نہیں کہہ سکتے۔

صاحب اگر کرنل صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے اور میری اے سی آر خراب کر دی تو میں تو مارا گیا۔ میرا پروموشن ڈیو ہے۔ مجھے تو ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔

سر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں جگہ نہ دیا کریں۔

احمد صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں میجر بننے والا ہوں۔ اگر میرا پروموشن رک گیا تو مجھے کتنا نقصان ہو گا۔ آپ اسے چھوٹی بات کہتے ہیں۔ میری تمام زندگی کا اس پر انحصار ہے۔

کیپٹن صاحب اگر میں اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال کرتا۔ اور انہیں آپ لوگوں کی طرح زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتا تو میں اب تک بریگیڈیئر ہوتا۔ کچنر کالج نوگانگ سے میرے سب ساتھی کمیشن لے کر اب بریگیڈیئر ہیں۔

دفتر اردلی دوڑتا ہوا آیا۔ ایڈجوٹینٹ کو سیلوٹ کیا اور اطلاع دی۔ "سر کرنل صاحب آ گئے ہیں۔" ایڈجوٹینٹ وہ بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے پلٹ کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر مین آفس میں گیا۔ سب کلرک اپنی سیٹوں پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے سب کو حوصلہ دیا۔ کسی کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔

اس بات کے لئے میں ذمہ دار ہوں۔ تم میں سے کسی پر بھی کوئی بر ڈن نہیں ہے۔ یہ ساری ذمہ داری میری اور ایڈجوٹینٹ کی تھی۔ تم لوگ مفت میں پریشان ہو رہے ہو۔

میں نے وہاں سے ہی کینٹین منیجر کو ٹیلی فون کیا کہ مین آفس میں پندرہ چائے اور پندرہ سموسے میرے اکاؤنٹ سے بھیجو۔ دس منٹ کے بعد چائے اور سموسے آ گئے۔ فضا خوشگوار ہو گئی۔ قہقہوں کی آواز گونجی تو وہ تند خو کرنل اپنے دفتر سے نکل کر مین آفس میں آ گیا۔ سب لوگ اسے دیکھ کر سہم گئے۔ اس نے اپنی آواز میں گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

احمد یہ سب کیا ہو رہا ہے........؟

سر ان لڑکوں کو گزشتہ رات میری وجہ سے بادریشن ہوئی ہے۔ تو ان کا ذرا مورال ہائی کر رہا ہوں۔

صاحب آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ (وہ ایک دم فرعونیت کو تج کر ایک عام آدمی کی سطح پر آ گیا۔) سب سے زیادہ بادریشن تو مجھے ہوئی ہے۔ اور مجھے آپ نے بلایا ہی نہیں۔ سب حاضرین دم بخود ہو کر کرنل صاحب کو دیکھنے لگ گئے۔

سر آئیں ناں آپ بھی ان لڑکوں کی خوشی میں شامل ہوں۔ میں نے فوجی آداب سے ہٹ کر یہ بات کی۔

ہاں ۔ ہاں بھئی ضرور۔ اور وہ نیک بخت کرنل وہاں ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ایک کلرک کرسی اٹھا کر لے آیا۔ لیکن وہ کہنے لگے۔ کرسی بھئی احمد صاحب کو دو۔ کینٹین کے بیرے نے ان کو چائے اور بسکٹ لا کر دیئے۔ وہ کہنے لگے۔

ارے میاں مجھے بھی ایک گرم گرم سموسہ لا کر دو۔ اور پھر بیرے نے ایک پلیٹ میں رکھ کر ان کو دو سموسے دیئے۔

احمد صاحب ایڈجوٹنٹ کو بھی بلوائیے۔۔ کرنل نے مجھ سے کہا۔

بہتر سر۔ میں نے انٹر کام سیٹ پر ان کو کہا اور وہ فوراً آ گئے۔

سب لوگ چائے پیتے رہے اور خوش گپیوں میں مشغول رہے۔ جب چائے کے بعد ڈسپرس ہونے لگے تو کرنل نے کینٹین کے بیرے کو کہا۔ کہ کینٹین منیجر کو کہنا کہ یہ پیسے میرے اکاؤنٹ میں لکھ دے۔ بیرا کہنے لگا۔

نہیں سر۔ یہ تو احمد صاحب کا آرڈر تھا۔

جس کا بھی آرڈر تھا پیسے تم میرے حساب میں لکھوانا۔

اچھا سر۔۔۔۔!!

بڑے خوش گوار ماحول میں یہ انفارمل پارٹی اختتام پذیر ہوئی۔ کرنل اور ایڈجوٹنٹ اپنے اپنے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے۔ کوئی زیادہ وقت نہ گزرا ہو گا کہ کرنل نے مجھے بلایا۔

صاحب آپ کو روز شام کو ریڈیو پروگرامز کے لئے جانا پڑتا ہے۔ سیکرٹ

فائلوں کی الماری کی چابی آپ یارو (میرے اردلی اللہ یار خان کو وہ یارو کہتا تھا) کو دے جایا کریں تاکہ اگر کل کی طرح کی سچوایشن ہو جائے تو ہم چابی منگوا سکیں۔

سر- چابی تو اللہ یار خان کے پاس ہوتی ہے۔

کل صوبیدار میجر صاحب گئے تھے اس کے پاس تو اس نے کہا کہ سر میرے پاس چابی نہیں ہے۔

سر- اور تو اور اگر آپ بھی چابی لینے جائیں تو وہ آپ کو نہیں دے گا۔

وہ کیوں۔

جب تک میں اسے نہیں کہوں گا۔ وہ میرے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو چابی نہیں دے گا۔

تو اب آپ اسے کہہ کر جایا کریں۔

سر- چونکہ سیکرٹ ڈاکومنٹ اس الماری میں ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ ایسا کریں کہ اگر آپ کو چابی کی ضرورت پڑ جائے تو آپ آدمی بھیج کر اللہ یار خان کو اپنے پاس بلوا لیا کریں۔ وہ چابی آپ کے ہاتھ میں دے دے گا۔ پھر جب کام ختم ہو جائے تو چابی آپ اس کو بلا کر دیا کریں۔

احمد صاحب۔ ونڈر فل۔ یہ اللہ یار خان اتنا وفادار آدمی ہے۔

سر آپ نے دیکھ لیا ہے اب آپ صوبیدار میجر صاحب کو یہ بات نہ بتائیں۔ اللہ یار خان بیچارہ غریب سپاہی ہے کہیں وہ نہ اس کے پیچھے پڑ جائے۔

نہیں میں صوبیدار میجر کو نہیں کہوں گا۔

سر مجھے افسوس ہے کہ کل میری وجہ سے اتنے لوگوں کو بیجا تکلیف ہوئی ہے۔ میں ریڈیو کے پروگرامز میں شمولیت سے معذوری کا اظہار کر دیتا ہوں۔

ارے بھائی نہیں ۔ کیوں میری نوکری خراب کرتے ہو۔ فورسز پروگرام تو جنرل صاحب نے جی ایچ کیو والوں سے بڑی طویل خط و کتابت کے بعد منظور کروایا تھا۔ جنرل صاحب آپ کی پرفارمینس سے بہت مطمئن ہیں۔ وہ اکثر میرے پاس تمہاری تعریف بھی کرتے ہیں۔ اگر کل رات آپ کی جگہ کوئی دوسرا جے سی او ہوتا۔ تو اس کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ مجھے یقین ہے اسے فوراً سروس سے (UN-DESIRABLE) شو کر کے فارغ کر دیتے۔ آپ کی جنرل صاحب نے کتنی دید کی ہے۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

شائستہ کو پتہ تھا کہ میں روز شام کو ریڈیو سٹیشن فورسز پروگرام کے لئے آتا ہوں۔ وہ مجھ سے کئی دفعہ ملنے ریڈیو سٹیشن آئی بھی تھی۔ نہ جانے اس کو مجھ میں کیا خوبی نظر آئی۔ حالانکہ میری واجبی سی شکل و صورت نہ میرا کوئی عہدہ نہ اختیارات۔ نہ پیسہ نہ کوٹھی نہ کار نہ جائیداد میں اپنی جگہ پر شرمندہ وہ اپنی جگہ پر نالاں۔

اس نے ایک دن مجھے گلستان ہوٹل کے پاس پکڑ لیا۔ اوپر لے گئی۔ بڑی دیر تک مجھ سے میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں کرتی رہی۔ رات کا کھانا دونوں نے وہاں ہی کھایا۔ بل بھی اسی نے دیا۔ پھر اپنی کار میں بٹھا کر مجھے کرمی ٹولہ چھوڑنے بھی آئی۔ راستے میں مجھ سے کہنے لگی۔

احمد آج رات میں یہاں رہ جاؤں۔

نہیں شائستہ۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی خاتون فوجی کیمپ میں داخل نہیں ہو سکتی۔

تو میں تم کو اپنے گھر لے جاتی ہوں۔

شائستہ تمہارے ساتھ دو گھنٹے تو اب میں نے گزارے ہیں۔ یہ کافی نہیں

ہیں۔

اس سے جذبات کی آسودگی تو مجھے میسر نہیں آئی۔ میں اپنے ملنے والوں کی جنسی بے حسی سے (COMPULSION NUROSIS) کا شکار ہو گئی ہوں۔ کسی آدمی کو بھی حتیٰ کہ میرے ارد گرد رہنے والے لوگوں کو بھی مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ الٹا مجھے پاگل کہتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کب تک نارسائی کا یہ کرب سہتی رہوں گی ایسے میں پاگل نہ ہوں گی تو کیا ہوں گی۔

شائستہ تمہیں یہ جو HYSTROMANIA کی شدید شکایت ہے۔ اس کے لئے کسی مرد سے قربت کی بجائے آپ کسی سائیکالوجسٹ کی طرف رجوع کریں۔ ورنہ یہ SEXUAL APPETITE آپ کو فی الفور دیوانہ کر دے گی۔

احمد تم بھی اپنا علاج کسی ماہر نفسیات سے کراؤ۔

مجھے تو کوئی تکلیف نہیں۔

آپ کو بڑا شدید GYNEPHOBIA ہے۔ اسی لئے تو آپ پر عورت کی قربت سے لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے۔

کرمی ٹولہ آگیا۔ اسے میں نے اپنی یونٹ سے تھوڑا پیچھے کار روکنے کے لئے کہا۔

میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر جاؤں گی۔

نہیں اب آگے میری یونٹ لائنز ہیں۔ سب لوگ دیکھیں گے۔

تم تو مرد ہو۔ تمہیں کس بات کی شرم ہے۔

نہیں شائستہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یونٹ لائنز کی طرف جانے کی بجائے اسی سڑک پر ریلوے سٹیشن کی طرف اکیلا چل پڑا۔ وہ دوڑ کر میرے پیچھے آگئی مجھ سے کہنے لگی۔

احمد خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

نہیں شائستہ میں یہ حدود نہیں پھلانگ سکتا۔

وہ زاروقطار روتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ میں تھوڑی دور جا کر پلٹ کر اس کو دیکھ لیتا تھا۔

ابھی تک وہاں ہی کھڑی تھی۔ میں آگے جا کر اندھیرے میں ایک کٹھل کے بڑے سے درخت کے سائے کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ ڈھاکا شہر کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ وہ جب کار کے قریب آیا تو قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ شائستہ نے اسے روکا۔ وہ آدمی ایک لمحے کے لئے انہی قدموں پر ٹھٹھک کر رک گیا۔ شائستہ کار سے اتر کر اس کے قریب آئی۔ تھوڑی دیر تک اس آدمی سے کچھ باتیں کرتی رہی۔

شاید جلد ہی ان کے درمیان کوئی معاملہ طے ہو گیا۔ چونکہ شائستہ اس آدمی کو گاڑی میں بٹھا کر واپس ڈھاکا کی طرف چلی گئی۔ پھر اس کے بعد مجھے کئی روز تک نہ ملی۔ سعید سے پتہ چلا کہ وہ اس رات ایک گنوار سے فوجی رنگروٹ کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے آئی تھی۔ میں نے نواب صاحب سے اس کی شکایت بھی کی لیکن وہ کہنے لگے۔

سعید بیٹے پاگل لڑکی ہے۔ اسے اگر کچھ کہیں گے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ وہ فوجی رنگروٹ اس کے پاس کوئی دو گھنٹے رہا ہو گا۔ پھر آنٹی اس کو کرمی ٹولہ چھوڑ کر رات تین بجے واپس آئی۔

سعید نے مجھے بتایا کہ ہماری حویلی میں ایک باؤلی ہے۔ آنٹی کا ایک سائیکالوجیکل کمپلیکس ہے۔ یہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ یوں کرتی ہے کہ بازار سے ایک نہایت عمدہ شیشے کا فانوس لے کر آتی ہے۔ اس باؤلی میں اس نے اوپر سے ایک رسی باندھی ہوئی ہے۔ فانوس کو اس کے ساتھ باندھ دیتی ہے۔ اور خود باؤلی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس فانوس کا عکس پانی میں دیکھتی رہتی ہے۔ اور چھوٹے بچوں کی طرح خوشی سے تالیاں بجانے لگتی ہے۔ پھر کچھ دیر سر گھٹنوں پر رکھ کے خاموش بیٹھے پانی میں اسی عکس کو دیکھنے لگ جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد قہقہے لگاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہو گی اور پاس ہی پڑا ہوا ایک بانس لے کر اس فانوس کو چکنا چور کر دے گی۔ پھر چیخیں مارتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔ پھر کئی کئی دن کمرے سے باہر نہیں آتی۔

نوکرانی انہیں کھانا وغیرہ کمرے میں ہی دیتی ہے۔ وہ پڑی روتی رہتی ہے۔ اور بس یہی کہتی ہے۔

"ظالموں نے میرے بچے کو قتل کر دیا ہے"

اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ جاتی ہے۔ اس پر اسی طرح کے دورے اکثر پڑتے ہیں۔ اور پھر وہ ہفتے دس دن کے بعد کمرے سے باہر آتی ہے۔ نواب صاحب نے ماہر نفسیات ڈاکٹروں کو اسے دکھایا ہے۔ وہ سب پرانی ہسٹری سن کر یہی کہتے ہیں۔ کہ اس کی شادی کر دو۔ لیکن ہمارے کہنے پر یہ کسی سے شادی نہیں کرتی۔ جس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ انہیں جب اس کے پاگل پن کا پتہ چلتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔ اب ایک مہینے سے نواب صاحب کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح خان صاحب سے میری شادی کروا دو۔ اگر میں نے ان کے ساتھ شادی کر لی تو میں فوراً صحت یاب ہو جاؤں گی۔

اب آپ نے انکار کیا ہے اور چند روز سے اس سے کنارہ کشی کر لی ہے تو اسے زیادہ دورے پڑنے لگے ہیں۔ اب گزشتہ رات کو اس فوجی رنگروٹ کو لے آئی ہے۔ تو اب اس کے کچھ دن ٹھیک گزریں گے۔ بالکل نارمل آدمی کی طرح بی ہیو کرے گی۔

سیکس جب اسے اپنی شدید گرفت میں لے لیتی ہے تو اسے کچھ بھائی نہیں دیتا۔

سعید صاحب یہ پرورٹ ہو چکی ہے۔ اب یہ مستقل طور پر HYSTEROMANIA کی مریضہ ہے۔ پہلے اس کا علاج کسی اچھے ماہر نفسیات سے کروائیں اور پھر اس کی فوراً شادی کر دیں۔ پھر یہ نارمل ہو جائے گی۔

آپ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔

جی نہیں۔۔ میں نفسیات کا طالب علم ہوں۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

شادی تو وہ آپ سے کرنا چاہتی ہے۔

نہیں سعید میری یہ مجبوری ہے۔ میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ دوسری شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ آپ اسے بتا دیں۔

وہ آدمی جو اس رات شائستہ کو ملا تھا۔ اس کی سیٹنگ اس کے ساتھ ہو

گئی ہے۔ وہ جب چاہتی ہے کرمی ٹولہ سے اسے آ کر لے جاتی ہے۔ وہ نہ جانے ہمارے پاس کی یونٹ میں کیا کام کرتا تھا۔ چونکہ اس کے کہیں آنے جانے پر ظاہراً کوئی پابندی نہ تھی اس سے مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد پھر وہ میرے تعاقب میں نہ کبھی ریڈیو سٹیشن آئی اور نہ ہی کرمی ٹولہ ہماری یونٹ کے ارد گرد کبھی منڈلاتے ہوئے اسے دیکھا گیا۔

شائستہ سے میری گلو خلاصی ہوئی تو میں اپنے دفتری کام کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے آنے سے پہلے میرے دفتر کے کلرک بڑی مشکل میں دن کاٹ رہے تھے۔ مجھ سے پہلے جو صاحب ہیڈ کلرک تھے۔ کرنل نے ان کو بہت دبا کر رکھا ہوا تھا۔ ہیڈ کلرک اپنا سارا غصہ اپنے ماتحتوں پر نکالتے۔ کچھ اس وجہ سے دفتر کی فضا ٹھیک نہ تھی۔ کرنل نے آتے ہی میری اے سی آر خراب کر دی تو میں نے بھی اس کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ شاید میرے خلاف مزید کوئی ایکشن لیتا لیکن جنرل صاحب کی باتوں سے وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر میرا دوست بن گیا۔

پھر میں جتنا عرصہ اس یونٹ میں رہا۔ بڑے مزے سے رہا۔ کلرکوں کو میں نے بہت سہولتیں دلائیں۔ میں ریڈیو پروگرام کرتا۔ جب جی چاہتا یونٹ سے چلا جاتا۔ اللہ یار خان میری آوارہ گردیوں سے سخت نالاں تھا۔ وہ بزرگوں کی طرح روز رات کو واپسی پر مجھے باقاعدگی سے نصیحتیں کرتا۔ میں اس سے روز وعدہ کرتا کہ بس اللہ یار خان اب یہ ریڈیو کے پروگرام میں چھوڑ دوں گا۔ اگر اسے کسی طرح پتہ چل جاتا کہ میں نے ڈھاکا آ کر بھی لاہور کی طرح کے کرتب دکھانے شروع کر دیئے ہیں تو وہ فوراً "عرض رپورٹ" کرتا۔

"صاحب جی مجھے آپ چھٹی دے دیں۔ میں اپنے ٹریڈ میں کام کروں گا۔"

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

O

اچانک حنا کا خط ملا۔ خط پڑھ کر میں بے حد رنجیدہ خاطر ہوا۔ اس نے اپنی ماں کی سرگرمیوں کے متعلق لکھا وہ ویسی ہی ہیں جیسی کہ میں نے تمہیں اپنے پچھلے خط میں تفصیل سے لکھی تھیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ جو مجھے پیش آیا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے پاکستان سے آکر پہلے دن ہی ممی کو پچاس ہزار روپے سیف میں رکھنے کے لئے دیئے تھے۔ میرے پاس اخراجات کے لئے الگ رقم تھی۔ اب خرابی بسیار کے بعد اس نے مجھے میرے والد کے متعلق بتایا کہ آج سے کوئی چھ ماہ قبل وہ یہاں آئے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میں نہیں گئی۔ اس لئے وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بڑے بے قرار تھے۔

میں نے ممی سے پوچھا کہ کیوں نہیں گئیں۔ کہنے لگیں۔

میں کیوں جاؤں۔ یہ بڈھا اب جب کہ قبر کے کنارے پہنچ چکا ہے مجھے اپنی خدمت کے لئے بلاتا ہے۔ چونکہ اور تو اس کا کوئی ہے نہیں۔ اس کے خاندان کے لوگ تو اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ بڈھا رخت سفر باندھے تاکہ ہم جائیداد کے وارث بنیں۔

ماں کی یہ باتیں سن کر والد سے ملنے کا مجھے اور زیادہ شوق ہوا۔ چنانچہ میں لکھنؤ کے لئے چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں چلنے لگی تو میں نے ماں سے وہ پچاس ہزار کی رقم مانگی جو میں نے پاکستان سے یہاں پہنچتے ہی ان کے سیف میں رکھ دی تھی۔ میں نے رقم کی بات کی تو میری ماں آگ بگولہ ہو گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔

ارے چھوکری -- پچاس ہزار روپے کیسے۔ کس کو دیئے ہیں۔

ممی میں نے پاکستان سے آتے ہی یہ رقم سیف میں رکھنے کے لئے آپ کو دی تھی۔

ارے باؤلی ہو گئی ہے۔ میں نے کیا کرنی ہے تیری رقم - میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ مجھ سے زندگی بھر ختم نہ ہو سکیں گے۔

ممی آپ بھول رہی ہیں۔ سیف کھول کر کے تو دیکھیں۔

ارے تیرا کوئی پیسہ ویسا نہیں ہے میرے پاس - تو نے اتنی رقم کہاں سے لی ہے۔ جسم بیچ کر اکٹھی کی ہے۔

ممی کچھ خدا کا خوف کریں۔ ویسے اگر آپ کو اس رقم کی ضرورت ہے تو بے شک رکھ لیں۔ اگر مزید کچھ رقم درکار ہو تو مجھے بتائیں میں اس کا بھی انتظام کر دیتی ہوں۔

کہاں سے انتظام کرے گی۔ یہاں تو جسم بیچنے سے بھی اس قدر رقم اکٹھی نہیں کی جا سکتی۔

ممی۔ آپ میری ماں ہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مہذب انداز میں گفتگو کیجئے۔ آپ کے رویئے سے تو مجھے یوں پتہ چلتا ہے کہ آپ مجھے چکلے میں بٹھانے سے بھی نہیں ہچکچائیں گی۔

تیرے لئے چکلے میں بیٹھنا کوئی نیا کام ہے۔

ماں نے آخر وہی کام کیا جس سے میں ڈر رہی تھی۔ اس نے میری رقم ہضم کر کے مجھے اس آبادی کے دادا لوگوں سے دھکے دلوا کر گھر سے نکلوا دیا۔ میں اپنا مختصر سا سامان لے کر وہاں سے چلی آئی ہوں۔ اب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میں نے کھانا کھایا ہے اور یہاں سے ٹرام میں بیٹھ کر سٹی سنٹرل سٹیشن جاؤں گی۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلے گا کہ لکھنؤ کی گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اگرچہ میں پچاس ہزار روپے گنوا کر آ رہی ہوں۔ لیکن کوئی زیادہ افسوس بھی نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ چلو میری ماں کے کام آئیں گے۔

احمد صاحب ہماری بد قسمتی دیکھئے۔ باپ کروڑوں۔ اربوں کی جاگیر کا مالک آج کسمپرسی کی حالت میں ہم سے دور عالم تنہائی میں موت کا انتظار کر رہا ہے۔ ماں اتنی

پڑھی لکھی خاتون جو بمبئی کے ایک بہت ہی مشہور گرلز کالج کی پرنسپل تھی۔ میں ان دونو سے بچھڑ کر پاکستان میں در بدر بھٹکتی رہی ہوں۔ اتنا پیسہ ہونے کے باوجود سکون کے ایک لمحے کے لئے ترستی ہوں۔ یہ سب خدا کی مار نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تمہارے پاس ہوتی ہوں تو مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔ حالانکہ تم نے کبھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ میں سوچتی ہوں کہ ہم دونو بھی عجیب دیوانے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کسی طرح محتاج بھی نہیں۔ ہمارے آپس میں کوئی جنسی تعلقات بھی نہیں۔ کبھی تم نے مجھ سے ایک پیسے کا مالی فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ الٹا میری وجہ سے کئی بار تم پر افتاد آ پڑی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا چاہتے۔ آخر کیوں......؟

بس میں اب آخری چائے کا کپ پی کر چلنے لگی ہوں۔ زندگی ہوئی تو لکھنؤ پہنچ کر آپ کو خط لکھوں گی۔

تمہاری

حنا.....!!!

اس خط کے بعد ایک ماہ تک مجھے حنا کی کوئی خبر نہ ملی۔ میں سوچتا شاید اس کے باپ نے اس کی اچھی پذیرائی کی ہو تو اب وہ اپنے ماضی کے غموں کو بھول کر مستقبل کے منصوبوں میں کھوئی ہوئی ہو۔ میں اب پہلے کی نسبت اپنا کام زیادہ محنت اور دلجمعی سے کرتا۔ یونٹ کی سالانہ انسپکشن ہوئی تو جنرل صاحب نے خصوصیت سے میرے دفتر کی کارکردگی کو بہت سراہا۔ سب لڑکے اپنا کام انتہائی محنت اور چوکسی سے کرتے۔ کرنل نے سب دفتر والوں کو ایک گرینڈ پارٹی دی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔

صاحب اب میں آپ کی ایک سپیشل اے سی آر بھیجنا چاہتا ہوں۔

آپ کی اس سپیشل اے سی آر سے مجھے ترقی نہیں ملے گی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی خوشامد کروں۔

اس کے بعد پھر اس نے کبھی میری اے سی آر کی بات نہ کی اور نہ میں نے اس سے فالتو بات کی۔ ہم دونو کے درمیان جو ضروری فاصلہ رہنا چاہیئے تھا وہ آخر دم تک رہا۔ اس نے سال کے اختتام پر دوسرے لوگوں کے ساتھ میری رپورٹ بھی لکھی۔

جو "AVERAGE" تھی حالانکہ بڑے گھٹیا لوگوں کی اے سی آرز اس نے "ABOVE AVERAGE" لکھیں۔ لیکن میں نے تمام زندگی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کبھی بھی پرواہ نہیں کی۔

میرا کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ میں ایمانداری سے اور محنت سے دفتری اوقات میں صرف کام کرتا ہوں۔ نہ خود OVERTIME بیٹھتا ہوں اور نہ ہی اپنے ماتحتوں کو بٹھاتا ہوں۔ اور نہ ہی ان سے دھونس اور دھاندلی کے ذریعے کام لیتا ہوں۔ اس لئے میں جہاں کہیں بھی رہا ہوں۔ میرے ماتحت لوگ اپنا کام سوفیصدی ٹھیک کرتے۔ اور مجھے کبھی بھی پریشان نہیں ہونا پڑا۔

لکھنؤ پہنچ کر کافی دنوں کے بعد حنا نے مجھے خط لکھا۔

احمد صاحب ---۔ جس دن میں نے آپ کو بمبئی سے آخری خط لکھا۔ اسی رات میں اللہ آباد جانے والی ایک گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دو دن اور دو راتوں کے تھکا دینے والے سفر کے بعد آخر میں خیریت سے لکھنؤ پہنچ گئی۔ ماں نے تو مجھے اپنے والد کے گھر کا صحیح پتہ بھی نہ دیا تھا۔ آخر کار مرتی کھپتی ایک طویل تلاش کے بعد میں ان تک جا پہنچی۔ نواب صاحب اپنے آخری لمحوں کے انتظار میں بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ احمد تم ان کی خوشی اور بے پایاں محبت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جس کا اظہار انہوں نے میری اچانک آمد کے موقع پر کیا۔ مجھے اپنے سینے سے لگائے چومتے رہے اور زار و قطار روتے رہے۔ ذرا ڈھیر بندھی تو مجھ سے پوچھنے لگے۔

حنا تمہاری امی کہاں ہیں۔

ابا جی وہ تو بمبئی میں ہیں۔

وہ کیوں نہیں آئی۔

وہ کہتی ہیں۔ جس گھر سے ایک دفعہ نواب صاحب نے نکال دیا ہے۔ وہاں پھر لوٹ کر کیا جانا۔

حنا میں بمبئی تم لوگوں کو واپس لانے کے لئے گیا تھا۔ تمہاری امی کے تو میں نے لچھن کچھ اچھے نہیں دیکھے۔ اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ میری موجودگی میں اس کے پاس یکے بعد دیگرے عجیب سے لوگ آتے رہے اور وہ ان کو الگ

سے جا کر کچھ سمجھاتی اور وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس چلے جاتے۔

ابا جی میں تو بمبئی میں نہیں ہوں۔

تم کہاں رہتی ہو۔

میں تو کراچی چلی گئی تھی۔

وہاں کیا کرتی ہو۔

وہاں میں نے ایک کرنل سے شادی کرلی تھی۔

یہ اچھا کیا تم نے بیٹا۔ تمہاری ماں کی زندگی تو مجھے بڑی مشکوک نظر آتی ہے۔

ابا جی میں تو ان کے پاس نہیں آتی جاتی۔

اچھا کرتی ہو بیٹی۔ اب کتنے دن میرے پاس رہو گی۔

ابو جان اب میں مستقل طور پر آپ کے پاس رہوں گی۔

کیوں میاں سے لڑائی ہو گئی ہے۔

نہیں ابا جان۔ آج سے دو ماہ قبل ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

ابو میں اسی لئے آئی ہوں۔ کہ اب آپ کو میری خدمت اور نگہداشت کی اشد ضرورت ہو گی۔

ہاں بیٹی یہ بات تو ٹھیک ہے۔

احمد صاحب چند روز تک ہم دونو باپ بیٹی خوشی خوشی رہے۔ میرے آنے سے میرے باپ میں بھی ایک نئی زندگی آ گئی۔

لیکن کیا کیا جائے۔ انسان کی سیاہ بختی ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ایک رات اچانک میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور میں اکیلی رہ گئی۔ اس وقت گھر میں ایک بوڑھے ملازم کے سوا سب نوکر چاکر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ وہ بوڑھا وفادار نوکر تصویر حیرت بنا ان کی چارپائی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ میں نے وہ پوری رات رو رو کر آہ و بکا میں گزاری۔ خدا خدا کر کے صبح صادق نمودار ہوئی۔ نوکر چاکر ایک ایک کر کے آ گئے۔

جس نے نواب صاحب کے سب رشتہ داروں اور ملنے والوں کو ان کی

اچانک موت کی خبر دی۔ دوسرے نوکروں نے مردانے میں مہمانوں کے لئے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ دو نوکرانیوں نے حویلی کے اندر خواتین کے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عزیز رشتہ دار مرد اور خواتین آنے شروع ہو گئے۔ اس شام چار بجے نواب صاحب کو آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

چند روز کے بعد میں نے نواب صاحب کے کاغذات اور متفرق دستاویزات کھول کر دیکھنی شروع کیں۔ ان کو جاگیر کا جو معاوضہ سرکار نے دیا تھا وہ کروڑ ہا روپے تھا۔ وہ نواب صاحب نے بینک میں جمع کروایا ہوا تھا۔ سرکار کی طرف سے ان کو کچھ وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ کوئی تیس ہزار روپے ان کے سیف میں نقد پڑے ہوئے تھے۔ لاکرز میں جو زیورات تھے ان کی تفصیل اور چابی مجھے ملی۔ لیکن مجھے ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں اس سے زیادہ دولت کو اپنے پاؤں کے نیچے روندتی ہوئی پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

آج میرے باپ کو مرے ہوئے پورا ایک ماہ ہو رہا ہے۔ مہمانوں کا تانتا کچھ کم ہوا ہے تو آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اب میرے لئے وہی پہلے کی سی صورت یہاں بھی پیدا ہو گئی ہے۔ نواب صاحب کے چچا زاد بھائی کا ایک آوارہ اور ان پڑھ بیٹا ہے۔ جس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ بدشکل کالا کلوٹا۔ بٹیروں کی پالیاں لڑاتا ہے۔ اس سے فارغ ہو تو اصیل مرغے لڑاتا ہے۔ گھر میں تین جوان عورتیں پہلے ہی ڈال رکھی ہیں۔ اب میرے پیچھے پڑ گیا ہے کہ ہم دونو نواب صاحب کے منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے وارث ہیں۔ اگرچہ تم بیوہ ہو لیکن جوان جہان ہو۔ اسی طرح تو گھر میں نہیں بیٹھی رہو گی۔ بہتر ہے مجھ سے شادی کر لو۔

میں اس مردود سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن جو بات میرے لئے اذیت ناک ہے۔ وہ یہ کہ اس اتنے بڑے نوابوں کے کنبے میں میرا کوئی ایک بھی طرفدار نہیں۔ سب ہی لوگ اس خبیث سے ڈرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی آئے بھی تو یہ چاقو گھونپ کر پیٹ چاک کر دے گا۔ سب نوکر چاکر مجھے یہی مشورہ دیتے ہیں۔ بیٹی کر لو اسی سے شادی۔ اگر آپ نے اس سے شادی نہ کی تو یہ آپ کے والد کا مال و متاع اور جائیداد ہڑپ کرنے کے لئے آپ کو چپکے سے اپنی راہ سے ہٹا دے گا اور کسی کو کانوں کان

خبر نہ ہو گی۔

لوگوں کے اس طرح کے مشوروں اور اس کی دھونس اور دھاندلی سے ڈر کر میں نے آخر اس کے ساتھ شادی کر لی جب ہمیں خلوت میسر آئی تو اس کم بخت کو بھی میں اپنے پہلے خاوند مہاراجہ صاحب کی طرح پایا۔ نہایت غلیظ منہ سے بو آتی ہے۔ جنسی طور پر بے حد کمزور ہے۔ خیر میں نے یہ شادی کوئی اپنے شوق سے نہ کی تھی۔ اس لئے میں نے ان فروعی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

لیکن اب چند دن سے حضرت اپنے اصلی روپ میں سامنے آئے ہیں۔ اب اس نے مجھ سے مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ کہ میں باپ کی سب جائیداد سے اپنا حصہ اس کے حق میں منتقل کر دوں۔ میں نے ایک دو دفعہ دبے دبے الفاظ میں انکار کیا تو کم بخت نے مجھے ایک ستون کے ساتھ باندھ کر ہنٹروں سے بری طرح مارا ہے۔ میں ہفتہ بھر چارپائی پر پڑی رہی ہوں۔

اب میں اس انتظار میں ہوں کہ مجھے موقع ملے تو میں یہاں سے نکل بھاگوں۔ بمبئی جا کر ماں کے گھر سے اپنا سامان لوں۔ جس میں میرا پاسپورٹ اور ویزا ہے۔ اور سیدھی پاکستان کی راہ لوں۔ احمد صاحب مجھے ہر آنے والا دن پہلے سے بھی زیادہ مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا کر رہا ہے۔ اور اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میرا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ میں اسی طرح کے کسی ٹارچر سیل میں عذاب جھیل کر مر جاؤں گی۔ یا اگر بمبئی گئی۔ تو میری ماں مجھے پا بہ زنجیر کر کے اپنی کھولی میں بند رکھے گی۔ اور جبری طور پر مجھ سے عصمت فروشی کروائے گی۔ اور اگر اس سے بچ گئی تو علاقے کا کوئی بڑا دادا مجھے پکڑ کر اپنی کیپ بنا کر اپنے پاس رکھ لے گا۔ اور روز رات دارو پی کر میری جبری طور پر عصمت دری کرے گا۔ اور روز بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا نشے کی حالت میں مجھے جوتوں سے مارے گا۔ اور میں یہ سب ظلم سہہ کر بھی زبان نہ کھول سکوں گی۔ اور آخر کار یہی میری زندگی کی ایک روٹین بن جائے گی۔ جو قبر تک میرا ساتھ دے گی۔ اس قدر صعوبتیں سہنے کے بعد اب میں سمجھی ہوں کہ آپ لوگوں کا گاؤں کا رہنا سہنا کتنا اچھا ہے۔ کوئی اس طرح کے غم تو نہیں۔ سادہ زندگی گذارتے ہیں۔ نہ خود کسی پر ظلم کرتے ہیں۔ نہ کسی دوسرے کو اپنے پر ظلم کرنے دیتے ہیں۔ یہ ہمارے بینک بیلنس یہ کاریں۔ یہ

کوٹھیاں- یہ زرق برق لباس کس کام کے - جب ہم اپنی عزت بھی بچانے کے اہل نہیں- اور چپ چاپ اپنے آپ پر کیئے گئے مظالم کو برداشت کر لیتے ہیں- پھر یہ مصنوعی رگی کس کام کی-

احمد اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہماری محبت کا انجام قریب آگیا ہے- پتہ نہیں تمہارے کیا حالات تھے جن سے تم مجبور ہو کر مجھے بے یارو مددگار اور تڑپتا چھوڑ کر مشرقی پاکستان چلے گئے- تم مغربی پاکستان تھے تو تمہاری موجودگی سے مجھے بڑی تقویت ملتی تھی- تم بھی نیک بخت آدمی ہو- بیوی بچوں کو اکیلا چھوڑ کر ہزاروں میل دور چلے گئے ہو- ایک ملک سے دوسرے ملک آنے جانے کی اتنی پابندیاں ہیں کہ اتنی جلدی ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے- اور میرا خیال ہے اس کے بعد اب ہمیشہ کے لئے ملنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے ہیں-

میں ادھر سے چھپ چھپا کر تو بھاگ جاؤں گی- لیکن بمبئی مجھے ایک دہکتا ہوا جہنم معلوم ہوتا ہے- وہاں سے چھٹکارا پانا مشکل ہو گا- میری ماں اب ڈھل چکی ہے- لوگ اس کی طرف اب قطعاً راغب نہیں ہوتے- لیکن وہ اپنی پرورش کے باعث اب LASCIVIOUS MADNESS کی مستقل مریضہ ہے- جب تک ایک تندرست و توانا آدمی کو وہ روز اپنا گیسٹ بنا کر اپنے فلیٹ میں نہ لائے اور اس کے ساتھ رات نہ بسر کرے- اسے پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے ہیں- وہ اب اپنے ان ایک رات کے مہمانوں کو معقول عوضانہ بھی دیتی ہے- اس کے اتنے وسیع مالی وسائل تو نہیں کہ وہ یوں دونو ہاتھوں سے پیسے لٹائے- نہ مجھے اس کا انجام اچھا نظر آتا ہے اور نہ ہی اپنا-

اب آپ سے جو آخری بات مجھے کہنی ہے- وہ یہ کہ مجھے میرا انجام نظر آ رہا ہے اب آپ سے ملنے کی قطعاً کوئی امید نہیں آپ ایسا کریں- گاڑی قالین اور فرنیچر وغیرہ اگر آپ لینا چاہتے ہیں تو لے لیں- کوٹھی خالی کروا دیں- اگر آپ گاڑی اور یہ سب سامان لینے میں پہلے کی طرح ہچکچائیں تو گاڑی جنرل صاحب کو یا رضوی صاحب کو میری طرف سے گفٹ کر دیں- کوٹھی میں جو سامان ہے وہ بابا محمد شفیع کو کہیں جو آپ لینا چاہیں لے جائیں- باقی سب سامان سعید کی یونٹ کو گفٹ کر دیں-

بینک میں میرے جو دو اکاؤنٹ تھے وہ میں نے آپ کے ساتھ اسی لئے

جائینٹ کروائے تھے کہ ہم دونو میں سے جو چاہے انہیں اپریٹ کر سکے۔ میری ایک آخری وصیت یاد رکھیں۔ یہ رقم سب آپ کی ہے۔ یہ کسی کو نہ دیں۔ میں اس کے بعد آپ کو خط لکھ کر تازہ حالات سے آگاہ کرتی رہوں گی۔ لیکن اس قدر تفصیل سے خط میں شاید آئندہ آنے والے دنوں میں آپ کو نہ لکھ سکوں۔

میرے لئے یہاں سے مشرقی پاکستان جانا آسان تھا لیکن میرا پاسپورٹ اور ویزا میرے پاس نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں آ بھی جاؤں تو مجھے یقین ہے ہندوستان سے آنے والے لوگوں کی بڑی کڑی نگرانی کی جاتی ہوگی۔ اور پھر خصوصیت سے ایک اکیلی جوان عورت کی۔ اگر میں ڈھاکا بھی آ جاؤں اور تم سے ملنے کی کوشش کروں تو مجھے یقین ہے ہم دونو کے لئے سیکورٹی پوائنٹ آف ویو سے قابل گرفت ہو گا۔

اور پھر کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ اس لئے ڈھاکا آنا تو ملتوی سمجھئے۔ میں یہی کوشش کروں گی کہ کسی طرح آسانی سے یہاں سے نکل بھاگوں۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

○

حنا اپنے والد کے چھوڑے ہوئے تیس ہزار روپے نقد۔ بینک کے کاغذات اور کچھ دوسری خاندانی دستاویزات لے کر لکھنؤ سے نکل بھاگی۔ دو دن کے سفر کے بعد وہ خیریت سے بمبئی پہنچ گئی۔ وہ اپنی ماں کے فلیٹ پر پہنچی تو صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ وہ سٹیشن سے ناشتہ کر کے آئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی ماں اس وقت تک اپنے گزشتہ شب کے مہمان کی دلجوئی میں مصروف ہو گی۔ کچن کی چابی تو انہی کے پاس ہو گی۔ اس وقت دروازہ ناک کیا تو وہ گلے پڑ جائے گی۔

حنا چپکے سے برآمدے میں پڑے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اسے سخت نیند آ رہی تھی۔ اپنا سامان بینچ کے نیچے رکھ کر بینچ پر لیٹ گئی۔

وہ دو دن کی تھکی ہوئی تھی۔ فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ ایک ہنگامے سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس کی ماں اور اس کے گیسٹ کے درمیان پیسوں پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر اس کی تمام عمر کی ناکامیاں اور نامرادیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

میم صاحب---!! دو سو روپے سے کم نہ لوں گا۔ آپ نے تمام رات مجھے ٹیکے لگا لگا کر اور گولیاں کھلا کھلا کر مار دیا ہے۔ آپ مجھے ساتھ لائیں تو میرا خیال تھا۔

ایک دفعہ یا پھر دو دفعہ کے بعد میں فارغ ہو جاؤں گا۔ آپ نے تو مجھے پوری رات تختہ مشق بنایا۔ دو سو روپے سے ایک ٹیڈی پیسہ کم نہ لوں گا۔

ہیرا لعل۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ مرد تو غیر عورتوں کے پاس جب جاتے ہیں تو الٹا ان کو اپنے پلے سے پیسے دیتے ہیں۔ میں تو الٹا تم کو اپنے پاس سے پیسے دے رہی ہوں۔

میم صاحب۔ وہ جو مردوں سے پیسے لیتی ہیں۔ ایک دم کی اول نمبر کی چھوکریاں ہوتی ہیں۔ تمہاری طرح کی بوڑھی پھوس نہیں ہوتیں۔ کہ جن کو دیکھ کر مرد کے دل میں کوئی امنگ ہی پیدا نہ ہو۔

ارے ہیرے۔ میری جان۔ سب رات تو تو نے مزے میں کاٹی۔ اب ذرا سی بات پر لڑنے کو آ رہا ہے۔

میم صاحب یہ ذرا سی بات ہے تمام رات تو تم نے مجھے نمبو کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔ رام قسم جرا بھی مجا نہ آیا۔

ارے ہیرے لے اور مر۔ جا چلا جا۔ یہ ایک دن کی بات تھوڑی ہے۔ حنا کی ماں نے دو سو روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہیرا لعل نے مسکراتے ہوئے پیسے جیب میں رکھ لئے۔ ہیرا پیسے اندرونی جیب میں رکھنے لگا۔ تو اس کا بڑا کمانی دار چاقو نیچے گر پڑا۔ حنا دیکھ کر سہم گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ پورا علاقہ ہی جرائم پیشہ لوگوں کا ہے۔ کچھ لوگ عورتوں کا خود کاروبار کرتے ہیں۔ کچھ ایسی عورتوں کے پاس جاتے ہیں اور وہاں راتیں بسر کرتے ہیں ان کمائیوں کو پیسے دیتے ہیں۔ دارو پیتے ہیں اور موج میلہ کرتے ہیں۔ اور بیماریاں لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔

ہیرا لعل نے پیچھے پلٹ کر حنا کی طرف دیکھا تو کہنے لگا۔

سالا یہ کون ہے۔

یہ میری بیٹی ہے۔ ساحرہ نے کہا۔

سالا تم چھوڑو اس کام کو۔ اب اس کو کرنے دو۔ دو پیسے کما لے گی۔ تو تیرا بھی گجارا ہوتا رہے گا۔

نہیں ہیرا لعل یہ تو شادی شدہ عورت ہے۔

شادی شدہ عورت ہے تو کیا ہے۔ یہ نہیں کر سکتی۔ چلو آج سب سے پہلے میں ہی شروعات کرتا ہوں۔ اور اس نے آگے بڑھ کر حنا کا بازو پکڑ لیا۔ چھوڑ دے اسے ہیرا لعل۔۔ حنا کی ماں نے غصے کے عالم میں کہا۔

ہیرا لعل نے حنا کا بازو چھوڑ دیا اور اس زور کا ایک تھپڑ اس کی ماں کو مارا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دور جا گری۔ اس نے اپنی اندرونی جیب سے فوراً چاقو نکال لیا اور حملہ کرنے لگا کہ حنا نے اسے پکڑ لیا اور اس کی منت سماجت کرنے لگ گئی۔

سالا۔ سب رات ہم کو کھراب کیا۔ اب چھوہری کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔

ہیرا حنا کو بازو سے پکڑ کر کمرے کے اندر لے گیا۔ اندر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ اسی بستر پر جس پر تھوڑی دیر پہلے ہیرا لعل حنا کی ماں کے ساتھ سویا ہوا تھا اور پیسو رول ادا کر رہا تھا۔ اب وہی ہیرا لعل اسی بستر پر ایک جوان اور خوبصورت عورت کے ساتھ ایکٹو رول ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔ حنا اور ہیرا لعل تقریباً ایک گھنٹہ اندر رہے۔ اس دوران میں بڑھیا بینچ پر بیٹھ کر حنا کا بیگ کھول کر اس کی تلاشی لینے لگ گئی۔ اس بیگ سے اور تو اسے کچھ نہ ملا۔ نواب سعادت علی خان کی جائیداد کے کاغذات اور چند متفرق دستاویزات تھیں جو اس نے نکال کر کچن میں چھپا دیں۔ اور پھر بیگ کو اسی طرح بند کر کے بینچ کے نیچے رکھ دیا۔ اور خود اس پر آرام سے بیٹھ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہیرا لعل باہر آیا۔ بڑھیا سے کہنے لگا۔

سالا۔ تم اچھا مال ہم سے چھپا کر رکھتا ہے۔ رام قسم مجا آگیا۔ رات کی ساری تھکان دور ہو گئی۔ میم صاحب اب میں روج آؤں گا۔

ہیرا جی یہ میری بیٹی تو آج چلی جائے گی۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے جب آپ کا جی چاہے آئیں۔

سالا تمہارے پاس کون آئے گا۔ تم تو ہمارا ماں کی عمر کے برو بر ہے۔ تمہارے ساتھ دل ہی نہیں کرتا۔

کرے گا۔ میں تمہاری لئے دارو منگا کر رکھا کروں گی۔ خوب کھاؤ پیو۔

مزے کرو۔

سالا - کھانے پینے سے ہی تو مجا نہیں ہوتا۔ پیٹ کی بھوک کے سوا اور بھوک بھی تو ہوتی ہے۔ اچھا دیکھوں گا۔

اور پھر ہیرے نے بیڑی سلگائی اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ ساحرہ کمرے کے اندر گئی۔ حنا سے کوئی بات کئے بغیر اس نے دھلے ہوئے صاف کپڑے نکالے۔ اور باتھ روم میں چلی گئی۔ حنا ابھی تک ماں کے بستر پر ہی لیٹی ہوئی تھی۔

ساحرہ جب نہا کر باہر آئی تو وہ حنا سے کہنے لگی۔

اٹھ تو بھی نہا کر کپڑے بدل لے۔

ہاں امی اٹھتی ہوں۔

حنا نہا کر باہر آئی۔ تو ساحرہ اپنے بستر پر سو چکی تھی۔ ان کی روز مرہ کی یہی روٹین تھی۔ حنا نے کپڑے تبدیل کئے اور بالوں کو کنگھی وغیرہ کی۔ اس نے ایک دو دفعہ ماں کو قریب سے جا کر دیکھا۔ لیکن وہ سو گئی تھی۔ حنا کے پاس ایک بہت ہی طویل خط جو کہ کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نے احمد کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجنا تھا۔ وہ سونا چاہتی تھی لیکن اس نے دل میں سوچا کہ پہلے میں یہ خط پوسٹ کر آؤں۔ چنانچہ وہ قریب کے پوسٹ آفس میں چلی گئی۔ وہاں سے وہ مفصل خط اس نے احمد کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھجوایا۔ وہاں سے پاکستان بھیجے جانے والے لفافے خریدے اور ان پر پتہ لکھ کر انہیں اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ انہی خفیہ جیبوں میں اس نے اپنی ساری نقدی اور ایک بڑا ہی قیمتی ہار چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اسے اب اپنی ماں پر بھی اعتبار نہ تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ واپس آ گئی۔ اب اسے بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے سوچا ممی کو آرام کرنے دوں میں ہی دوپہر کا کھانا بنا دیتی ہوں۔ اس نے گھڑی دیکھی تو وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ دن کے دو بجے تھے۔ ساحرہ ابھی تک میٹھی نیند سو رہی تھی۔ حنا نے کچن کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لینا چاہا۔ وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف چائے کا سامان تھا۔ اور انڈے اور ڈبل روٹی پڑی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں چلی گئی۔ ماں کو آواز دی۔

امی --- امی۔

کیا ہے۔ سونے دے گی یا نہیں۔

امی۔ کچن میں تو راشن وغیرہ کچھ بھی نہیں ۔ میں نے کہا کہ میں کھانا پکا لوں۔

میں تو ہوٹل سے کھاتی ہوں۔ تو بھی جا ہوٹل سے کھا لے۔

امی ہوٹل کا تو کھانا اچھا نہیں ہوتا۔

اری چھوکری نخرے نہ کر۔ یہ کوئی تیرے باپ کا گھر نہیں ہے کہ جہاں تمہیں ہر شے ملے گی۔

امی -- پہلے تو آپ سب چیزیں لا کر رکھتی تھیں۔

بیٹی مجھ سے یہ ٹنٹا نہیں ہوتا۔ گئے ہوٹل پر اپنی پسند کا کھانا کھایا۔ پیسے دیئے اور واپس آ گئے۔

نہیں امی۔ یہ طریقہ بڑا UN-DIGNIFIED ہے۔

ارے تو ڈگنٹی کو لے بیٹھی ہے۔ کتنے دن تیرا ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

میں تو اب امی مستقل طور پر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔

نہ بی بی۔ یہ کام نہیں چلے گا۔

کیوں اماں۔ میرے یہاں رہنے سے آپ کو کوئی تکلیف ہے۔

ارے تکلیف نہیں ہے۔ تو بچی ہے۔ دیکھتی نہیں ہے۔ چھوٹی سی تو کھولی ہے۔ اس میں بڑی مشکل سے ایک چارپائی آتی ہے۔ اگر تمہیں رکھ لوں۔ تو خود کہاں جاؤں۔

اماں میں کچن میں چٹائی پر نیچے سو جایا کروں گی۔

نہیں تجھے میں رکھنا نہیں چاہتی۔

کیوں۔ آپ کا اور میرا ماں بیٹی کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔

وہ تو اسی وقت ہی ہو گیا تھا جب تو مجھے اس نرک میں جھونک کر اپنے عاشق کے بلاوے پر پاکستان چلی گئی تھی۔

اماں خدا خدا کرو۔ میرا کون سا عاشق ہے۔

وہی فوجی کنگلا۔ جس کا نہ گھر ہے نہ گھاٹ۔ تم سے کھانے کے لئے اور

پیسے اینٹھنے کے لئے تمہیں ہر روز ایک نیا چکمہ دیتا ہے۔

اماں وہ تو انتہائی شریف آدمی ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے ایک پیسہ تک نہیں لیا۔

تو بھی شریف ہے۔ تمہارے اندر کی آگ تو فرو ہی نہیں ہوتی۔ یہ آگ تو تمہیں کہیں جم کر بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ اس لئے تو تو ایسے لوگوں کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔

ماں مجھ میں آگ آپ سے بھی زیادہ ہے۔

ارے ارے ماں زادی میرے لچھن تیری طرح تو نہیں ہیں۔ کم از کم اپنے گھر میں تو بیٹھی ہوں۔

ہر روز ایک نئے گیسٹ کی قربت میں آپ کی جو راتیں کٹتی ہیں۔ کیا یہ ایک اچھی روایت ہے۔ آپ کے پرانے جاننے والے اس سے کیا اثر قبول کرتے ہیں۔

یہ سن کر ساحرہ آپے سے باہر ہو گئی۔ حنا کا بیگ اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف پھینکتے ہوئے کہنے لگی۔

نکل جا میرے گھر سے مجھے ایسی بد چلن اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ کاش تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی۔

امی۔ یہ سب کچھ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ آپ ہی کا دودھ پیا ہے۔ آپ ہی کی گود میں آنکھ کھولی ہے۔

یہ کہتے ہوئے حنا اپنا بیگ اٹھانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اس کا بیگ بالکل سیڑھیوں کے کھلے دروازے میں پڑا ہوا تھا۔ جب حنا وہ بیگ اٹھانے لگی تو اس کا منہ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ اور وہ کھلے دروازے میں پہلی سیڑھی سے جونہی اپنا بیگ اٹھانے لگی ۔ ساحرہ نے پیچھے سے اتنے زور کا ایک دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل کم از کم تین سیڑھیاں نیچے جا کر گری۔ اور پھر وہاں سے لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے سڑک پر جا گری۔

اس کے سامنے کے پانچ دانت اوپر کے اور چار دانت نیچے کے ٹوٹ گئے۔ دونو ہونٹ بری طرح سے کچلے گئے۔ دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہاتھ

لگانے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ باقی سب جسم پر بھی سخت چوٹیں آئی تھیں۔

گھٹنوں پر بھی سخت چوٹیں آئی تھیں۔ دونو گھٹنے بری طرح لہولہان ہو گئے تھے۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ساحرہ نے سیڑھیوں کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ جہاں حنا گری تھی اس سڑک کی دوسری جانب ایک پل تھا۔ جس کے نیچے سینکڑوں بھکاریوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ جب ان بھکاریوں نے یہ واقعہ دیکھا تو وہ دوڑ کر جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ حنا اگر چہ بے ہوش نہ تھی لیکن اتنی دہشت زدہ تھی کہ کسی سے کوئی بات وغیرہ نہ کرتی تھی۔

وہ بھکاری ایک سٹریچر نما کھٹولی پر ڈال کر حنا کو پل کے نیچے لے گئے۔ اس پل کے نیچے چند بال بچے دار بھکاری بھی رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بوریاں اور ٹاٹ لگا کر وہاں اپنے پردے بنائے ہوئے تھے۔ اس کے اندر فوجی طرز کے پرانے ٹینٹ جن کو جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ پل کی دیواروں کے ساتھ استادہ تھے۔ ان لوگوں کے بیوی بچے ان کے اندر رہتے تھے۔ حنا کا سٹریچر جب انہوں نے وہاں جا کر رکھا تو ان گھروں سے عورتیں بھی نکل آئیں۔ ایک بوڑھی سی عورت نے حنا کو دیکھتے ہی ان آدمیوں کو کہا۔

ارے قمرو اسے میرے تمبو میں لے آؤ۔

نہ میا اسے میں اپنی ہی جھگی میں رکھوں گا۔

یہ قریب المرگ ہے۔ اسے کھدمت کی جروت ہے۔

اماں کھدمت میں کروں گا۔

تو اپنا منہ کالا کرے گا۔ اسے کچھ دن میرے ہاں رہنے دو۔ ٹھیک ہو گئی تو پھر لے آنا۔ جو جی میں آئے کرنا۔

حنا شدید زخمی تھی۔ اسے ڈاکٹری امداد کی ضرورت تھی۔ لیکن قمرو پر جنس کا بھوت سوار تھا۔ وہ اس امید پر حنا کو میا کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا کہ یہ چند ہی روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔ لونڈیا اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ جوان ہے۔ جذبات سے لبریز ہے۔ قمرو کے اڈے آج تک ایسی لڑکی نہ چڑھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کوئی بھولی بھٹکی بھکارن ہی اسے مل سکتی تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی میری زندگی میں اس

قدر حسین و جمیل لڑکی بھی آئے گی۔

قمرو اور اس کے دو تین ساتھیوں نے وہ سٹریچر اٹھا کر میا کے پھٹے پرانے خیمے میں لا کر رکھ دیا۔ بڑھیا نے جلدی سے ایک خستہ حال سی چارپائی پر ایک میلا کچیلا سا بستر لگا دیا۔ اور دو جوان سی بھکارنوں کو کہا۔

ارے ذرا اسے اٹھا کر اس چارپائی پر ڈال دو۔

دو تندرست و توانا عورتوں نے اسے اٹھا کر آہستہ سے چارپائی پر لٹا دیا۔

بڑھیا نے ان میں سے ایک کو کچھ رقم دیتے ہوئے کہا۔

ارے شانتی تو ذرا جا قریب کی مارکیٹ سے اس کے لئے دودھ اور ڈبل روٹی لے آ۔ شانتی فوراً چلی گئی۔

دوسری بھکارن کو بڑھیا نے کہا۔

ارے چھوہری تو جا بجار سے کسی ڈاکٹر کو لے آ۔

ڈاکٹر موٹر رکشہ پر فوراً آ گیا۔ اس نے مریضہ کو دیکھا۔ پانی گرم کروا کر اس میں کوئی دوائی ملائی اور حنا کے چہرے اور دونو گھٹنوں کے زخم دھوئے۔ ان پر ضروری مرہم پٹی کی۔ حنا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ مجھے پسلیوں میں بھی چوٹیں آئی ہیں۔ ڈاکٹر نے میا کے بغیر سب آدمیوں کو ہٹا دیا اور میا کو کہا کہ مریضہ کی قمیض اٹھائیں۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح سے حنا کا ملاحظہ کیا۔ حنا کی ڈھیر بندھائی۔

ڈاکٹر جب جانے لگا تو حنا نے اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ اسے نکال کر دیا۔ لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ حنا کے اصرار پر اس نے وہ پیسے رکھ لئے۔ اور چلنے سے پہلے کہنے لگا۔ کہ میں کل شام کو اسی وقت ان کو دیکھنے کے لئے آؤں گا۔ ڈاکٹر نے غذا میا کو بتائی۔

اماں۔ بٹی کو دودھ ڈبل روٹی اور سوپ کے علاوہ اور کوئی چیز نہ دیں۔

بہت اچھا سرکار۔ آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے میری بٹی کو آکر دیکھا ہے۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میا دودھ گرم کر کے لے آئی۔ حنا کے سمجھانے پر بڑھیا نے ڈبل روٹی کو بھی توے پر تھوڑی دیر کے لئے سینکا۔ حنا نے دودھ اور ڈبل

روٹی آہستہ آہستہ کھائی۔ پھر گرم پانی کے غرارے کئے۔ گرم دودھ پینے اور ٹیکے لگنے سے اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ جب اور عورتیں وہاں سے چلی گئیں تو حنا نے بڑھیا کو ایک سو روپے کا نوٹ دیا اور اس سے کہا۔

اماں آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے میری اچھی طرح سے دیکھ بھال کا بیڑا اٹھایا ورنہ قمرو تو اپنی جھگی میں لے جا کر اس حال میں بھی میری عصمت دری کرنے سے نہ چوکتا۔ اماں پتہ نہیں مردوں میں یہ کمزوری کیوں ہے۔ جہاں کوئی غیر عورت ان کے ہتھے چڑھی وہ سب سے پہلا کام جو کرتے ہیں وہ یہ کہ اپنی جنسی آسودگی کا سامان کرتے ہیں۔ قمرو کی طرح کے لوگ ہی ہوتے ہیں نا جو مردہ عورت کے ساتھ بھی زنا کا ارتکاب کرتے ہیں۔

بیٹی یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلتا آ رہا ہے۔ چھوڑو اس بات کو۔

اسی رات کو قمرو حنا کو وہاں سے اٹھوا کر اپنی جھگی میں لے گیا۔ مائی نے اس کی بہت منت سماجت کی۔

دیکھ قمرو۔ یہ چھوکری میرے پاس رہے گی۔ تو جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ تیرے ہاں اسے کون دیکھے گا۔ تو تو سب دن اپنے کام پر ہوتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ آج میں نے ڈاکٹر منگوایا تھا۔ اس نے دو ٹیکے لگائے۔ کھانے کی دوائی دی۔ زخموں پر دوائی لگائی۔ یہ تیرا ہی مال ہے۔ ہفتہ دس دن میں ٹھیک ہو جائے گی تو پھر لے جانا اسے اپنی جھگی میں۔ جب تک تمہارا جی چاہئے اپنے پاس رکھنا۔

نہیں خالہ میں اسے ابھی لے کر جاؤں گا۔

قمرو نے رات کو سونے سے پہلے حنا کو دودھ اور ڈبل روٹی لا دی۔ جب اس نے تھوڑی سی کھائی۔ انسان جب رذالت پر اتر آئے تو وہ انتہائی پستیوں میں جا گرتا ہے۔ قمرو کی بھی یہی حالت تھی۔ حنا کی ہڈیاں چور تھیں۔ زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اس حالت میں بھی اس بھوکے کتے نے ایک قریب المرگ لاش کو چھوڑنے سے احتراز نہ کیا۔ حنا رو رو کر اس کے سامنے ہاتھ باندھتی رہی۔ اللہ رسول ﷺ کے واسطے دیتی رہی۔ لیکن اس وقت وہ انسان نہیں بلکہ ایک شیطان تھا۔ اس نے پوری رات حنا کو مشق ستم بنایا۔ وہ بے چاری وہ ظلم بھی سہے جا رہی تھی۔

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر حنا کو دیکھنے کے لئے آیا تو میا نے اسے بتایا کہ مریضہ میرے ہاں سے چلی گئی ہے۔ ڈاکٹر قمرو کی جھگی میں جا پہنچا۔ لیکن قمرو نے ڈاکٹر کو کہا۔

ڈاکٹر صاحب۔۔ مریضہ اب ٹھیک ہے۔ اسے اب مزید علاج کی ضرورت نہیں ہے۔

نہیں بھیا یہ تو تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم پیسوں سے ڈرتے ہو تو پیسے میں نہیں لوں گا۔ مریضہ کا علاج تو ہو لینے دو۔

نہیں ڈاکٹر صاحب اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔

بھیا۔ تین چار دن مجھے اس کا علاج اور کر لینے دو۔

نہیں ڈاکٹر مہربانی۔ تم جاؤ۔

قمرو۔۔ کا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا۔ ڈاکٹر کو احساس ہو گیا کہ وہ جھگیوں والی آبادی کے ایک دادا سے ہمکلام ہے۔

اس نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ قمرو آج دو دن سے ہی اپنی جھگی میں ہی پابند بیٹھا تھا۔ وہ حنا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہتا تھا۔

اسے خدشہ تھا کہ بستی کے دوسرے غنڈے میری عدم موجودگی میں اس چھوہری کو جورا جوری کھراب نہ کریں۔ اس عرصے میں اس طاقت ور کتے نے کمزور کتوں کو اس زندہ لاش کے نزدیک تک نہ پھٹکنے دیا۔ خود دو دن سے اسے متواتر چھوڑ رہا تھا۔ اب اس کا جی بھر گیا تھا۔

قمرو کی جھگی سے دو جھگیاں ہٹ کر میا کی جھگی تھی۔ اس کا میاں دو سال قبل ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ سریف نے آج سے ٹھیک چالیس سال قبل میا کو زبردستی اغوا کر لیا تھا۔ جب کہ وہ صبح سکول پڑھنے کے لئے جا رہی تھی۔ اس وقت میا کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اور وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ سریفے نے اسے پکڑ کر اپنے ویران گھر میں بند کر دیا تھا۔ اور ہفتہ بھر تنہائی میں اس کی عزت لوٹتا رہا۔ ایک رات جب زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اور گھپ اندھیری رات تھی۔ وہ میا کو وہاں سے نکال کر ریلوے سٹیشن لے آیا۔ اور وہاں سے گاڑی میں بٹھا کر بمبئی آ گیا۔ سریفے

نے شروع ہی سے اس بستی میں آ کر پناہ لی - چالیس سال ہو گئے ہیں- میا کے دو جوان بیٹے ہیں جو محنت مزدوری کرتے ہیں- اور میا نے ان کے امور خانہ داری سنبھالے ہوئے ہیں-

بستی کے سب لوگ میا کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں-

آج حنا کو اس بستی میں آئے ہوئے دسواں دن تھا- حنا کا چونکہ علاج بند ہو گیا تھا- اس لئے اس کے سارے زخم اور چوٹیں خراب ہونی شروع ہو گئیں- علاج معالجہ تو اپنی جگہ ان دس دنوں میں ایک آدھ بار دن میں حنا کو تھوڑی سی بھات کہیں سے لا دیتا- اور وہ اسے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کھالیتی- اب حنا کے زخموں میں تعفن پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا- اس کے ساتھ ہی قمرو کی آتش شوق بھی بجھ گئی-

قمرو اتنے دنوں کے بعد کام پر جانے لگا تو اس نے میا کی جھگی کے باہر کھڑے ہو کر اسے آواز دی-

او -- میا-

اے کون ہے-

خالہ میں قمرو ہوں-

کیوں قمرو- خیریت تو ہے-

خالہ میں باہر جا رہا ہوں- جرا لونڈیا کا کھیال رکھیو-

اچھا بھیا-

قمرو اپنی بستی سے نکل کر بڑے شہر کی طرف چلا گیا- میا نے گھر کی صفائی کی - برتن مانجے پھر حنا کو دیکھنے قمرو کی جھگی کی طرف چلی گئی- وہ قمرو کی جھگی کے قریب ہی پہنچی تو اسے بو کی بھبکیں آنے لگ گئیں- جس سے اس کا دماغ پھٹنے لگا- اس نے اپنے دوپٹے سے منہ اور سر اچھی طرح لپیٹ لیا اور ہمت کر کے جھگی کے اندر چلی گئی- حنا نے میا کو دیکھ تو وہ زار و قطار رونے لگ گئی--

میری بیٹی حوصلہ کرو تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی-

اماں میں تمہارے پاس ہوتی تو ٹھیک ہو جاتی- ادھر تو مجھے آج تک کسی نے نہ کوئی دوائی لا کر دی ہے نہ ہی کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے-

جب یہ علاج نہیں کروا سکتا تھا تو تمہیں میرے گھر سے اٹھوا کر کیوں لایا۔

اماں میری اس زندہ لاش کو چھوڑنے کے لئے۔ اسے اس نے جی بھر کر ان دس دنوں میں چھوڑا۔ میں روتی چلاتی رہتی لیکن وہ میری ایک بھی نہ سنتا۔ اور رات دن میں کئی کئی بار یہ عمل دہراتا۔

آج کہاں گیا ہے۔

بس اماں۔ اب اندر کی آگ کی تپش کچھ کم ہوئی ہے۔ تو وہ مجھے کچھ بتائے بغیر باہر چلا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ میری موت کے بعد ہی اس جھگی کا رخ کرے گا۔ اماں اب میں بھی پل دو پل کی مہمان ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم آگئیں ہو۔ کسی پڑھے ہوئے آدمی کو آپ بلا لاتیں تو میں آخری بار ایک عزیز کو چٹھی ہی لکھوا لیتی۔ حنا نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر باہر رکھ دیا اور پھر میا کو راضی کرنے کے لئے اسے کچھ پیسے دیئے۔

بیٹی تھوڑا بہت تو میں بھی لکھ لوں گی۔

امی۔ آپ پڑھی ہوئی ہیں۔

ہاں بیٹی۔ اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور دو آنسو اس کی گالوں پر لڑھک آئے۔

بس بیٹی ۔ مجھے بھی میرا ماضی یاد آگیا۔ سکول پڑھنے جا رہی تھی کہ ایک بدمعاش مجھے زبردستی اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا۔ نہ جانے میرے بعد میرے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہو گا۔

اماں آپ اس وقت سے یہاں ہیں۔

ہاں بیٹی۔

آپ کا وہ آدمی کہاں۔

بیٹی ابھی دو سال ہوئے ہیں۔ ایک حادثے میں فوت ہو گیا ہے۔

اماں۔ آپ نے اس آدمی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

بیٹی۔ ایسے لوگوں کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا۔ شادی کیسی.....؟ اس آدمی نے چالیس سال تک مجھے اپنے پاس ایسے ہی رکھا۔ اس سے اب میرے دو جوان

بیٹے ہیں۔ جو اپنی محنت مزدوری کرتے ہیں۔

اماں۔۔۔ ہر آدمی کے اپنے دکھ ہیں۔ جو اپنے سینے کے نہاں خانوں میں چھپائے پھرتا ہے۔ اماں کوئی دوسرے آدمی کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتا۔ اپنے ان دکھوں کو اپنے ساتھ لیکر قبر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کے اردگرد رہنے والے لوگ بھی اسے بھول جاتے ہیں۔

ہاں بیٹی یہ بات تو ہے۔

اماں میری چٹھی کا کچھ کرو۔

بیٹی میں انگریزی میں تو نہ لکھ سکوں گی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھ لوں گی۔

اماں ٹھیک ہے۔ جسے میں نے چٹھی لکھوانی ہے وہ اردو پڑھ سکتا ہے۔

اچھا بیٹی میں اپنے گھر سے کاغذ قلم لے آوں۔

اچھا اماں لے آیئے۔

اماں۔ کاغذ قلم لے آئی۔۔ بیٹی اب مجھے تم لکھاوٗ۔

پیارے احمد خدا تمہیں سلامت رکھے۔

آج سے دس دن پہلے لکھنوٗ سے یہاں بمبئی پہنچی تھی۔ سٹیشن سے سیدھی امی کے فلیٹ میں گئی۔ وہ حسب سابق سوئی ہوئی تھی۔ میں باہر بیٹھی رہی۔ وہ بارہ بجے کے قریب باہر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ مجھے گالیاں دینے لگ گئی۔ میں نے کہا امی آپ مجھے گالیاں نہ دیں۔ میں اپنے اٹیچی کیس لے کر چلی جاتی ہوں۔ کہنے لگی۔ تمہارا یہاں کوئی اٹیچی کیس نہیں ہے۔ میرے پاس جو ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ وہ اس نے اٹھا کر سیڑھیوں پر پھینک دیا۔ میں اپنا بیگ، اٹھانے کے لئے آئی تو میں نے خیال نہیں کیا۔ جب میں دوسری سیڑھی جس پر میرا بیگ آکر گرا تھا۔ وہاں سے اٹھانے لگی تو اس نے پیچھے سے مجھے اتنے زور کا دھکا دیا کہ میں سیڑھیوں کے درمیان میں آکر چھاتی اور منہ کے بل گری۔ سامنے کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ دائیں ہاتھ کی ہڈی کلائی کے پاس سے ٹوٹ گئی ہے۔ تین پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ گھٹنے بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔

لوگ سڑک پر اکٹھے ہو گئے۔ سامنے کچھ جھگیوں والے لوگ رہتے ہیں۔

وہ بھاگ کر آ گئے۔ ان کا ایک دادا مجھے اٹھا کر اپنی جھگی میں لے گیا۔ میں اتنی سخت بیمار ہوں میری ہڈیاں چور چور ہیں اور وہ ذلیل آدمی اس حالت میں بھی میرے ساتھ رات دن کئی کئی بار بدفعلی کرتا ہے۔ اب میرے زخموں میں سڑاند پیدا ہو گئی ہے۔ پیپ آ رہی ہے۔ اس کی جھگی میں اتنا تعفن پھیل گیا ہے کہ اب کوئی آدمی ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ ان زخموں میں اب گینگرین ہو گئی ہے۔ اب میں زندگی سے مایوس ہو کر تم کو یہ آخری خط لکھ رہی ہوں۔ یہاں ایک بوڑھی اماں ہیں۔ بڑی رحمدل خاتون ہیں۔ میرے مرنے کی وہ شاید آپ کو خبر کر دیں تو کر دیں۔ اور کوئی ایسا آدمی نہیں۔ میں اپنی سب پراپرٹی کے متعلق مفصل خط آپ کو لکھنؤ سے لکھ چکی ہوں۔ آپ اس کے مطابق عمل کریں۔

اللہ پاک آپ کو۔ آپ کے بیوی بچوں کو خیریت سے رکھے۔ اور آپ سب سکھی رہیں۔ مجھے تو آپ کے سکھوں میں سے کوئی حصہ نہ ملا۔ میرے قسمت ہی ایسی ہو گی۔ کسی سے کیا گلہ۔ سگی ماں نے پچاس ہزار روپے نکال لئے اور مجھے دھکے دے کر اپنے ہاتھ سے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ دوسروں کے متعلق کیا کہہ سکتی ہوں۔

اچھا خدا حافظ۔

بستر مرگ پر آخری لمحوں کی منتظر۔

تمہاری حنا۔

میا نے وہ چٹھی لفافے میں بند کر دی۔ حنا نے کسی نامعلوم جذبے سے مغلوب ہو کر وہ خط میا کے ہاتھ سے لے لیا۔ تھوڑی دیر تک اسے بڑے پیار اور عقیدت سے دیکھتی رہی۔ پھر اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اور پھر اس کی گالوں پر موتیوں کی طرح آنسو بہنے لگ گئے۔ آخری بار اس نے پھر وہ خط چوم کر میا کو واپس کر دیا۔ میا کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔ اسے اپنے دکھ یاد آ گئے تھے۔

اماں یہ چٹھی آپ خود اپنے ہاتھ سے لیٹر بکس میں ڈال کر آئیں۔ مجھے اور کسی پر اعتبار نہیں آتا۔

تم فکر نہ کرو میری بیٹی۔ وہ سامنے سڑک پر لیٹر بکس ہے۔ میں ابھی ڈال کر آتی ہوں۔ میا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میا کے جانے کے بعد حنا حساب لگاتی رہی۔ کہ یہ خط کتنے دنوں کے بعد احمد کو ڈھاکے جا کر ملے گا۔ وہ سوچنے لگی۔ ایک ہفتے سے تو کم کسی طرح بھی نہ لگے گا۔

تب تک خدا جانے میں زندہ بھی ہوں گی یا نہیں۔ احمد بیچارے پر کیا بیتے گی۔ دوسرا ملک ہے۔ وہ ڈیفنس فورسز کا آدمی ہے۔ اسے یہاں آنے کے لئے ویزا کون دے گا۔ پھر یہاں آئے گا بھی تو کس کے پاس۔ حنا کو اپنی اس بے بسی پر رونا آگیا۔ میا چھٹی ڈال کر واپس آئی تو اس نے حنا کو روتے ہوئے دیکھا۔

میری بیٹی رو نہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔

اماں مجھے اگر آپ اپنی جھگی میں لے جائیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔

بیٹی یہ قمرو بڑا حرامی ہے۔ مفت میں دنگا کرے گا۔ میرے بیٹے بھی جوان ہیں۔ کھون کھرابہ ہو جائے گا۔

تو اماں میں بغیر علاج کے یہاں ہی پڑی پڑی مر جاؤں گی۔

بیٹی مجبوری ہے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔

حنا نے اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سے نوٹ اور ایک بڑا ہی قیمتی ہار نکال کر اپنی چھاتی پر رکھ دیا۔ اور پھر میا کو کہنے لگی۔ اماں یہ تھوڑی سی رقم ہے اور یہ ایک بہت ہی قیمتی ہار ہے۔ یہ آپ لے لیں۔ آپ میرے مرنے کے بعد صرف میرے کفن دفن کا انتظام کر دیں۔

وہ تو بیٹی میں کر دیتی۔ لیکن یہاں تو کارپوریشن والے مردے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

اماں ۔۔ کارپوریشن والے کرتے ہیں کفن دفن کا انتظام؟

پتہ نہیں وہ کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ مردوں کو انہی کے کپڑوں میں اٹھا کر ایک لاری میں ڈال کر لے جاتے ہیں۔ پھر پتہ نہیں سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ یا کہیں دور ساحل سمندر پر گڑھا کھود کر اس میں دفن کرتے ہیں۔

یہ سن کر حنا اور بھی مایوس ہو گئی۔

بٹی اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو ادھر کا شسٹم ہے۔ ہمیں بھی اسی طرح کرنا پڑے گا۔

جھگی سے تھوڑی دور قمرو کسی کے ساتھ اونچی اونچی باتیں کر رہا تھا۔ میا نے وہ رقم اور ہار لپیٹ کر ایک رومال میں باندھ لیا۔ اور اپنے دوپٹے کے نیچے چھپا کر جھگی کی پچھلی طرف سے نکل کر اپنی جھگی کی طرف چلی گئی۔ قمرو بڑبڑاتا ہوا اپنی جھگی میں داخل ہوا۔ آتے ہی حنا کو گالیاں دینے لگ گیا۔

کیوں قمرو اتنے غصے میں کیوں ہو۔ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔

سالا۔ غلطی نہیں ہوا۔ کتنا سخت بو تمہارے ساتھ سے آتا ہے۔ ایک دم دماغ پھٹتا ہے۔

قمرو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میا کے گھر سے تم مجھے زبردستی اٹھا کر لے آئے تھے۔ اس بے چاری نے تو میرے لئے ڈاکٹر بھی منگوایا تھا۔

سالی ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے۔ کہ تمہارے لئے ادھر کھولی میں ڈاکٹر منگوائے۔

میا کے گھر سے تم مجھے اٹھا کر کیوں لے آئے تھے۔ اس وقت تو شیطان تمہیں ٹلنے نہ دیتا تھا۔

سالا تمہاری مافق ہمارے پاس بہت چھوکری ہے۔

اگر بہت تھیں تو اس حالت میں بھی تم نے مجھے رات دن نہ بخشا۔

کبھی کبھی جائیکا بھی بدلنا چاہئے۔ وہ اپنے پیلے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

اب تم مجھے کسی ہسپتال میں لے جا کر داخل کروا دو۔

سالا ہسپتال میں داکھل ہونا کون سا آسان کام ہے۔ اپنے پاس پیسے تو ہیں نہیں۔

تو میرا کیا بنے گا۔

تم کو سڑک کے کنارے ڈال دیتا ہوں۔ کھلی ہوا لگے گی تو بو کھتم ہو جائے گی۔ شام تک کچھ پیسے بھی بن جائیں گے۔

قمرو اب زندگی کے آخری لمحوں میں تم مجھ سے بھیک بھی منگواؤ گے۔
بی بی۔ مانگو گی نہیں تو کھائیں گے کہاں سے۔
کوئی محنت مزدوری کرو۔ ہٹے کٹے ہو۔
سالا تم ہم کو نصیحت کرنے والا کون ہوتا ہے۔ دو پیسے کی ٹکھانی ہے۔ اپنا حیثیت کو مت بھولو۔
کون ٹکھانی ہے۔
تم اور کون۔
یہ قمرو تمہیں مغالطہ لگا ہے۔
سالا اس ایریا میں سب ٹکھانی لوگ رہتا ہے۔ جن سیڑھیوں سے تم گرا ہے۔ وہاں ایک بوڑھی ٹکھانی نہیں رہتی۔
مجھے پتہ نہیں ہے۔
تم سالا وہاں کیا نماج پڑھتا ہے۔
قمرو کی جھگی کے پاس سے گزر کر دو نوجوان لڑکے اپنی جھگیوں کی طرف جا رہے تھے۔ قمرو نے ان کو آواز دی۔
ارے شمو۔ ذرا رکنا۔
ہاں قمرو بھیا۔ وہ دونو چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔
ان تینوں نے مل کر حنا کو قمرو کی جھگی سے باہر نکالا۔ ایک کھٹولی پر ڈال کر اسے عین اس جگہ کے سامنے لے آئے جہاں آج سے بارہ تیرہ دن پہلے سیڑھیوں سے گر کر وہ بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ حنا روتی چلاتی رہی۔ لیکن قمرو اسے وہاں سڑک کے کنارے جہاں اور بھکاری پڑے ہوئے تھے۔ ڈال کر اپنی کھٹولی واپس لے کر چلا گیا۔ حنا کے پاس بو کی لپٹوں کی وجہ سے کوئی آدمی نہ بیٹھ سکتا تھا۔ وہ دوسرے بھکاری وہاں سے ہٹ کر ذرا دور جا بیٹھے۔ وہ سب بھکاری قمرو کو جانتے تھے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اسے یہ مریضہ وہ یہاں ہرگز نہ ڈالنے دیتے۔
راہ چلتے آدمی حنا کو ایک نظر دیکھ کر رک جاتے۔ پھر بدبو کے ہاتھوں مجبور ہو کر ناک پر رومال رکھ کر جیب سے کوئی سکہ نکال کر اس کی طرف پھینک دیتے۔

حنا کے آس پاس بہت سکے اکٹھے ہو گئے۔ لیکن اسے ان کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ قمرو کی جھگی کی نسبت وہ یہاں اچھا محسوس کر رہی تھی۔ کھلی ہوا تھی۔ آتے جانے لوگوں کو دیکھتی۔ کسی وقت غیر ارادی طور پر اس کی نظریں اپنی ماں کی کھولی کی طرف بھی اٹھ جاتیں۔ جس کا دروازہ ابھی تک بند پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ اب تک اپنے گیسٹ سے ہی فارغ نہ ہوئی تھی۔

O

شام کو قمرو ادھر سے گزرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے حنا کے پاس رک گیا۔ اس سے بڑے محبت بھرے انداز میں پوچھنے لگا۔

کیسی ہو۔

ٹھیک ہوں۔

واپس جھگی میں چلو گی۔ یا یہاں ہی رہو گی۔

یہاں ہی ٹھیک ہوں۔

کچھ کھایا پیا بھی ہے۔

کون لا کر دیتا۔

قمرو نے قریب ہی بیٹھے ہوئے بھکاریوں میں سے ایک کو آواز دی۔

ارے او رامو ذرا ادھر آنا۔

ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا بھاگ کر آ گیا۔

ارے ایسا کرو۔ جب بھی یہ بی بی کچھ چیز مانگے تو اس چھابڑی والے سے یا سامنے والے چھوٹے باجار اسے لا دینا۔ یہ پیسے اکٹھے کر کے اس کے بستر کے نیچے رکھ دو۔ جو ضرورت ہو لے جانا۔

اچھا بھیا۔

رامو اچھا لڑکا تھا۔ وہ حنا کی اچھی طرح سے خدمت کرتا۔ اسے سامنے والے نل سے پینے کے لئے پانی لا کر دیتا۔ دودھ اور ڈبل روٹی لا کر دیتا۔ باقی جو پیسے بچ جاتے وہ حنا اس کو کہتی یہاں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لے جایا کرو۔ اور اب اس

طرح رامو کی آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو بدبو ستاتی لیکن وہ ایک کپڑے سے منہ لپیٹ لیتا۔

دوسرے بھکاریوں کو جب یہ پتہ چلا یہ بھکارن پیسے خود نہیں لیتی۔ بلکہ رامو کو دے دیتی ہے۔ تو انہوں نے بھی کوشش کی کہ وہ حنا کی خاطرداری کریں۔ لیکن اس نے سب سے کہا کہ یہی لڑکا ٹھیک ہے۔ میری دیکھ بھال اچھی طرح سے کرتا ہے۔ اس سڑک پر آنے جانے والے لوگوں کا بہت رش رہتا۔ حنا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی تھی۔ لوگ خود بخود اس کے سامنے زمین پر سکے پھینک کر آگے کو نکل جاتے۔ حنا غیر ارادی طور پر ہر وقت اپنی ماں کی کھولی کی طرف نظریں لگائے دیکھتی رہتی۔ ساحرہ کی تمام نقل و حرکت وہاں سے مکمل طور پر نظر آتی تھی۔

دوسرے دن شام کو ساحرہ اپنی کھولی سے اتر کر نیچے سڑک پر آئی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ لوگوں کے جم غفیر کو دیکھتی رہی۔ کبھی کوئی راہ گیر تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس رکتا اور ایک آدھ منٹ کوئی بات کرتا اور پھر اپنی راہ لیتا۔ شاید ساحرہ اپنے لئے کسی شکار کی تلاش میں تھی۔ جب وہ وہاں کھڑے کھڑے مایوس ہو گئی۔ تو آگے جانے کے لئے سڑک کراس کر کے بائیں ہاتھ والے فٹ پاتھ پر آ گئی۔ اس فٹ پاتھ پر ایک میلے کچیلے بستر پر بھنبھناتی مکھیوں کے ڈاروں کے نیچے حنا پڑی ہوئی تھی۔ ساحرہ جب حنا کے قریب سے گزرنے لگی تو حنا نے دھیمی آواز میں ساحرہ کو بلایا۔

امی جان۔

ساحرہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر حنا کی طرف دیکھا۔ اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ حنا کی حالت دیکھ کر رعونت سے منہ موڑ لیا۔ اور کوئی بات کئے بغیر آگے کو نکل گئی۔ حنا کا چہرہ آنسوؤں کی جھڑی سے بھیگ گیا۔ اور وہ بہت دور تک اپنی ماں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جو آخر کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر راہ گیروں کے انبوہ کثیر میں مل گئی۔ رامو اس کے لئے گرم گرم دودھ لے آیا۔ جو حنا نے بڑی رغبت سے پیا۔ رامو پاس پڑے ہوئے پیسے اکٹھے کر کے حنا کے بستر کے نیچے رکھ دیتا۔ حنا اس سے کہتی بھی۔

رامو یہ تم لے لیا کرو۔ میں نے یہ پیسے کیا کرنے ہیں۔

بی بی آپ کے کام آئیں گے۔

رامو میں دنیا کے سب کام نمٹا چکی ہوں۔ بس اب موت کے انتظار میں آخری منزل پر آ پہنچی ہوں۔ بس ایک آدھ دن کی مہمان ہوں۔

ارے رام رام کرو۔ بی بی تم تو ابھی جوان ہو۔ ٹھیک ہو جاؤ گی۔

بس رامو جتنا ٹھیک ہونا تھا۔ ہو چکی ہوں۔ اب تم میرا ایک کام کرنا۔

کہو بی بی۔

جب میں مرجاؤں تو میرے کفن دفن کا بندوبست کر دینا۔

بی بی یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

وہ کیسے۔

بھکاریوں میں سے جب کوئی ان فٹ پاتھوں پر مر جائے تو اس کی لاش کارپوریشن والے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

رامو۔۔ وہ لاشوں کو کہاں ٹھکانے لگاتے ہیں۔

بی بی سنا ہے۔ سمندر میں جا کر پھینک دیتے ہیں۔ مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔

حنا خاموش ہو گئی۔ اسے اپنی بے چارگی پر رونا آ گیا۔

وہ سوچنے لگی۔ اس فٹ پاتھ پر کوئی رات نہیں ہوتی۔ کوئی دن نہیں ہوتا۔ ہر وقت آدمیوں کا ایک سیل رواں نظر آتا ہے۔

رات کو دس بجے کے قریب ساحرہ ایک آدمی کو لے کر اپنے اڈے کی سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی نظر آئی۔ حنا کا تجسس ختم ہوا۔ وہ شام ہی سے اپنی ماں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

قمرو صبح سویرے وہاں سے گزرتے ہوئے حنا کے پاس ایک لمحے کے لئے رکا۔

کیسی ہو۔ بی بی۔

ابھی تک تو زندہ ہوں۔

ابھی سے تھک گئی ہو۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ جیسے ایک عام سا راہ گیر ہو۔

قمرو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میا اسے دیکھنے کے لئے آئی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ دونو ایک دوسرے کو دیکھ کر روتی رہیں۔

بٹی میں کاغذ قلم لے آئی ہوں۔ تاکہ آپ کو خط لکھ دوں۔

اماں آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ اچھا لکھئے۔

احمد صاحب-----------!!!!

امید ہے میرا پچھلے ہفتے کا لکھا ہوا خط تمہیں مل گیا ہو گا۔ جو شخص مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ دو چار دن اس نے مجھے اپنی جھگی میں رکھا۔ جب اس کا جی بھر گیا تو مجھے اٹھا کر فٹ پاتھ پر ڈال گیا ہے۔ جہاں میرے جیسے اور بیسیوں معذور بھکاری پڑے ہوئے ہیں۔ گنگرین کی وجہ سے میرے زخموں میں اتنا تعفن پیدا ہو گیا ہے کہ راہ چلتے آدمی بھی ناک پر رومال رکھے بغیر نہیں گزر سکتے۔ اب مجھے بخار بھی آنا شروع ہو گیا ہے۔ علاج مجھے کسی طرح بھی میسر نہیں۔ پیسے کی بات نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ساتھ ہی ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھے کسی ہسپتال میں جا کر داخل کروا دے۔

کل میری ماں میرے پاس سے گزری میں نے اسے آواز دے کر بلایا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر اپنے شکار کی تلاش میں آگے کو نکل گئی۔ میں سوچتی ہوں کہ اتنے مقدس رشتوں کے درمیان میں اتنی نفرتیں اور دوریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ میں نے جس اماں کا پچھلے خط میں ذکر کیا تھا۔ یہ خط بھی مجھے وہی لکھ کر دے رہی ہیں۔ بے چاری اپنی جھگی سے چل کر مجھے دیکھنے آ جاتی ہے۔ اب دو پتہ لکھے ہوئے لفافے ان کو دے رہی ہوں کہ میرے بعد یہ تمہیں میرے حالات سے آگاہ کر دیں۔

اچھا خدا حافظ --

ماضی کی ایک یاد

حنا---

O

آج صبح سے حنا کی حالت خراب ہے۔ رامو نے جو سویرے اس کے لئے دودھ لایا تھا۔ وہ بھی اس نے نہیں پیا۔ پلاسٹک کے ایک جگ میں اس کے پاس ابھی تک اسی طرح پڑا ہوا ہے۔ جس پر ہزاروں کی تعداد میں مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔

اب حنا پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ آج موسم بھی کچھ اچھا نہیں۔ بمبئی میں موسم بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی۔

اگر بارش کے آثار ہوں تو فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے بھکاری کسی محفوظ جگہ پر چلے جاتے ہیں۔ جن کا کوئی ساتھ نہ ہو یا ان کو اٹھا کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچانے

والا کوئی آدمی نہ ہو تو ایسے بھکاری طوفان باد و باراں میں بھی فٹ پاتھ پر ہی پڑے رہتے ہیں- ایسی ہی ایک رات میں چاند گھرے بادلوں کا لبادہ اوڑھ چکا تھا- فٹ پاتھ سے تھوڑا ہٹ کر درختوں کی پرچھائیاں سرگوشیاں کر رہی تھیں- ہر سو اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا- تند خو ہوا بادلوں کو سمیٹے ہوئے ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہی تھیں- باد و باراں کا طوفان آ رہا تھا-

سب بھکاری آہستہ آہستہ وہاں سے محفوظ مقامات پر منتقل ہو گئے تھے-

ایسے میں رامو اپنا سامان اٹھا کر حنا کے پاس آیا- اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا- حنا نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا-

کیوں رامو- تم نے کیوں سامان اٹھایا ہوا ہے- کہیں جا تو نہیں رہے-

بی بی- طوفان آ رہا ہے- میں آپ کو اٹھا کر کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا ہوں-

نہیں رامو- میں یہاں ہی ٹھیک ہوں-

بی بی- بارش پڑ گئی تو ٹھنڈ سے مر جاؤ گی-

اچھا ہے- رامو- دنیا کی ان اذیتوں سے تو جان چھوٹ جائے گی- اور پھر وہ غمزدہ نظروں سے سڑک کے اس پار اپنی ماں کی کھولی کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگ گئی- جیسے اپنی کسی بہت قیمتی کھوئی ہوئی شے کو تلاش کر رہی ہو- وہ قیمتی شے اس کے بچپن کی امیں- اس کی ماں تھی- جس نے اب اس سے آنکھیں پھیر لی تھیں- اور اس کو زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا-

وہ اپنی ماں کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا پڑی تھی- اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا- وہ سوچنے لگی- زمانے کی یہ گردش بھی عجیب ہے- واہ رے زمانے۔۔۔ تو بادشاہوں کو ایک پل میں گدا بنا دیتا ہے اسے اپنا وہ وقت یاد آ گیا جب وہ مہاراجہ کے محلوں کی رانی تھی- راجہ اس کے اشاروں پر ناچتا تھا- پھر وہ پاکستان چلی گئی- کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات اس کے پاس تھے- ہوائی جہازوں پر سفر کرتی تھی- اعلیٰ قسم کی گاڑیاں سواری کے لئے ہر وقت موجود رہتی تھیں- تاج محل، فلیٹیز، اور فلیش مین قیام کرتی تھی- آج نیرنگئی زمانہ نے یہ وقت بھی دکھایا ہے کہ فٹ پاتھ پر بھکاریوں کے ساتھ پڑی، زندگی کے آخری سانس گن رہی ہے-

اللہ شکر ہے تیرا۔۔۔۔۔ اور اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری- اور اور افق میں ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگ گئی-

آخر کار تھک کر آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ ہستی کے اسرار و رموز کو دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہو۔

اور برسوں بے آب و گیاہ صحراؤں میں بھٹکنے کے بعد جیسے اب وہ میٹھے اور حسین سپنوں کی وادی میں آ گئی ہو۔ حنا نے کپڑا کھینچ کر منہ پر کر لیا تھوڑی دیر کے بعد رامو نے اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ حنا اب ابدی نیند سو چکی تھی۔

رامو نے اس کپڑے سے حنا کے چہرے کو پھر ڈھانپ دیا اور ایک پرانی سی میلی کچیلی متعفن گودڑی جو پاس ہی رکھی تھی اٹھا کر اس کے اوپر ڈال دی تاکہ طوفان باد و باراں سے محفوظ رہے۔ رامو کے آنسو ڈھلک آئے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے اس کی سگی بہن نے آخری سانس لیا ہو۔ بڑا زور کا طوفان آیا۔ رامو حنا کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ اپنی بہن کی لاش کو یوں چھوڑ کر نہ جا سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح دس بجے میا حنا کو دیکھنے کے لئے آئی تو رامو نے اسے بتایا کہ وہ کل رات فوت ہو گئی ہے۔ یہ سن کر نہ جانے میا کے ذہن میں کیا بات آئی کہ وہ وہاں سے حنا کی ماں کی کھولی کی طرف چلی گئی۔ میا نے وہاں جا کر دیکھا کہ حنا کی ماں ابھی تک اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہے۔

میا نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے۔

دروازہ کھولئے۔

ساحرہ نے عورت کی آواز سنی تو اس کی ڈھیر بندھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

میا نے دیکھا کہ ساحرہ نے اپنی کمر میں صرف ایک تولیہ لپیٹا ہوا ہے۔ اس کے باقی کپڑے اترے ہوئے تھے اور سامنے چارپائی پر ایک ننگا آدمی لیٹا ہوا تھا۔

کیوں بی بی۔ ساحرہ نے میا سے پوچھا۔

آپ حنا کی ماں ہیں۔

جی ہاں۔

بی بی۔ حنا فوت ہو گئی ہے اس کی لاش فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی ہے ابھی تھوڑی دیر کے بعد کارپوریشن والوں کا کوڑے کا ٹرک آئے گا تو وہ اسے اٹھا کر لے

جائیں گے۔ آپ آخری بار اسے آکر دیکھ لیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں۔

مجھے فرصت نہیں ہے۔ میں اس وقت نہیں آ سکتی۔ آپ دیکھتی نہیں ہیں میرے گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔

آپ کے فارغ ہونے تک تو کارپوریشن والے اسے اٹھا کر لے جائیں گے

کارپوریشن والے لے جاتے ہیں تو لے جائیں۔ میں اس کی لاش کو اٹھا کر اب اپنے پاس تو نہیں لا سکتی۔

سالا۔۔ یہ سب کیا گلاٹا ہے۔ کمرے کے اندر ننگے لیٹے ہوئے مرد نے غصے کا اظہار کرتے ہئے کہا۔

جگو میری جان آئی۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ساحرہ نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

سالا۔ ناراج اس لئے ہوتا ہوں کہ تم ہمارا ٹیم کھراب کرتا ہے۔

اچھا بی بی تم جاؤ ہمارا گاھکی مت خراب کرو۔۔۔

اور پھر ساحرہ کمرے کے اندر چلی گئی اور اس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ میا حیرت و استعجاب کے عالم میں کھڑی ساحرہ کے اس منفی رویئے پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ساحرہ کی کھولی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گئی۔ اب بہت سے بھکارنیں حنا کی لاش کے پاس تصویر حیرت بنی بیٹھی تھیں۔ پاس ہی بیٹھا رامو زارو قطار روئے جا رہا تھا۔

تقریباً بارہ بجے دوپہر کارپوریشن والوں کا ٹرک آ گیا۔ دو آدمیوں نے اتر کر حنا کی لاش کو اٹھا کر ٹرک میں ڈال دیا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ جب ٹرک وہاں سے چلا گیا تو سوگوار بھکارنیں وہاں سے اٹھ کر اپنی اپنی جگھوں پر جا بیٹھیں۔ البتہ رامو ابھی تک وہاں ہی بیٹھا روئے جا رہا تھا۔ میا نے اسے حوصلہ دیا اور سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔ میا نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے پونچھیں اور اپنی جھگی کی طرف چل پڑی۔

میا وہاں سے چلی ہی تھی کہ ساحرہ کی کھولی سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگ گئیں۔ وہ رک گئی۔ پلٹ کر چند قدم چلتی ہوئی اس کھولی کے سامنے سڑک پر آکر کھڑی ہو گئی۔ سیڑھیوں سے نظر آ رہا تھا۔ وہی آدمی جگو حنا کی ماں کو بری طرح زدو

کوب کر رہا تھا۔ ساحرہ نے اپنی چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جگو کا غصہ ٹھنڈا ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس نے ساحرہ کو چھوڑ دیا اور اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب سے چاقو نکالنے لگا۔ ساحرہ نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا۔ بھاگ کر سیڑھیوں سے نیچے اترنا چاہتی تھی کہ جگو نے پیچھے سے دوڑ کر اسے اتنے زور کا دھکا دیا کہ سڑک تک آتے آتے تقریباً اس کے سب دانت ٹوٹ گئے۔ بازو اور ٹانگوں کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں۔ دائیں طرف کی پسلیاں اور کندھے کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

جگو پاس ہی کھڑا بڑے غصے میں کہہ رہا تھا۔

سالا ہم سے روج روج مداسی کرتی ہے۔ ایک دن بھی پورے پیسے نہیں دیئے۔ سالا رات بھر جونک کی طرح ہمارا خون پیتی ہے۔ کھرچہ نہیں دے گی تو ہم کھائے گا کیا۔ روز روز ٹیکہ کدھر سے لگوائے گا۔ سالا ایل ایس ڈی اور پیتھوڈین کدھر سے لے گا۔ اگر ہم رات کو جرا سا بھی مجبوری دکھائے تو سالا لات مار کے اٹھا دیتا ہے۔ اگر سالا اپنی جرورت پورا کرنا مانگتا ہے تو ہماری جرورت بھی تو پوری کرے۔ سالا ادھار نہیں چلے گا۔ رنڈی سے لوگ کون ادھار کرے گا۔

جگو بڑبڑاتا ہوا بڑی سڑک پر آگیا اور وہاں سے ایک رکشے میں بیٹھ کر شہر کی طرف چلا گیا۔

بھکاری لوگ ساحرہ کو وہاں سے اٹھا کر فٹ پاتھ پر لے آئے۔ انہوں نے ساحرہ کو اسی جگہ پر لا کر ڈال دیا جہاں اب سے تھوڑی دیر پہلے اس کی بیٹی حنا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک بھکاری نے وہی غلیظ اور متعفن گدڑی اس پر ڈال دی۔ جو تھوڑی دیر پہلے حنا چھوڑ کر گئی تھی۔

میا پاس کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دل میں کہنے لگی۔ "یہ دنیا مکافات عمل ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔" اور پھر میا آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی اپنی جھگی کی طرف چلی گئی اور اب ساحرہ متعفن گدڑی اوڑھے کوڑے والے ٹرک کی منتظر تھی۔

خلش ہمدانی ایڈووکیٹ
پریم نگر۔ اٹک سٹی (پاکستان)

ماتمِ شہرِ آرزو

مشرقی پاکستان

ایک المیہ ـــــ ایک ناول

رؤف ظفر نے اس کتاب کا مواد اپنے ان تجربات اور احساسات سے اخذ کیا ہے جو اسے مشرقی پاکستان میں دیکھنے کو ملا۔ اور جنہیں اس نے نہایت چابکدستی سے ایک لڑی میں پرو کر ناول کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب محض ایک ناول نہیں ہے بلکہ ایک ایسی قومی دستاویز ہے جس کی روشنی میں ہم مستقبل کی پالیسیوں کو ایک واضح شکل دے سکتے ہیں ـــــ خلش ہمدانی

میں نے یہ ناول ذاتی شہرت کے لیے نہیں لکھا، کچھ حقائق و واقعات میرے تجربے اور مشاہدے میں آئے انہیں قوم تک پہنچانا میرا فرض بھی تھا اور وقت کی ضرورت بھی

کرنل (ر) رؤف ظفر

سفید کاغذ پر نہایت دیدہ زیب ایڈیشن